

# میں مجبت اور تم

سہاسی گل

**PDFBOOKSFREE.PK**



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

## انتساب!

پیارے ابو جان  
اور  
پیارے امی جان  
کی بے لوث و بے ریا  
محبتوں اور دعاؤں  
کے  
نام!

نام کتاب	.....	میں، محبت اور تم
مصنفہ	.....	سُبَّاسُ گل
ناشر	.....	گل فراز احمد
مطبع	.....	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
کمپوزنگ	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	.....	انیس احمد
قیمت	.....	جون 2008ء
	.....	=/200 روپے

☆..... ملنے کے چہ.....☆

علم و عرفان پبلشرز

40- اردو بازار، الحمد مارکیٹ، لاہور

فون: 7352332-7232336

سیونٹھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40- اردو بازار لاہور

فون: 7223584 موبائل: 0300-4125230

## ”محبت کے خالص رنگوں کی تخلیق کار سُبَّاس گُل“

سُبَّاس گُل کا شمار ہمارے معاشرے میں محبت کے حقیقی رنگوں کو زیرِ قلم لا کر، زندگی کی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی نہایت عمدگی سے کرنے والی چند ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔

سُبَّاس محبت کو اس کائنات کا سب سے بڑا وہ طاقت ور ہتھیار مانتی ہے جس کو دوسروں میں لے کر معاشرے کے بڑے سے بڑے مسئلے کو بہت آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

عام سے گھرانے میں جنم لینے والی یہ قلم کارہ اس لحاظ سے خاصی بد قسمت ثابت ہوئی ہے کہ اس کے موتیوں جڑے الفاظ ملک کے ممتاز پڑچوں میں وہ جگہ نہیں پاسکے جو اس کا حق ہے مگر اس کے باوجود سُبَّاس اپنے گداز الفاظ کے جادو سے اپنے ہزاروں قارئین کے دلوں پر بڑے غمگینانہ راج کرتی دکھائی دیتی ہے۔

سُبَّاس کی روشن اور خوش رنگ تحریروں میں چھلکتے محبت کے رومانوی رنگ قاری کو بے ساختہ اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ میری ذاتی خواہش اور دعویٰ ہے کہ اگر سُبَّاس کو آگے بڑھنے کیلئے حوصلہ افزائی کا پلیٹ فارم مہیا کیا جائے تو یہ محبت کی دیوی بہت جلد نامور لکھاریوں میں اپنا مقام بنا کر بڑے بڑے ڈائجسٹوں کی پہچان کا باعث بن سکتی ہے۔

”میں، محبت اور تم“ بھی اس کا ایک نہایت خوبصورت اور دل کو موہ لینے والا ناول ہے جو اپنی ہر سطر میں آپ کیلئے دلچسپی کا نیا انداز اپناتے ہوئے ہے۔

میری تمام ترجمانیوں، کوششیں اور دعائیں ہمیشہ سُبَّاس کی کامیابیوں میں اس کے ساتھ رہی ہیں اور تادمِ زیست رہیں گی! اور مجھے یہ فخر بھی ہمیشہ حاصل رہے گا کہ اس سادہ دل پیاری لڑکی کو اس خاکسار نے کتابی دنیا میں پہچان بنانے کیلئے علم و عرفان پبلشرز سے متعارف کروایا اور سُبَّاس

اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ اس کا پہلا ناول ملک کا ممتاز اور مایہ ناز ادارہ ”علم و عرفان پبلشر“ شائع کرنے کا اہتمام کر رہا ہے، انشاء اللہ یہ سفر جاری رہا تو ضرور ہزاروں کامیابیاں مستقبل قریب میں سہاس کے قدم چومیں گی۔

آخر میں غلو ص دل سے اللہ رب العزت کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ سہاس کو بہت جلد محیوں اور کامرانوں کے اُس مقام تک پہنچا دے جو اس محنتی، جفاکش اور بہادر لڑکی کا حق ہے۔

(آمین)

(محبت اندر دعائیں)

نازیہ کنول نازی

ناول نگار

23 مارچ 2008ء

## محبت، آرزوئیں، خواہشات اور خواب

بے ترتیب زندگی کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ صبح کا رنگ، بجلائی ہوئی شام میں ڈھلتا ہے پھر یہ شام اُجالوں میں بدل جاتی ہے۔ اس طرح روز و شب میں وقوع پذیر ہوتے حالات کا رنگ بھی بدلتا رہتا ہے، جو کبھی شوخ اور کبھی مدہم پڑ جاتا ہے۔ تخلیق کار اس زندگی سے رنگ سمیٹ کر قرطاس پر قلم سے بکھیر دیتا ہے، اور پھر ایک نئی تصویر ابھر آتی ہے۔ سہاس کُل بھی ایک ایسی ہی تخلیق کار ہے۔ جس کے جہانِ زندگی کے کئی روپ ہیں۔ وہ معاشرے کے بیشتر پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے رقم کرتی ہیں۔ اس کی تحریروں میں محبت، آرزوئیں، خواہشات اور خواب بڑے خوبصورت انداز میں جنم لیتے ہیں۔ وہ ماحول کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کرتی ہیں، کہ سانس لیتے کردار حقیقی زندگی سے ربط جوڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

زیر نظر ”تم ایسی شرارت مت کرنا“ میں یہ خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں۔

(فوزیہ شفیق)

مدیر خصوصی، ماہنامہ حنا، لاہور

## میں محبت اور تم

اپنا تو چاہوں میں بھی ایک اصول ہے  
جب ٹو قول ہے تو تیرا سب قول ہے  
یہ عمر بھر کا جاگنا بے کار ہی نہ جائے  
گر ٹو نہیں ملی تو ریاضت فضول ہے  
”بیگم تیس آج پھر یہاں آئی تھیں؟“ ریاض الحق نے کمر میں داخل ہوتے ہی بیوی سے  
بچہ کچھ شروع کر دی۔

”جی آئی تھیں..... انہوں نے تو ہماری دلیر ہی پکڑ لی ہے۔“ سہلی بیگم نے کہا۔  
”آخر وہ چاہتی کیا ہیں؟“

”اپنے بیٹے انیس احمد کے لئے ہماری بیٹی ثنا کا رشتہ چاہتی ہیں۔“  
”میں نے پہلی ملاقات میں ہی اس عورت پر واضح کر دیا تھا کہ ثنا کی منگنی میں نے اپنے  
بچے خرم سے کر دی ہے اور آئندہ چند ہفتوں میں ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر یہ عورت  
دست سوال دراز کئے یہاں چلی آتی ہے۔ تم اسے دو ٹوک الفاظ میں جواب کیوں نہیں دیتیں؟“  
ریاض الحق نے قدرے برہمی سے کہا۔

”میں تو بیگم تیس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں مگر ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ میرے انیس  
کی دلہن تو ثنا ہی بنے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ ثنا کی منگنی ہی تو ہوئی ہے کون سا نکاح ہوا ہے جو توڑا نہ  
جاسکے۔“ سہلی بیگم نے تفصیل سنجیدگی سے بتائی۔

”دماغ خراب ہے اس کا عورت۔ آئندہ وہ مجھے یہاں نظر نہ آئے ورنہ میں اس کی

دولت اور امارت کا رعب مٹی میں ملا دوں گا۔" ریاض الحق نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔

"ریاض! آپ غصے میں آنے کی بجائے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں تو آپ کو اپنی شنا کے لئے یہ رشتہ خدا کا انعام دکھائی دے گا۔ انیس کو آپ نے دیکھا بھی ہے۔ ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے اور خرم سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ خرم بیس ہزار ماہوار کماتا ہے اور انیس ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ ہر ماہ بیس تیس لاکھ اس کی جیب میں آتے ہیں۔ آپ ذرا غور کریں تو تین بار تو بیگم نیس آکر سوال کر گئی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا بھی کہ ثنا کی تو منگنی ہو چکی ہے۔ آپ ندا کو اپنی بہو بنالیں مگر وہ تو ثنا کے لئے ضد کرتی رہیں۔ اتنے اونچے امیر اور محرز گھرانے میں ہماری بیٹی بیانی جائے گی تو ہماری ہی ناک اونچی ہوگی نا۔ آپ تو خواہ خواہ کی ضد کر رہے ہیں۔" سہلی بیگم نے سنجیدگی مگر نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"خواہ خواہ کی ضد، تم چاہتی ہو کہ میں ثنا کو انیس سے بیاہ دوں اور اپنے بھائی بھادج سے بگاڑ لوں۔ ان سے رشتہ توڑ لوں۔ سہلی بیگم اگر ثنا کی منگنی میرے بھتیجے کی بجائے تمہارے بھتیجے سے طے ہوئی ہوتی تب میں دیکھتا کہ تم کیسے یہ بات کرتی ہو؟" وہ غصے سے بولے۔

"ریاض! میں ثنا کی ماں ہوں۔ اپنی بیٹی کا بھلا ہی چاہتی ہوں۔ اگر میرا بھتیجا ثنا کا منگیتر ہوتا تو میں اس رشتے کو قبول کر کے ثنا کی اس سے منگنی توڑ دیتی اور اگر میرے بھائی کے گھر والے عدا کے لئے مان جاتے تو میں بھتیجے سے ندا کو بیاہ دیتی۔ اولاد کی بھلائی اور اس کے بہتر مستقبل کے ارے میں سوچنا والدین کا فرض ہوتا ہے۔ اس لئے سچی بات ہے مجھے تو انیس کا رشتہ دل سے قبول ہے اگر آپ اپنی ضد چھوڑ دیں تو....."

"بس..... میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔ اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا اور ویسے بھی دو۔ ال ہو چکے ہیں ثنا اور خرم کی منگنی کو اور اتنے عرصے میں دونوں کے ذہنوں اور دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو چکے ہوں گے۔ ان کے خوابوں کو چکنا چور کر کے کون سا کچھ پاسکوئی تم۔ اب اگر وہ عورت یہاں آئے تو اسے صاف صاف کہہ دینا کہ وہ بارہ بچوں کا زرخ نہ کرے میں آج ہی ٹرکس کو فون کر کے بلواتا ہوں اور ثنا اور خرم کی شادی کی تاریخ طے کر کے ہی دم لوں گا۔ مذاق بنا رکھا ہے تم لوگوں نے رشتوں کو۔" ریاض الحق نے غصیلے اور درشت لہجے میں کہتے ہوئے اپنے کمرے کا زرخ کیا تو سہلی بیگم ہنسنا سے آہ بھر کر رہ گئیں۔

"کاش! میں کا رشتہ دو سال پہلے آگیا ہوتا۔" سہلی بیگم نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا تو "جو ماں باپ کی ساری کٹھن کو اپنے کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑی سن چکی تھی گہری

سانس لے کر کرسی پر ڈھس گئی۔

"انیس احمد بندہ تو بہت ڈسٹنگ ہے لیکن میری آنکھوں نے خرم کے خواب سجا رکھے ہیں۔ شکر ہے ابو نے میرے خواب ٹوٹنے سے بچا لئے اور خرم وہ تو کہتا ہے کہ ثنا تمہاری جدائی کا تصور ہی میری روح کھینچنے لگتا ہے۔ تم تو میری سانسوں میں بسی ہو۔ تم ہو تو یہ سانس کا سفر جاری ہے تمہارے بغیر تو میری سانس بھی رُک رُک جاتی ہے۔"

خرم کا جذبوں کی شدت سے پُر لہجہ اس کی ساعتوں میں گونجا تو وہ ہنس پڑی۔

"پگلا کہیں کا۔"

"کہیں کا نہیں پگلا یہاں کا بلکہ پگلا تمہیں کا۔"

اسی وقت خرم اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اس کی بات سن کر شرارت سے بولا۔

"تو بہ تم تو پورے شیطان ہو۔ ابھی یاد کیا ابھی حاضر۔"

"شیطان کی بجائے اگر میری جان کہہ دیتیں تو تمہارے جذبوں کی شدت میں کمی آجاتی کیا؟" وہ مصنوعی خشکی سے بولا۔ اونچا لمبا بھرا جسم براؤن آنکھیں اور گندی رنگت والا خرم شبیر اس کی آنکھوں میں سارہا تھا۔

"نہیں لیکن ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔" وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی تو شون وشریر لہجے میں گویا ہوا۔

"چلو وقت بھی جلد آنے والا ہے۔ ہم تھوڑا سا جبر اور کیے لیتے ہیں۔ پھر تو ہم تم ہوں گے، بادل ہوگا، رقص میں سارا جنگل ہوگا ہم تم....."

"اچھا اب منہ بند کرو اور جاؤ یہاں سے مجھے ہچکے کی تیاری کرنے دو۔" وہ ہنس کر کتاب اٹھاتے ہوئے بولی۔

"لڑکیاں تو یہ سب سننے کے لئے ترستی ہیں ایک تم ہو۔"

"جو لڑکیاں یہ سننے کے لئے ترستی ہیں نا، تم جا کر انہیں سناؤ۔ مجھے کوئی شوق نہیں یہ سب سننے کا۔" وہ تنک کر بولی۔

"اچھا جی! ٹھیک ہے جا رہا ہوں پھر نہ کہنا کہ کیوں کسی زلت کے تم اسیر ہوئے۔" وہ شونئی سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میری بلا سے ہو جاؤ۔ تمہاری محبت کی حقیقت بھی کھل جائے گی مجھ پر۔"

"پھر تم کیا کرو گی؟"



”میرے لئے رشتوں کی کمی تھوڑی ہے، تو نہیں اور کسی اور نہیں اور کسی ایک چھوڑوں تو ہزار مل جائیں گے مجھے تم اپنی خیر مناد۔“ وہ بھی اتراتے ہوئے شوخ و شریل لہجے میں بولی تو وہ ہنس پڑا۔

”ٹٹا مذاق کی حد تک تو مجھے یہ بات گوارہ ہے مگر درحقیقت میں تمہیں اپنے سوا کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔ تمہیں تو یقیناً ہزار رشتے مل جائیں گے لیکن مجھے پھر تمہارے جیسی کوئی دوسری نہیں ملے گی۔ تم نہیں تو جینا نہیں۔ تم میری ہو صرف میری، زندگی کے ہر خیب و فراز میں تم مجھے اپنے ساتھ پاؤ گی۔ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں رہے گا۔ میری زندگی کے سارے شکھ تم سے عبارت ہیں ٹٹا۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر اُسے والہانہ پن سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ حیا سے گلہار ہو گئی۔ دل خوشی سے جھومنے لگا۔

”چلو دیکھیں گے شادی سے پہلے سب مرد اسی طرح محبت کے دعوے کرتے ہیں بعد میں ساری محبت جھاک کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔“ ٹٹا نے مسکراتے ہوئے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

”یہ دعوے نہیں ہیں ٹٹا اب یا جب چاہے میری محبت کو مجھے تم آزما سکتی ہو۔ میں ہر امتحان میں پورا اتر دوں گا۔“ وہ کھل کر بولا۔

”ایک اور دعویٰ۔“

”ٹٹا کی بچی۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں بس۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”پھر کب آؤ گے؟“ اس کی زبان پھسل گئی، اور وہ خوشدلی سے ہنس پڑا۔

☆☆☆

نفس احمد اور آسیہ نفس احمد کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے مجلس احمد اور ان سے چار سال چھوٹے انیس احمد۔ مجلس احمد شادی شدہ تھے اور اپنی بیوی ماروی اور بیٹیوں اقراء، اسرٹی اور بیٹی وانیال احمد کے ساتھ لندن میں مقیم تھے۔ وہ وہاں کا بزنس دیکھ رہے تھے۔ نفس احمد بہت بڑے تاجر اور صنعت کار تھے۔ اپنے مال کی زکوٰۃ ضرور ادا کرتے تھے۔ غریبوں کی امداد بھی کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے کاروبار کو بہت ترقی مل رہی تھی۔ انیس احمد نے ایم سی ایس، ایم بی اے اور فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹر کیا تھا اور اس کے بعد نفس احمد کی خواہش پر ان کا بزنس سنبھال لیا تھا حالانکہ اسے اس کی تعلیمی قابلیت کی بدولت بہت اچھی جائز مل رہی تھی لیکن اس نے والد کی خواہش پر ذاتی بزنس میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کو ترجیح دی اور ایک سال کے اندر اندر اس نے کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ گارمنٹس کی مصنوعات، فوڈ پروڈکٹس اور گمریلو مصنوعات کے شعبوں میں ”نفس گروپ آف انڈسٹریز“ کو بہت بڑے آرڈر ملے تھے۔

ٹٹا کو انیس نے اپنے ایک فیملی فرینڈ ٹارمرزا جو کہ نفس احمد کے بہت قریبی اور پُرانے دوست تھے، ان کے بیٹے کی دعوت و لیہ کی تقریب میں دیکھا تھا۔ ٹارمرزا ابھی محکمہ انکم ٹیکس سے ریٹائر ہوئے تھے اور ان کا بیٹا عمار مرزا اب اس محکمے میں ملازم تھا، اور نفس احمد کو ان سے اکثر کام پڑتا رہتا تھا لہذا تعلقات بدستور خوشگوار بنیادوں پر استوار تھے۔ اسی لئے نفس احمد، آسیہ بیگم اور انیس احمد عمار مرزا کی شادی کی تقریب میں شریک تھے۔ عمار، اسرار الحق کے کولیگ تھے اور بہت اچھے دوست بن چکے تھے اس لئے اسرار الحق کو عمار نے اپنی شادی میں مع اہل خانہ کے دعوت دی تھی۔ سائرہ کی طبیعت خراب تھی۔ سلمیٰ بیگم اور ٹٹا کو اسرار الحق کے ساتھ عمار کی دعوت و لیہ میں جانا پڑا۔ آسیہ نفس کی نظر ٹٹا پر پڑی تو وہ اس کی جانب کبھی چلی آئیں۔ سلور کلر کا چوری دار پاجامہ اس پر پنک رنگ کی خوبصورت پوشا زرب تن کئے ہوئے تھی۔ سیاہ ہلکے ریشمی بالوں کو بہت اسٹائل دے کر کھلا رہنے دیا تھا۔ ٹٹا ہلکے میک اپ اور ہلکی سی چوڑی میں انیس جنت کی حور و کھائی دے رہی تھی۔ ان کے دل میں یکا یک اُسے اپنی بہو بنالینے کا خیال آیا تھا۔ انیس احمد چھ فٹ دو انچ قد کا مالک تھا۔ کسرتی بدن، سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں چہرے کے دلکش خدوخال میں احمر لبوں پر مسکراہٹ تھی ہوتی تو وہ اور بھی دلنشین لگتے لگتا تھا۔ اپنے شہزادوں کی سی آن بان والے بیٹے کے لئے انیس ٹٹا جیسی لڑکی کی ہی تلاش تھی۔

”بیٹی! کیا نام ہے آپ کا؟“ بیگم آسیہ نفس نے ٹٹا کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ اس گریس فل انجینی سی خاتون کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

”السلام و علیکم! ٹٹا نام ہے میرا۔“

”وعلیکم السلام! ماشاء اللہ آپ کا نام بہت پیارا ہے اور آواز بھی بہت دلنشین ہے۔ کس کے ساتھ آئی ہیں آپ؟“

”امی اور بھائی جان کے ساتھ۔ وہ میری امی ہیں گرین سوٹ والی۔“ ٹٹا نے اسٹیج پر عمار کی دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی سلمیٰ بیگم کی جانب اشارہ کر کے جواب دیا۔

”اچھا میں اُن سے وہیں مل لیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اس کے رخسار کو تھپتھپاتی ہوئیں اسٹیج کی جانب بڑھ گئیں۔ ٹٹا کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ اٹھ کر لان میں لگے اس ٹیٹ سے باہر نکل آئی۔ اسرار الحق عمار کے ساتھ جو گفتگو تھا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی وہاں سے بولی۔

”اسرار بھائی! بہت دیر ہو گئی ہے اب گھر چلیں۔“

”ٹٹا بہن! آپ اس گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھیں۔ بھائی کی خوشی کے لئے کچھ دیر اور رکنا

پڑے گا آپ لوگوں کو۔“ اسرار کی بجائے عمار نے اس کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا وہ بھی مسکرا دی۔

”عمار یار! ماما کہاں ہیں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ رات کا ایک بجنے والا ہے گھر بھی جاتا ہے ہمیں۔“

اسی وقت انیس احمد نے وہاں آکر ڈھائی دی۔

اسرار الحق سے تو عمار پہلے ہی اس کا تعارف کروا چکا تھا لہذا اسرار الحق کو اس کے اجنبی ہونے کا احساس نہیں ہوا بلکہ وہ ہنس کر بولے۔

”من لو سب یار دوستوں کو گھر جانے کی جلدی ہے اب ہمیں بھی تم اجازت دے دو۔ تمہاری بڑی مہربانی۔“

”اچھا بابا! جاؤ کیا یاد کرو گے کس سخی دو لمبے سے واسطہ پڑا تھا۔“ عمار نے کہا تو وہ دونوں ہنسنے لگے۔ ہنسنے ہوئے اچانک ہی انیس احمد کی نگاہ ثنا کے خوبصورت سراپے پر پڑی تو اس کی زساکت ہو گئی۔

”ثنا! جاؤ امی کو بلا لاؤ۔“ اسرار الحق نے ثنا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری ماما کو بھی بکرا دیں پلیز۔“ انیس نے بے اختیار اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کی ماما کی انیس کیا پہچان ہوگی۔ آپ خود ہی اندر دیکھ لیں۔ خواتین تو سب ہی جانتی ہیں میرا خیال ہے کہ گھر کی اور کچھ قرینی رشتے دار خواتین موجود ہوں گی۔“ اسرار الحق نے مسکرا کر کہا تو ثنائیت کے مٹھولوں سے سچے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ انیس احمد بھی اُس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

سلٹی بیگم اور بیگم آسیہ نفیس احمد آپس میں کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔

”امی! چلیں۔“

”چلیں ماما۔“ انیس احمد اور ثنا نے ایک ساتھ ان کے قریب پہنچ کر کہا اور ایک ساتھ ہی حیرت سے اک دو بچے کو دیکھا تھا اور انیس احمد پر تو اس کا دیکھنا ایک قیامت ڈھا گیا۔ اسے اپنا دل اپنے اختیار سے باہر لٹکا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی من موہنی صورت نے آنکھوں کے رستے سے اس کے دل و دماغ میں اپنا عکس اتار دیا تھا۔ سلٹی بیگم ثنا کو لے کر چلی گئی تھیں اور وہ یوں ہی اس لمحے کے بحر میں جکڑا سا کت و صامت کھڑا تھا۔ بیگم آسیہ نفیس احمد بھی بیٹے کی آنکھوں میں ثنا کے لئے چمکتے جگنو

دیکھ چکی تھیں اور بہت سرور تھیں اُن کی پسند اُن کے بیٹے کی پسند یہی کی سند حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ انہوں نے انیس احمد کے بازو پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”پیاری ہے نا ثنا، تمہاری اور اس کی جوڑی خوب سچے گی۔“

”اس پنک لڑکی کا نام ثنا ہے۔“ وہ چوتھتے ہوئے بولا۔

”ہاں اور میں نے اسے تمہاری دلہن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”اچھا جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ من کی خوشی چھپاتے ہوئے سعادت مندی سے بولا تو وہ

شوخی سے پوچھنے لگیں۔

”اور تمہاری مرضی کیا ہے؟“

”آپ بتائیں۔“ انیس احمد نے ان کے چہرے کو مسکرا کر دیکھا۔

”وہی جو میری مرضی ہے نا؟“

”جی ہاں ماما۔“ وہ ہنس پڑا۔

اور پھر عمار کے ذریعے انہوں نے ریاض الحق اور ان کے گھرانے کے متعلق ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ان کے در پر دستک دی اور مہذب، شریفانہ روایتی طریقے سے انیس کے لئے ثنا کا رشتہ طلب کیا جو کہ ثنا کی خرم سے منگنی کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔ جس کا بیگم آسیہ نفیس احمد سے زیادہ انیس احمد کو دکھ پہنچا تھا۔ بیگم آسیہ نفیس احمد دوبارہ بھی گئیں مگر انہیں انکار ہی سننے کو ملا تھا سو انہوں نے نصیب کا لکھا سمجھ کر صبر کر لیا مگر وہ افسردہ تھیں یہ رشتہ نہ ہو سکنے پر، انیس نے انہیں افسردہ دیکھا تو کہنے لگا۔

”کوئی بات نہیں ماما! ثنا کے علاوہ لڑکیاں اور بھی ہیں۔“

”تمہیں دکھ نہیں ہوا؟“ بیگم آسیہ نفیس نے اس کے چہرے پر غم کو کھوجنا چاہا۔

”مجھے تو عشق ہوا ہے ثنا سے۔“ وہ بے بسی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کاش! انیس بیٹا میں ان لوگوں کو قائل کر سکتی۔“

”کوئی بات نہیں ماما جانی بس آپ میرے لئے دعا کریں کہ عشق کا یہ بھوت میرے سر

سے اتر جائے۔“ وہ افسردگی سے مسکرا کر بولا۔

”میں تمہارے لئے دعا کروں گی کہ ثنا تمہیں مل جائے اور اس کی محبت بھی تمہارا نصیب

بن جائے۔“

بیگم آسیہ نفیس احمد نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے دل سے کہا تو وہ بولا۔



ترک سیاہ پوش نکلا۔ اس کے چہرے پر اور ڈرائیور کے چہرے پر بھی سیاہ ماسک چڑھا ہوا تھا۔ عدا اور ثنا کی چہیں نکل گئیں۔ اس سیاہ پوش نے ثنا کو یازد سے پکڑ کر گاڑی میں اتنی تیزی سے دھکیلا تھا کہ ثنا منہ کے بل پچھلی سیٹوں پر گر گئی تھی۔ عدا تو جتنی ہوئی اُلٹے قدموں کالج کی جانب دوڑی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ کارفرمائے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ کالج کی لڑکیوں، چوکیدار اور لڑکیوں کو لینے کے لئے آنے والے مرد حضرات نے بہت بے حسی اور بزدلی سے واردات ہوتے دیکھی تھی اور کسی نے ثنا کو ان سیاہ پوشوں سے بچانے کی سعی نہیں کی تھی۔

عدا کو کالج کی لڑکیاں پرنسپل کے پاس لے گئیں۔ پرنسپل آفس سے عدا نے اپنے ایس پی والد ریاض الحق کو فون کیا اور روتے ہوئے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ثنا کے دن دیہاڑے اغواء کی خبر پورے کالج سے ثنا کے ملنے تک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ ریاض الحق نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کرا دی تھی مگر ثنا کو اغواء کرنے والے ایسے اپنی کارسمیت غائب ہو گئے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینک۔

☆☆☆

ثنا بے ہوش تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک سادہ سے بیڈ روم میں پایا۔ کمرے میں پیلے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے حیران و پریشان نظروں سے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ یکا یک اس کے حواس بیدار ہو گئے اور اسے ساری صورت حال سمجھ میں آ گئی۔

”میں اغواء ہو چکی ہوں۔ یا اللہ یہ کیا ہو گیا میرے ساتھ۔“ وہ خوف و ہراس سے روتے ہوئے بولی۔ کلائی پر بندی رسٹ وایج پر نگاہ ڈالی تو اس کی روح کا پٹھن اٹھی۔ شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ یعنی وہ پچھلے ساڑھے چار گھنٹے سے یہاں قید تھی۔

”یا اللہ میری مدد فرما، مجھے یہاں سے جانے کا راستہ دکھا میرے مالک۔“ وہ روتے ہوئے دُعا مانگ رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اس کی جان نکال گیا۔ وہ سبھی سبھی سی بیڈ کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ کمرے میں وہی سیاہ پوش کھانے کے لوازمات سے بچی ٹرے لے کر داخل ہوا۔

”ہوش آگیا تمہیں۔ لو کھانا کھا لو اب تک تو تمہارے باپ کے ہوش بھی ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔ بڑا قانون کا محافظ بنا پھرتا ہے، اب پتہ چلے گا اُسے ہمارا کام نہ کرنے اور ہماری بات نہ ماننے کا خلیازہ نکلتے گا۔ اب سارا شہر تھوکر رہا ہے کہ ایک پولیس آفیسر کی بیٹی دن کے اُجالے میں لوگوں کے جھوم میں اغواء کر لی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکا۔“ وہ سیاہ ماسک والا شخص بہت کراخت لہجے میں

”آمین!“

☆☆☆

خرم صبح صبح اس کے لئے سُرخ تازہ گلاب لئے حاضر ہو گیا اور مَنُحول اس کی جانب بڑھایا تو وہ بلش ہو گئی۔

”آج صبح صبح محبت کا سبق پڑھانے چلے آئے ہو، خیر تو ہے۔“ وہ مَنُحول لے کر بولی۔

”میں نے سوچا کہ تم صبح سویرے میری صورت دیکھ لو گی تو سارا دن اچھا گزرے گا۔“ وہ شونی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا یا تمہارا دن؟“ وہ بڑی ادا سے بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”چلو یوں ہی سہی دیسے تمہیں پتہ ہے آج مابذلت کو اپنی اس حسین و جمیل منگیتر کے لئے شادی کا تحفہ خریدنا ہے خریدنا کیا ہے آرڈر پر بنوایا ہے۔ آج مل جائے گا۔“ وہ رازداری سے بتا رہا تھا ثنا شرمانے لگی۔

”کیا بنوایا ہے؟“

”یہ سر پرانز تو شادی کی رات ہی ملے گا۔ بس ایک ماہ بعد تم میرے اتنے قریب ہو گی کہ سارے قافلے سمٹ کر رہ جائیں گے۔“

”بکومت، جاؤ یہاں سے۔“ وہ شرما کر بولی اور تیزی سے باہر بھاگی جہاں اسرار الحق اسے اور عدا کو کالج کو چھوڑنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ خرم ہنستا مسکراتا ناشتے کی میز پر آ گیا تھا۔

ثنا کا آخری پیچہ بہت شاندار ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھی، آج عدا کی کلاسز آف ہو چکی تھیں۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی کالج کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ کالج میں صرف تھرڈ ایئر کی چند کلاسز ہو رہی تھیں اور بی اے، بی ایس سی کے امتحانات ہو رہے تھے۔ اس وجہ سے رش بہت کم تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا عدا اور ثنا کو اسرار الحق اور انوار الحق کا انتظار کرتے کرتے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

”اب کیا کریں؟ پیدل ہی چلتے ہیں مگر کون سا دور ہے۔“ عدا نے کہا۔

”ہاں چلو لوگ بھی آتے جاتے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں کالج بھی خالی ہونے کو ہے۔“ ثنا نے کہا اور دونوں گھر کی جانب جانے والی سڑک کی طرف مڑ گئیں۔

ابھی وہ چند قدم ہی چل پائی تھیں کہ ان کے قریب ایک کار آ کر رکی وہ دونوں گھبرا کر پیچھے ہٹیں۔ ابھی وہ صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پائی تھیں کہ کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لمبا

بولا۔ "پتہ نہیں تھا کیوں لگا کہ وہ شخص آواز بدل کر بول رہا ہے تاکہ وہ اس کی شناخت نہ کر سکے۔"  
"کک..... کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو.....؟" م..... مجھے کیوں اغواء کیا ہے.....؟" وہ  
ڈرتے ہوئے لرزتے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"تمہارے باپ سے اپنی بات منوانے کے لئے ہم نے تمہیں اغواء کیا ہے لو کھانا  
کھاؤ۔" وہ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

"پلیز! مجھے جانے دو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہو لڑکی، بگاڑیں گے تو ہم تمہارا..... تمہارا باپ ہمارے آدمی چھوڑ  
دے گا تو ہم بھی تمہیں چھوڑ دیں گے جب تک وہ ہماری بات نہیں مانتا تم یہیں رہو، کھاؤ پیو، سوؤ  
جاگو، سوچ کرو۔" وہ مکروہ انداز میں قہقہہ لگا کر بولا تو وہ اس کی باتوں سے اپنی آن، آبرو کی بربادی  
کا خوف محسوس کرنے لگی۔

"پلیز! مجھے جانے دو، تمہاری بھی تو بہن بیٹی ہوگی۔"

"اے خبردار! ہماری بہن بیٹی کا نام مت لو ورنہ....." وہ اسے کڑھکی سے ٹوک کر بولا  
اور گھورتا ہوا واپس چلا گیا اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

ٹٹا بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے کئی بار اس  
نے کمرے کے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے پینا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

عشاء کی اذان بہت دور سے اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس نے کمرے سے ملحق  
 غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور اپنی چادر اوڑھ کر نماز ادا کرنے لگی۔ کہیں دوسری چادر یا جائے نماز  
تو اسے میسر نہ تھی۔ نماز پڑھ کر رو کر اپنی خیر و عافیت سے، عزت سے گھر واپسی کی دعا مانگی اور پھر  
سے دروازہ پینے لگی۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی خاموش جزیرے میں آگئی ہے جہاں کوئی بھی اس کی آواز  
سننے کو تیار نہ تھا۔ سب بہرے تھے کسی کے کانوں تک اس کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔

"میرے اللہ! تُو تو میری فریاد سن رہا ہے نا، رحم کر مالک! مجھے یہاں سے نکال میرے  
اللہ۔" وہ روتے ہوئے اپنے رب سے مخاطب تھی۔

دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھل گیا اور آنے والے نقاب پوش نے دروازہ اندر سے  
لاک کر لیا تھا اور یہ منظر دیکھ کر شامہی ہوئی چڑیا کی طرح تھر تھر کاہنے لگی۔ وہ شخص دھیرے دھیرے  
آگے بڑھ رہا تھا۔

"نن..... نہیں مجھے مت مچھو نا..... بت..... تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے..... مت مچھو نا۔"

وہ چیخ مار کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی جھلک تھی۔

"ش....." اس شخص نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے مزید بولنے  
سے باز رکھنے کا اشارہ دیا تو وہ ہچکلی لیتی، روتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ کوئی جائے فرار باقی نہیں بچی  
تھی۔ وہ بے بس کھڑی اپنی حالت پہ ماتم کناں تھی۔ اس سیاہ ماسک والے شخص نے میز پر رکھی  
کینڈل جلائی اور بلب بجھا دیا اور شامہ کی جانب پلٹا۔ وہ دیوار سے لگی اپنے بے جان ہوتے وجود کی  
عسارت کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ  
شخص بہت کھلتی خواہشوں کے تلاطم سے سرشار اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"نہیں پلیز! مجھے مت مچھو نا۔" وہ فریاد کرتی بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے اس گدھ کے  
پروں میں پھنس کر رہ گئی۔ اس کے مضبوط ہڈ اس کا سارا بدن ڈھانپ چکے تھے۔ اس کے آنسو سمندر  
میں شبنم کی مانند حل ہو گئے۔ سسکیاں، ہچکیاں، تند موجوں کی آواز میں بے صدا ہو گئیں اور وہ سبھی  
ہوئی چڑیا ذلت و رسوائی کے اقصاء سمندر میں غوطے لگاتے ہوئے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

"آپ کی پولیس کیا ہنگامہ کر رہی ہے جواب تک میری بیٹی کے بچرموں کو اور میری  
معصوم بیٹی کو نہیں ڈھونڈ سکی؟" سلمی بیگم نے روتے ہوئے ریاض الحق سے کہا۔

"حوصلہ کرو سلمی بیگم! دعا کرو پولیس کوشش کر رہی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی اچھی خبر  
سننے کو ملے گی۔" ریاض الحق نے اپنی پریشانی مٹھاتے ہوئے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا خرم اور اس  
کے امی ابو بھی وہاں آچکے تھے۔

"اب اچھی خبر سننے کو مل بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ خاندان بھری ذلت و رسوائی تو  
ہوگئی نا شہر بھر میں اب اخبارات میں بھی خبریں لگیں گی۔ خوب نام روشن ہوگا ہمارا۔" نرمس نے بے  
حسی سے کہا۔

"امی پلیز! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔" خرم نے انہیں ٹوکا۔

"ریاض بھائی! اغواء کرنے والوں کا فون تو آیا ہوگا۔" فیاض الحق نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تک تو کوئی فون نہیں آیا۔" نجمانے کس مقصد کے لئے انہوں نے میری بیٹی کو  
اغواء کیا ہے؟" وہ پریشانی سے بولے۔

"کیا خبر اغواء کیا ہے یا وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔" نرمس کی زبان نے زہرا کا تو سلمی  
بیگم بے قرار ہو کر پولیس۔

”نرگس! خدا کا خوف کرو۔ میری ثنا معصوم ہے، اُسے اغواء کیا گیا ہے۔ عدا یعنی گواہ ہے اور بہت سے لوگ گواہ ہیں۔“

”بھابی! کل کو یہی گواہ ہاتھوں میں پتھر لئے اسے سنگسار کرنے کے لئے آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔“ نرگس نے بے دردی سے کہا۔

”تم تو بس چپ ہی رہو نرگس۔“ فیاض الحق نے بیوی کو ڈانٹا۔  
”میں تو چپ ہوتی جاؤں گی لوگوں کو کون چپ کرائے گا۔ ان کی زبانیں کون پکڑے گا؟“ نرگس نے غصے سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”چلو خرم!“ اور خرم چپ چاپ ان کے ساتھ چل پڑا۔

☆☆☆

پورے سات دن گزر گئے تھے۔ آج اسے اس قید میں، اس کی حالت برسوں کی بیماری سی ہو گئی تھی۔ آٹھویں شب آئی تو اسے قید سے رہائی کا پروانہ مل گیا۔ وہ سیاہ پوش بڑی آسانی سے کھڑا ہوا تھا۔

”معاف کرنا لڑکی، تم وہ نہیں ہو جسے اغواء کرنے کا ہمیں حکم ملا تھا۔ وہ تو تمہارے باپ سے بھی بڑے افسر کی بیٹی تھی۔“

”کیا.....؟“

”ہاں اب تم جاسکتی ہو۔“

”کہاں جاؤں گی اب میں.....؟“ وہ اس ذلت پر روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”اپنے گھر.....!“

”گھر والے اب مجھے قبول کر لیں گے کیا.....؟“

”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ ہمیں تو تمہیں رہا کرنے کا حکم ملا ہے۔ باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ میں نے ڈرائیور کو تمہارے گھر کا پتہ سمجھا دیا ہے اور کرایہ بھی دے دیا ہے۔ جاؤ اور ہاں چہرہ چھپا کر نکلتا۔“ وہ ہدایات دے رہا تھا۔

”اب کیا تم بڑے افسر کی بیٹی بھی اغواء کرو گے اس کی بھی عزت تار تار کرو گے؟“ وہ کسی کے دھوکے میں اپنے آپ کو سزا ملنے پر صدمے سے چور لہجے میں بولی۔

”نہیں۔ اس نے پہلے ہی ہمارے بندے چھوڑ دیئے ہیں۔ تمہارے اغواء سے بھی ہمارا کام ہو گیا ہے، اب جاؤ یہاں سے۔“ وہ کرخت لہجے میں بولا تو وہ اپنے وجود کی کڑیوں کو سمیٹتی ہوئی

وہاں سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

”کون ہو تم؟“ وہ گھر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سارنہ بھابی اس کے نقاب میں چھپے چہرے کو پہچان نہ سکیں اور فوراً پوچھا۔  
”میں ثنا.....“

”ثنا..... تو چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے، دکھانے کے قابل جو نہیں رہا اس لئے نا۔“ سارنہ بھابی نے طنزیہ جملہ بولا تو اس نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

”کون ہے؟“ عدا، اسرار الحق، سملی بیگم اور بشری سب ایک ساتھ چلے آئے۔  
”آگئی ہیں آپ کی بہن صاحبہ خاندان کی عزت نیلام کر کے۔“ سارنہ نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ثنا کے زخم رسنے لگے۔

”ثنا! میری بچی کیسی ہے تو.....؟“ سملی بیگم نے دوڑ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔  
”امی! امی!.....“ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔

انہوں نے ڈاکٹر کو گھر بلایا تھا وہ ثنا کو نیند کا انجکشن لگا کر چلا گیا۔  
وہ گہری نیند سو گئی تھی اور صبح ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے کچھ یاد آ رہا تھا۔ قیامت کے

سات دن اور سات راتیں اور اپنی آبرو کے خاک ہونے کی تلخ حقیقت اُسے اُٹلے جارہی تھی۔ اس تصور سے ہی اس کے بدن میں چوہنیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ اس کی اس بات پر کسی نے یقین نہیں کیا کہ اسے کسی اور کے دھوکے میں اغواء کیا گیا تھا اور سات دن بعد اغواء کرنے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ ثنا اپنی صفائی دیتے دیتے تھک گئی تھی، ہار گئی تھی۔

دکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ اس کے ماں باپ نے اسے اکیلا کر دیا تھا۔ اس کی محبت کا دم بھرنے والے خرم نے اُسے ایک فون تک نہ کیا تھا کہاں وہ اس کو دیکھنے کے لئے یہاں یہاں سے گھر آیا

کرتا تھا اور اب وہ ایک بار بھی اس کا حال پوچھنے نہیں آیا تھا۔ محلے والے، رشتے دار، کالج کی سہیلیاں، لڑکیاں سب ہی اس کے واپس آنے پر طرح طرح کی باتیں بتا رہے تھے۔ گھر میں کوئی

اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سملی بیگم یا عدا اس کے کمرے میں کھانا رکھ کر چلی جاتیں۔ وہ کھانا کھائے نہ کھائے اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ثنا تو اندر سے مر گئی تھی۔ زندہ لاش بن کر

رہ گئی تھی وہ۔ رسوائی اور تنہائی نے اسے آدھ موار کر کے رکھ دیا تھا۔  
”کھانا کھا لو۔“ عدا نے اس کے سامنے ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔



”مجھے ٹھوک نہیں ہے۔“

”گلتا ہے یہ اپنی ساری ٹھوک پیاس بچھا کر آئی ہے سات دنوں میں۔“ سائرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زہر میں بچھا ہوا تیرا اچھالا جس سے وہ لہو لہو ہو گئی۔

”بھابی! آپ بھی مجھے۔۔۔۔۔“

”میں کیا سارا شہر یہی کہہ رہا ہے۔ چلو نندا۔“ سائرہ بھابی نے تنگی سے کہا اور نندا کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر کم صدمہ ٹیٹھی رہی، پھر کچھ سوچ کر کھانا کھانے لگی۔ کھانے سے فارغ ہو کر برتن کچن میں رکھنے کے لئے باہر آئی تو لاؤنج میں سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لئے۔

”کاش! ثناء زندہ واپس نہ آئی ہوتی مر گئی ہوتی تو ہم اسے ایک بار ہی رو لیتے اب تو ہر روز کا روتا ہے۔“ سلسلی پیگم سپاٹ لہجے میں بولیں تو ثناء کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس کی ماں اس کی موت کی تمنا ہی تھی۔

”کھانے میں زہر ملا کر دے دیں۔ بیمار تو ہے ہی جلد ہی رخصت ہو جائے گی۔“ یہ ندا کی آواز تھی۔ ثناء کے لئے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی ٹرے میز پر رکھی اور ان سب کو دیکھتے ہوئے لرزتی آواز میں بولی۔

”آپ لوگوں کو قاتل اور مجرم بننے کی ضرورت نہیں ہے میں خود ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ہاں بھئی اب تو چکا لگ گیا ہے آوارہ پھرنے کا اب یہ گھر میں قید ہو کر کیوں رہے گی۔ جاؤ جاؤ ابھی ہمیں رسوا کرنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر دو۔“ بشری بھابی نے بھی زہر اگلا۔

”تمہارے بعد تین بیٹیاں ہیں اس گھر میں ثناء بی۔ ان پر تمہارے کردار کا منفی اثر پڑ سکتا ہے پھر تمہاری یہ سزا۔“ ندا کی روپوشی ہی بہت ہے۔ کون آئے گا ہماری بیٹیوں کو بیاہنے۔ تم تو منہ پہ کا لک مل کے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی ہو۔ لوگوں کو تو ہمیں ہی فیس کرنا ہوتا ہے نا۔ ابھی ندا کی بھی شادی ہوتی ہے۔ تم سے اب کون۔۔۔۔۔ گے گا؟ تمہیں شادی کی ضرورت بھی کیا ہے اور جو لڑکی ایک بار اپنی عزت گنوا بیٹھے اسے بار بار بے عزتی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سائرہ بھابی نے بے حسی اور سفاکی سے کہا۔ اس کے پورے وجود میں میٹھیں گھڑتی چلی گئیں اور غصے سے پھٹ پڑی۔

”بھابی! شرم آنی چاہئے آپ کو اس قدر گھٹیا سوچتی ہیں آپ۔“

”مجھے کیوں شرم آنی چاہئے؟ شرم تو تمہیں نہ آئی جہاں سات دن اور سات راتیں رنگ

رلیاں مناتی رہی ہو وہیں رتیں یہاں کیا لینے آئی ہو؟“ سائرہ بھابی نے شعلہ بار لہجے میں کہا۔

”میں سمجھتی تھی کہ آپ میرے اپنے ہیں۔ میری ساری زندگی آپ سب کے سامنے گزری ہے آپ تو مجھے قصور وار نہیں ٹھہرائیں گے مگر آپ سب تو مجھے ہی مجرم سمجھ رہے ہیں۔ میں بے گناہ ہوں، میں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ میں بے قصور ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”تم نے تو کچھ نہیں کیا لیکن تمہیں اپنے ساتھ لے جانے والوں نے بہت کچھ کیا ہوگا تمہارے ساتھ۔ انہوں نے کیا شاہی مہمان بنا کر عزت سے رکھا ہوگا تمہیں بولو۔“ بشری بھابی نے جرح کی تو ثناء کا وجود اس گونگے نقاب پوش کے شعلہ بدن کی چنگاریاں محسوس کر کے سلگ اٹھا اور وہ چیختی ہوئی روتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی اور بستر پر ڈھیر ہو کر پلٹنے لگی۔

”ثناء ریاض تم پر زندگی کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ تمہارے خواب بکھر چکے ہیں تمہیں مرجانا چاہئے۔ ایک آبرو باندھ بیٹی کے لئے ماں باپ کے دل اور گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ باپ کا گھر بھی غیر ہو جاتا ہے، رشتے اجنبی ہو جاتے ہیں، خون سفید ہو جاتا ہے، لہجے میں زہر گھل جاتا ہے، الفاظ نشتر بن جاتے ہیں جو پل پل روح کو گھائل کرتے رہتے ہیں۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں کب کا خود کو ختم کر چکی ہوتی۔ یا اللہ اس ذلت بھری زندگی سے تو بہتر ہے تو مجھے موت دے دے۔ میں نہیں ہوں اس آزمائش کے قابل، مجھے بخش دے میرے مولا، میرے گناہ معاف کر دے، مجھے اس ذلت و رسوائی کے غار سے باہر نکال دے مالک!۔“ وہ روتے ہوئے رب کے دربار میں فریاد کناں تھی۔

”سکے رشتے بھی بُرے اور کڑے وقت میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں میں تو بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں کوئی بھی تو نہیں ہے میرا کوئی بھی نہیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اجڑی اجڑی دیران آنکھوں سے خرم کو دیکھ رہی تھی۔ آج نجانے کیوں اچانک چلا آیا تھا مگر جب سے آیا تھا خاموش تھا۔

”تم بولتے کیوں نہیں ہو خرم؟“ تھک کر ثناء نے خود ہی سوال کیا۔

”بولنے کو اب ہمارے پاس بچا ہی کیا ہے؟“

”تم بھی مجھے ہی قصور وار سمجھ رہے ہو خرم تم بھی۔۔۔۔۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”سب یہی سمجھتے ہیں۔“ وہ بولا ”ثناء تم۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ بولتے بولتے پھر سے

خاموش ہو گیا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں مجھ سے اپنی محبت کے دعوے شرمسار کر رہے ہیں میں نے کہا تھا نادیکھیں گے سو وقت نے بہت جلد دکھا دیا تم تو ہر آزمائش میں پورے اترنے کے دعوے دار تھے نا خرم..... لیکن ایک ہی آزمائش میں تمہارے دعوؤں کا محبت بھرے دعوؤں کا پول کھل گیا ہے اچھا ہوا..... جاؤ خرم تمہاری سانسیں میری جدائی میں ہرگز نہیں رکس گی۔ تم میرے بغیر بھی بہت خوش رہو گے۔ اس لئے کہ تم نے مجھ سے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ محض دعوے کئے تھے ہے نا۔“ وہ سنجیدگی سے آزدگی سے بولتی اسے شرمندہ کر رہی تھی۔ وہ اس کے خاموش ہونے پر زکا اور مگنٹی کی انگلی سے اپنے ہاتھ سے اُتار کر اس کے سامنے رکھ دی اور دروازے کی جانب بڑھ گیا تو ٹٹانے کہا۔

”سنو! تم بہت سی باتوں اور دعوؤں کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی بھول رہے ہو۔“

”کیا.....؟“ وہ واپس مڑا۔

”یہ انگلی!“ ٹٹانے اس کی پہنائی ہوئی انگلی اُتار کر اس کی طرف بڑھا دی جو اس نے شرمندگی کے عالم میں اس کے ہاتھ سے لے لی۔

”میں چلا ہوں۔“

”ہاں! تمہیں اب چلے جانا چاہئے کیونکہ یہاں رکنے کا ظرف تم میں ہے ہی کہاں؟“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی تو وہ نظریں چراتا ہوا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ بے اختیار ہنس پڑی اور ہنسنے ہنسنے روئے لگی۔

”تو یہ تھی ثنائی تمہاری محبت، ایک ناکردہ منہا نے سب کی حقیقت ظاہر کر دی۔ سارے رشتے ساری محبتیں یکا یک دم توڑ گئیں۔ خرم تم ذرا دیر کو بھی میرے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکے۔ اس ایک واقعے نے مجھ سے کیا کچھ چھین لیا ہے۔“

”ٹٹا! کھانا کھاؤ۔“ سلی بیگم نے ٹرے اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔

”امی آپ کیوں زحمت کرتی ہیں، میں خود آکر کھا لیتی۔“ وہ شرمندہ ہو کر بولی۔

”چھوڑو یہ بتاؤ خرم آیا تھا صبح کیا کہہ کر گیا ہے؟“ سلی بیگم نے بے چینی سے پوچھا کیونکہ وہ خرم اور اس کے ماں باپ کے رویوں سے سمجھ تو رہی تھیں کہ وہ اب ان کی ٹٹا کو بیاہنا نہیں چاہتے۔

”کچھ نہیں کہا بس یہ واپس کر گیا ہے۔“ اس نے خرم کی دی ہوئی مگنٹی کی انگلی سائیڈ ٹیبل پر سے اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دی۔

”مجھے یہی ڈر تھا اور یہ تو ہونا ہی تھا۔ کون بیاہے گا اب تجھے بد بخت؟“ سلی بیگم نے

انگلی پکڑتے ہوئے اس کے خالی ہاتھ کو دیکھ کر خرم کی مگنٹی پر پہنائی گئی انگلی نہ پا کر غصے دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”امی! اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ رونے کو ہو گئی پھر سے، غیروں کے دیئے زخم چنچہ کم نہ تھے۔ اس پر اپنوں کے زہر میں بکھے تیر اس کو اور بھی چھلنی کر رہے تھے۔

”تیرا قصور نہیں ہے نہ سہی، پر اب میں کیا کروں تیرا بھتا مجھے؟“

”جان سے ماروں مجھے تاکہ آپ سب کی جان ہی بچوٹ جائے۔“ وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

”ماں نہ ہوتی تو شاید مار بھی دیتی۔ تیری وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ عا کے لئے جو رشتے آئے تھے وہ بھی واپس ہو گئے۔ لڑکے والے کہتے ہیں کہ ہم ابھی لڑکی کو اپنی بیہوش بناسکتے جس کی بہن کے انواء کے چہچہ پورے شہر کی زبان پر ہوں۔“ سلی بیگم نے غصے سے کہا۔

”مے بہن کے مستقبل کا خیال ہوتا تو یہ گھر آنے کی بجائے وہیں کہیں شرم سے ڈوب کر مر گئی ہوتی..... ہونہہ مگر نہ جی یہ تو اپنی ساری شرم باہر اُتار کر آئی ہیں۔“ عا نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو ٹٹا کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سا جائے۔ ایسی ذلت، توہین اور جھک اس کے سکرے رشتے بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گھر واپسی پر اسے باہر ہونے والے سلوک سے بڑھ کر ذلت اٹھانا پڑے گی۔

”عا! تم جاؤ یہاں سے۔“ سلی بیگم نے عا کو سختی سے حکم دیا۔

”امی! مجھے نہیں ٹٹا کو حکم دیں۔ یہ یہاں مہارانی بن کر بستر پر بیٹھ گئی ہیں۔ ہم اس قواب زادی کے نوکر لگے ہیں جو صبح و شام اس کے حضور میں لوازمات پیش کرتے رہیں۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں اس کے اپنے کام خود کیوں نہیں کرتی؟“ عا نے نہایت بدتمیزی سے جواب دیا۔ ٹٹا ضبط و صبر سے سب کچھ سنی اور سختی رہی۔ سلی بیگم غصے سے عا کو کھینچتی ہوئی باہر لے گئیں۔

”میں کیا کروں یا اللہ! کوئی تو راہ دکھلا دے مجھے کوئی تو وسیلہ بنا دے میرے اس عذاب کو کم کرنے کا۔ رحم کرو میرے مالک! رحم کر دے مجھ پر۔“ ٹٹا نے دیوار پر آویزاں خانہ کعبہ کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اللہ سے مخاطب ہو کر دُعا اور مدد مانگی پھر گہری سانس لے کر کچھ دیر یوں ہی کم صم بیٹھی رہی۔ کھانا سامنے رکھا تھا۔ بھوک مرچکی تھی پھر بھی دو چار نوالے کھا کر رزق کا شکر ادا کرنے کے خیال سے نوالہ تو ڈالیا۔ ابھی تیرا نوالہ طلق سے نیچے اترا تھا کہ اُسے ابکائی آگئی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دواش روم کی طرف بھاگی۔ سلی بیگم کسی کام سے کمرے میں آئیں تو دواش روم کے کھلے دروازے



سے اسے واش ٹین میں، تے کرتے دیکھ کر لرز کر رہ گئیں۔ وہ اس کا سبب بھی بخوبی جانتی تھیں۔  
 ”یا امی! اس قیامت کی کمی باقی تھی بس، تو نے کس امتحان میں ڈال دیا میری بیٹی کو.....  
 کیا لکھا ہے اس کی قسمت میں، اس ذلت سے تو اچھا تھا کہ اسے موت دے دیتا۔ اب کہاں تک  
 چھپائیں گے ہم ذلت و رسوائی کی نشانی کو۔“ سملی بیگم نے روتے ہوئے فریاد کی۔ ٹائڈ حال ہی  
 کمرے میں آچکی تھی اور ان کی بات سن کر اس کے دل میں ابھرنے والے خدشے کی بھی تصدیق  
 ہو گئی تھی۔ وہ جس گلدھ کی ہوس کا نشانہ بنی تھی اس کے لہو نے اپنا رنگ دکھا دیا تھا۔  
 سملی بیگم اسے تیار کر کے خود اپنی تصدیق و تسلیم کی خاطر گانا لوجسٹ کے پاس لے  
 گئیں۔ جس نے چیک آپ کے بعد تصدیق کر دی کہ ٹاواں بننے والی ہے۔ ٹاکی تو ساری ہمت  
 جواب دے گئی تھی یہ سن کر۔

”کیا مام دوں گی میں اس بچے کو۔ اس کے باپ کا..... کیسے بتاؤں گی اسے کہ وہ ناجائز  
 اولاد ہے میری؟“ ٹاواں نے دل میں کرب سے سوچا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم جا رہی تھی کہ اچانک کسی  
 سے ٹکرا گئی۔

”او آئی ایم سوری۔“ ٹکرانے والے نے فوراً معذرت کر لی۔ نگاہ جب ٹاواں کے اُپر سے  
 پیرانہ پیار چہرے پر پڑی تو مقابل کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

”ٹاواں آپ شاہی ہیں نا؟“

”جی آپ کون ہیں؟“ ٹاواں نے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا۔

”میں انیس احمد ہوں۔ تعجب ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ عمار کے دیے میں آپ سے  
 ملاقات ہوئی تھی اور آپ کے گھر بھی تو آیا تھا۔ میں اپنے می ڈیڑی کے ساتھ۔ آپ نے واقعی مجھے  
 پہچانا؟“ انیس احمد نے اس کی سرسوں کی ہی رنگت میں بدلی صورت کو دکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”انیس بیٹے! یہ تو اپنی پہچان گنوا بیٹھی ہے۔ یہ کسی اور کو کیا پہچانے گی۔“ سملی بیگم لڑی  
 وکڑ سے علیحدگی میں کچھ بات کرتے رک گئی تھیں۔ کمرے سے باہر آئیں تو انیس کو دیکھ کر اس کی  
 سن کر قریب آکر دیا ہوئیں۔

”میں سمجھا نہیں آئی کیا ہوا ہے ٹاواں کی حالت دیکھ کر مجھے بہت شاک پہنچا ہے۔ یہ  
 میں کیا؟“ انیس احمد نے بے قراری سے پوچھا اور سملی بیگم سوچ رہی تھیں کہ کاش انہوں نے ٹاواں  
 کو احمد سے ہی جلد بیزادہ کر دیا ہوتا جو ان کی بیٹی سے محبت کرتا ہے تو شاید وہ اس حادثے سے محفوظ رہتی۔  
 ”ہاں بیٹا یہ بتا رہا ہے۔“

”کیا ہوا ہے انیس؟“ انیس کی بے چینی عروج پر تھی۔

”اسے جو مرض لاحق ہوا ہے اس کا علاج تو صرف موت ہے۔ چلو ٹاواں۔“ سملی بیگم نے  
 سپاٹ لہجے میں کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئیں۔

”اللہ نہ کرے کہ ٹاواں کو مجھ سے پہلے موت آئے کیا ہوا ہے اسے۔“ انیس نے زیر لب کہا  
 اور پھر کسی سوچ نے اس کا رخ ڈاکٹر حمیرا مجید کے کمرے کی طرف موڑ دیا۔

”نتیجہ تم اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند رکھا کرو اگر تمہاری بھابیوں نے تمہیں انہیاں  
 کرتے دیکھ لیا تو وہ پورے خاندان میں چرچہ کر دیں گی۔ جان سے مار دیں گی تمہیں اور باپ  
 بھائیوں میں سے کسی کو خبر ہو گئی تو فوراً تمہیں گولی مار دیں گے اور خود پھانسی چڑھ جائیں گے۔ ہم  
 میں اس گھر کی حرید رسوائی اور جنگ ہنسائی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ خدا غارت کرے اس  
 ذلیل انسان کو جس نے ہمیں یہ دن دکھائے ہیں۔“ سملی بیگم نے ٹاواں کو اس کے کمرے میں لاتے ہی  
 دروازہ بند کر کے آہستگی سے کہا تو وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اُسے بدو عادی سے کون سا ہمارا امتحان مل جائے گا۔ امی پلیز! آپ مجھے کہیں سے  
 زہر لادیں یا میرا گلا دبا دیں، مار دیں مجھے۔“

”میں نے ڈاکٹر حمیرا سے تمہاری جان چھڑانے کی بات کی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ اس سے  
 تمہاری زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے کیونکہ تم میں کمزوری بہت ہے اور یہ بھی کہ یہ تو قتل ہے اور وہ اس قتل  
 میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اسے کیا خبر کہ یہ ہماری آبرو کا قتل ہے۔“

”اب کیا ہو گا امی؟“

”ایک بات میرے دماغ میں آئی ہے انیس احمد کو وہاں دیکھ کر میں اس کی می می کی  
 فون کر کے کہتی ہوں کہ آکر ٹاواں اور انیس کا رشتہ طے کر لیں۔“ سملی بیگم کو اُمید کی ایک ہلکی سی کرن  
 دکھائی دی تو کہنے لگیں۔ ٹاواں کی خوش فہمی پر فخر پڑی۔

”امی! آپ نے باعث اور باعث بیٹی کو ان کو بہو بنانے سے انکار کر دیا تھا اب کیا وہ  
 آپ کی بیٹی کو قبول کر لیں گی؟“

”بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ زیادہ سے زیادہ انکار ہو جائے گا اور مزید ذلت کا منہ  
 دیکھنا پڑے گا تو کیا ہوا یہ ذلت اس ذلت سے تو کم ہی ہوگی۔ میں بات کرتی ہوں تمہارے باپ  
 سے لیکن انہیں تمہارے اُمید سے ہونے کا نہیں بتاؤں گی اور تم بھی کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔ اللہ  
 کرے جو میں سوچ رہی ہوں وہ جائے۔“ سملی بیگم نے مدہم آواز میں کہا اور اسے دروازہ اندر سے

لاک کرنے کا کہہ کر باہر نکل گئیں۔

”بچوں کی سی باتیں مت کرو سہیلی بیگم! ہم بیگم نفیس کو انکار کر چکے ہیں اب اپنے منہ سے کیسے اقرار کر لیں اور کیا وہ ثنا کو قبول کر لیں گی اب؟“ سہیلی بیگم نے ریاض الحق سے بات کی تو وہ برہمی سے بولے۔

”چنانچہ میں ان سے بات ضرور کروں گی۔۔۔۔۔ میں اپنی بیٹی کو یوں سسکتا، ترہاتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں ماں ہوں آخر مجھے جو بھی راستہ بھائی وے گا میں اس طرف، قدم ضرور بڑھاؤں گی۔ آپ کے بھائی بھادج تو انکاری ہو گئے ہیں۔ انگوٹھی خرم خود واپس کر گیا ہے۔ اب آپ کس سے اس لگائے بیٹھے ہیں۔ بیگم نفیس کے آنے پر کیسے بڑے بول بولے تھے نا آپ نے اللہ نے شاید اسی کی سزا دی ہے ہمیں۔“ سہیلی بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔“ ریاض الحق نے بے بسی اور عداوت کے احساس سے چور ہو کر کہا تو وہ بیگم آسیر نفیس کو فون کرنے چلی گئیں۔

☆☆☆

”مما! وہ ٹھیک نہیں ہے۔“ انیس احمد ٹوٹا ہوا گھر پہنچا اور سیدھا آسیر بیگم کے پاس آکر بولا۔

”کون ٹھیک نہیں ہے کس کی بات کر رہے ہو بیٹا؟“

”ثنا کی۔۔۔۔۔ وہ میرے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی ممی پلیر آپ ایک بار آخری بار اس کے گھر چلی جائیں۔ اس کے ماں باپ سے اسے میرے لئے مانگ لیں پلیر ممی! کسی بھی قیمت پر آپ اسے میرے لئے مانگ لیں ورنہ وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔۔۔۔۔ اور اگر وہ مر گئی نا ممی تو آپ کا انیس بھی مرجائے گا۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر پرغم لہجے میں بولا تو وہ دنگ رہ گئیں۔

”اللہ نہ کرے، کیسی دل دکھانے والی باتیں کر رہے ہو۔ ثنا تمہاری دلہن بنے گی ضرور بنے گی، پٹنگ پہلے تم ان لوگوں کے انکار کے صدمے میں پڑ گئے اور اب مرنے کی بات کر رہے ہو۔ خبردار آئندہ ایسی بات کہی۔“ بیگم آسیر نفیس نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر نرمی سے کہا۔

”آپ وعدہ کریں آپ ثنا کے گھر کل ہی جائیں گی۔“

”جاؤں گی میرے چاند کل ہی جاؤں گی۔۔۔۔۔ تمہیں پتا ہے ثنا کی امی کا کچھ دیر پہلے فون آیا تھا، انہیں یہ رشتہ قبول ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی۔

”سچ ممی۔۔۔۔۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”ہاں میرے چاند بالکل لیکن وہ اس کے علاوہ کوئی بات بتانا چاہ رہی تھیں کہہ رہی تھیں کہ

ان کی بات سننے کے بعد اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو بے شک اسی جتنے کو بارات لے کر آجائیں۔“

”مما! ان کی بات جو بھی ہو آپ کو اسی جتنے کو ثنا کو میری دلہن بنا دینا ہے۔ بس کچھ بھی ہو آپ انکار نہیں کریں گی۔ ممی ورنہ وہ لوگ ثنا کو مار دیں گے۔ آپ کے بیٹے کو مار دیں گے۔“ وہ بھینکتے، بے قرار لہجے میں بولا اور اٹھ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ بیگم آسیر نفیس الجھن میں جلا ہو گئیں۔

☆☆☆

”آپ ثنا کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ سہیلی بیگم اگلے دن آسیر نفیس کے آنے پر انہیں ثنا کے کمرے میں لاتے ہوئے بولیں۔ ان کی نظر ثنا کے چہرے پر پڑی تو حیران رہ گئیں۔

”ارے ثنا بیٹی کو کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے سہیلی بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ آپ کو ثنا خود بتائے گی میں ذرا کچن سے ہو آؤں۔“ سہیلی بیگم یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور بیگم آسیر نفیس احمد ثنا کے پاس چلی آئیں اور ان کے سوال کے جواب میں اس نے روتے ہوئے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کا حال کہہ سنایا لیکن اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے نتیجے میں اُمید سے ہونے والی تلخ حقیقت چھپا گئی تھی۔

”او میرے خدایا! ایک تو ظلم بھی تم پر ہوا اس پر تمہارے انہوں نے تم سے دشمنوں کا سا سلوک روا رکھا ہوا ہے۔“ انیس صد افسوس۔“ بیگم آسیر نفیس نے تاسف اور دکھ سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں آٹنی کہ آپ بھی مجھے قبول کرنے کا حوصلہ نہیں کر پائیں گی۔ امی نے ناحق آپ کو زحمت دی ہے۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی تو انہوں نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھ کر نرمی سے کہا۔

”تم مجھے اوروں جیسا مت سمجھو۔ میں تمہیں قصور وار نہیں سمجھ رہی تم ایک بہادر لڑکی ہو۔“

”چائے تیار ہے آپ ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئیں۔“ سہیلی بیگم نے آکر اطلاع دیتے ہوئے کہا تو وہ کھڑی ہو گئیں۔

”نہیں شکریہ میں اب چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی سمت بڑھ گئیں اور سہیلی بیگم کی آخری اُمید بھی دم توڑ گئی۔

”اور ہاں۔۔۔۔۔“ بیگم آسیر نفیس جاتے جاتے دروازے سے پلٹیں تو ان دونوں ماں بیٹی

نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ ”پرسوں جیسے کامبارک دن ہے۔ میں اپنے انیس احمد کی بارات لے کر آؤں گی۔ ثنائی کو دلہن بنا کر ہمارا استقبال کیجئے گا۔“

”جی..... آ..... آپ سب کچھ جان کر بھی ٹا کو اپنی بہو بنائیں گی۔“ سلی بیگم کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی تھی۔ حیرت، مسرت اور بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ہاں اس لئے کہ یہ بچی معصوم ہے یہ شادی بہت دھوم دھام سے ہوگی۔ سب کی زہر اگلی زبانیں بند ہو جائیں گی، ہم بڑی شان سے ٹا کو بیاہ کر لے جائیں گے۔ اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے نا اس رشتے پر؟“

”نہیں..... یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے مبارک ہو بیگم نفیس۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ تو فرشتہ بن کر میری بیٹی کی زندگی میں آئی ہیں۔“ سلی بیگم نے خوشی سے آبدیدہ ہوتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام کر تشکر بھرے لہجے میں کہا۔

”روئیں نہیں سلی بہن! شاید ٹا اسی طرح میرے بیٹے کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔“ بیگم آسیہ نفیس نے انہیں گلے لگا کر کہا اور ٹا تو حیرت زدہ تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خوشی کا کوئی دراب بھی اس کے لئے کھل سکتا ہے۔

”ثنائیں! اب تم بھی رونا بند کرو تم نے جتنا رونا تھا رو لیا اب تو انشاء اللہ تمہارے مسکرانے اور ہنسنے کے دن شروع ہونے والے ہیں۔“ بیگم آسیہ نفیس نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ بمشکل مسکرائی۔ ان کے جاتے ہی سلی بیگم نے یہ خوش خبری سب گھر والوں کو سنائی تو سب کو خوشگوار حیرت نے گھیر لیا۔

”واہ بھئی یہ تو قسمت کی دھنی نکلی۔ اتنی رسوائی کے بعد بھی اتنی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔“ سائرہ بھابی نے کہا۔

”انیس احمد جیسا اسارٹ اور ڈھنگ بندہ اوپر سے کروڑ پتی دیکھو تو کیسا رنگ بدلا ہے ٹا کی قسمت نے۔“ ندانے حد بھرے لہجے میں کہا۔

”تم دونوں چلے بکنے کی بجائے شادی کی تیاری کرو۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے اپنی سیدی ہانکنے میں لگی ہیں۔“ اسرار الحق نے ان کی باتیں سن کر غصے سے کہا تو دونوں شرمندہ ہو گئیں۔

”کہیں وہ لوگ دھوکا ہی نہ دے دیں۔ ہم نے پہلے انکار کیا تھا وہ اس کا بدلہ نہ لیں۔ بارات نہ لا کر طلاق دے کر۔“ بشری بھابی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تمہارے منہ میں خاک کبھی تو ڈھنگ کی بات کر لیا کرو۔ میں نے تو استخارہ بھی کیا تھا۔ یہ رشتہ نہایت مبارک رہے گا استخارے کی رو سے انشاء اللہ۔“ سلی بیگم نے اسے ڈپٹ کر کہا تو وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

☆☆☆

”او چھٹک یومما! چھٹک یو دیری بچ آپ بہت گریٹ ماما ہیں۔ آئی لو یومما آئی رنٹی لو یو۔“ انیس یہ خوش خبری سنتے ہی ان کے گلے سے لگ کر خوشی سے بولا تو وہ ہنس پڑیں۔

”آئی لو یو میرے بیٹے۔“  
”چھٹک یومما۔“

”پگلے ماں کا شکر یہ تھوڑی ادا کرتے ہیں بتا کہ اپنی دلہن کو تحفے میں کیا دے گا؟“ انہوں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”تحفے میں اپنا آپ دوں گا۔“ وہ ان سے علیحدہ ہوتے ہوئے شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا تو وہ ہنس پڑیں۔ ”شریر.....“

”میں ابھی آیا ماما۔“  
”کہاں چلے؟“

”سجدہ شکر ادا کرنے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”جیسے رہو اللہ تمہیں اپنی شادی کی، اپنی زندگی کی ساری خوشیاں دکھائے۔“ انہوں نے متا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دل سے دعا دی۔

”آمین! اینڈ چھٹک یومما آئی لو یومما۔“ انیس نے ان کے ہاتھ چومتے ہوئے محبت سے کہا اور شکرانے کے نوافل ادا کرنے چل دیا۔

☆☆☆

ٹا کی شادی نے پورے خاندان میں آگ لگا دی تھی۔ سب کو بذریعہ ٹیلی فون مدعو کیا گیا تھا اور دوستوں، محلے داروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ سب حیران تھے کہ ٹا کے لئے ایک دم سے ایسا کون سا برل گیا جو اس انعام شدہ لڑکی کو قبول کر رہا ہے۔ نفیس احمد بھی بیٹے کی خوشی میں تھے۔ انہوں نے جہیز کے لئے منع کر دیا تھا۔ سلی بیگم نے ٹا کی شادی کی کافی تیاری تو کر رکھی تھی۔ کپڑے، جوتے، بستر، زیور بنا رکھا تھا سو وہ تو انہوں نے دینے کے لئے نکلو لیا تھا۔ ٹا کی بڑی بہت اٹلی تھی۔ ریڈی میڈ ملبوسات سب کچھ ایک دن کے آرڈر پر سلوائے جا رہے تھے۔



زیور کچھ بیگم آسیہ نفیس نے پہلے ہی اپنی چھوٹی بہو کے لئے بخوار رکھا تھا اور دو تین سیٹ انہوں نے مزید خرید لئے تھے۔ ساتھ میں سونے کے نگین اور چوڑیاں بھی تھیں۔ سلی بیگم کے لئے بھی سونے کا لاکٹ سیٹ خریدا گیا تھا۔ ”ریاض لاج“ میں شادی کی تقریب کا اہتمام بہت شاندار کیا گیا تھا۔ جس گھر میں کل تک صف ماتم بچھی ہوئی تھی آج اسی گھر میں نذر شادی گونج رہا تھا۔ شا کا دل ڈرا ہوا تھا۔ اسے یہ خوف ستا رہا تھا کہ اگر انیس نے اسے دل سے قبول نہ کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ وہ نمازیں پڑھ پڑھ کر اپنے بہتر باعزت اور خوشگوار مستقبل کی دعائیں مانگتی رہی تھی اب تک۔

جلس اہم اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ چونکہ لندن میں مقیم تھے اور اتنی ایمر جنسی میں پاکستان نہیں آسکتے تھے لہذا ان کے سوا انیس احمد کے تمام رشتے دار دوست احباب انیس احمد کی شادی میں شریک ہوئے اور بہت معزز و اعلیٰ عہدوں پر فائز حضرات ان کے ساتھ بارات لے کر ”ریاض لاج“ پہنچے تھے۔ جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ایجاب و قبول کی رسم ادا کی گئی تو ”ریاض لاج“ کے کمینوں کے سروں پر پہاڑ جتنا بوجھ سرک گیا تھا۔ سلی بیگم کی آنکھیں خوشی سے بھیگ رہی تھیں وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ اس نے ان کی بیٹی کی عزت رکھ لی تھی۔ اسے مزید تماشا بننے سے بچا لیا تھا۔

یہی حال ریاض الحق کا بھی تھا۔ سب ہی گھر والے اب شا کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ ان کے غصے، نفرت اور غم سے جھلے ہوئے چہروں پر جیسے بہار آگئی تھی۔ جب شا کی نئی دکھائی گئی تو خاندان بھر کی عورتوں نے حیرت سے اپنی انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔ سب کی آنکھیں حیرت اور حسد سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”انگوام شدہ اور داغ دار لڑکی کے لئے ایسا انمول بر اور نئی..... واہ رے اللہ تیرے شان۔“ نرمس بیگم نے حسد سے جلتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تا بہت معصوم بچی ہے۔ اسے بدکردار کہنے اور سمجھنے والے دراصل خود بے کردار اور سطحی سوچ کے مالک ہیں۔“ بیگم آسیہ نفیس نے نرمس سمیت ہر اس عورت کو یہی جواب دیا جو اس قسم کی گویا ہر افشانی کر رہی تھی اور سب کے منہ بند ہو گئے۔ شا کا حق مہر پانچ لاکھ روپے بیگم آسیہ اور نفیس احمد نے اپنی مرضی سے لکھوایا تھا حالانکہ ریاض الحق تو شرعی حق مہر لکھوانے پر اصرار کر رہے تھے۔

شا کو انیس احمد کی سنگت میں دعاؤں کے سائے میں رخصت کر دیا گیا۔ ”نفیس ولا“ پہنچنے پر شا کا ایسا شاندار استقبال کیا گیا کہ اسے لمحے بھر کو تو یوں لگا جیسے وہ کسی جنت میں آگئی ہو۔ سرخ

قالین پیروں تلے بچھا تھا۔ دائیں بائیں کھڑی لڑکیاں شوخ جملوں اور قہقہوں کے ساتھ اس پر اور اس کے مجازی خدا پر ہنسلوں کی برسات کر رہی تھیں۔ بیگم آسیہ نفیس نے بیو اور بیٹے کا صدقہ اتارا۔ چار کالے بکروں کا صدقہ علیحدہ سے دیا گیا۔

ڈلہا ڈلہن کو عالی شان ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد فوٹو سیشن ہوا۔ مووی بھی مسلسل بن رہی تھی۔ ضروری رسومات کی ادائیگی کے بعد دلہن کو جلد عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ جلد عروسی کی شان بھی نرالی تھی۔ مٹھولوں، کلیوں، ستاروں سے مہکتی جھللاتی ہوئی بیج وسیع و عریض بیڈ روم میں صوفہ سیٹ، ٹی وی سیٹ، ڈیک، جہازی سائز کا بیڈ، ڈرائنگ ٹیبل، ہلکے نیلے رنگ کے پردے لگے تھے۔ براڈن رنگ کا قالین فرش کی زینت بنا ہوا تھا اور وہ یہ سب دیکھ کر حیران ہوئی جا رہی تھی۔

”یا اللہ! وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے؟ کیا ہے یہ سب ایک بے آبرو لڑکی کی اس قدر پذیرائی..... یا اللہ وہ جگ ہنسائی اور رسوائی خواب تھی کہ یہ محبت بھری پذیرائی خواب ہے؟“

اور خود دلہن کے روپ میں کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ سرخ عروسی جوڑے پر سنہری کام کیا گیا تھا۔ اس پر طلائی زیورات، کلیوں کے ہار، گجروں، چوڑیوں کی آرائش نے اس کے خُسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

جلد عروسی کا در بہت آہستگی سے وا ہوا تھا اور شا کے دل کا ایک ایک گوشہ لرزنے لگا تھا۔ انیس احمد دروازہ لاک کر کے اپنی شیروانی کے بٹن کھولنے لگا۔ وہ سفید کرتا پاجامہ اور سیاہ جدید فیشن کی شیروانی کلاہ میں بہت وجہ لگ رہا تھا۔ شیروانی اور کلاہ وارڈروب میں رکھنے کے بعد وہ دلہن کی بیج کی جانب بڑھا تو بہت سرور تھا۔

”السلام علیکم!“ وہ خوشگوار لہجے میں سلام کرتے ہوئے اس کے زوہر بیٹھ گیا۔ شانے جواب تو دیا مگر صرف ہونٹ ہی ہلے آواز حلق سے نہ نکل سکی تھی۔ انیس احمد نے اُسے مسکراتے ہوئے بہت والہانہ پن سے دیکھا تھا۔ شا کے ہاتھ خوف سے کانپ رہے تھے۔

”یہ ہے آپ کی رونمائی کا تحفہ۔“ انیس نے ہاتھ میں موجود چمکی ڈبیہ کھول کر اس میں سے ہیرے کی بہت قیمتی انگوٹھی نکالی اور اس کے کانپے ہاتھ کو تمام کر اس کی خردلی انگلی کی زینت بنا دی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے سہلانے لگا۔ شا کے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ ڈری ڈری، گھبرائی گھبرائی اس کے آتش شوق کو ہوا دے رہی تھی۔

”شا! میں پہلی نظر کی محبت پر کبھی بھی یقین نہ کرتا۔ اگر مجھے تم سے پہلی نظر میں محبت نہ ہو جاتی۔ آئی لو یو تارنگی لو یو۔“ انیس نے محبت پاش لہجے میں کہا تو اس کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر اٹھیں،

”کوئی لیکن لیکن نہیں، ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گا۔ شادی کی پہلی رات ہی بیوہ ہو جاؤ گی تم پھر کیا نام لکھو گی اس بچے کی ولدیت کے خانے میں ہاں۔“ وہ خفگی سے بولا تو وہ کہم مگی اور روتے ہوئے بولی۔

”بس یہی محبت ہے آپ کی۔ شادی کی پہلی رات ہی مجھے بیوہ کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں تو پہلے ہی مر رہی ہوں زندگی کی راہ دکھا کر مجھے بالکل مار دینا چاہتے ہیں آپ؟“

”نہیں میری جان! میں تو تمہیں پیار دینا چاہتا ہوں آئی ایم سوری اب نہ تم ایسی فضول بات کرنا نہ میں ایسی بات کہوں گا اوکے۔“ وہ اسے اپنی پانہوں میں لے کر محبت سے بولا تو اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

”گڈ! چلو تم کپڑے پہنچ کر لو تھک گئی ہو گی نا، پھر آرام سے سو جانا۔“

انہیں نے بہت پیار سے کہا اور اُسے سہارا دے کر بیڈ سے اتارا اور اسے ڈرائنگ روم تک چھوڑ کر خود بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ وہ جانتا تھا ٹاکس کیفیت سے دوچار ہے اس لئے اُسے چھوڑنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اسی میں بہت مسرور تھا کہ اس کی محبت اس کی پناہ میں آگئی تھی اور ٹاکس کو انہیں کی اس خیال کرنے والی ادا نے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اس کی بہت ممنون تھی۔

وہ لباس تبدیل کر کے کمرے میں آئی تو انیس سو چکا تھا۔ شاید وہ بھی تھکا ہوا تھا یا شاید کو جھپکنے کمرانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ شانے تفکر سے اسے دیکھا اور اس سے کچھ فاصلے پر بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ آنکھیں موندیں تو نیند کی دیوی لکھنؤ میں اس پر مہربان ہوئی۔

صبح اس کی آنکھ انیس کے جگانے پر کھلی تھی۔ اسے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور جلدی سے دوپٹہ شانوں پر پھیلا لیا۔ وہ ہنس کر بولا۔

”سوری یار جگنا تو نہیں چاہے تھا لیکن کیا کرتا ممدو بارخو بلائے آچکی ہیں۔ ناشتہ تیار ہے نیچے دولہا دولہن کا انتظار ہو رہا ہے اس لئے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ اور شاہجہاں میں گھری اٹھ کر تیار ہونے لگی۔

☆☆☆

دو دن بعد وہ مٹی مون کے ارادے سے مری چلے آئے۔ انیس نے اس رشتے کے حوالے سے شا کو اس کی حالت و کیفیت کے سبب اب تک نہیں بتایا تھا اپنا حق استعمال نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے قریب آنے پر معصوم بچے کی طرح خوفزدہ سی ہو کر پیچھے ہٹنے لگتی تھی۔ ماضی کی اُس تاریک شب کے سفاک لمحوں کی ادراشا سی نے چشم حیرت کو سہم ناکی کا مستقل روگ دے دیا تھا۔ آج جب رات کو

نظر کے سامنے انیس کا خوب روچہ تھا۔ دل آپ ہی آپ بے قابو ہونے لگا۔

”آپ.....آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے ساتھ ہوا؟“

”ہاں جانتا ہوں۔“

”سب کچھ؟“

”ہاں سب کچھ۔“

”پھر بھی آپ نے مجھ سے شادی کر لی، کیوں؟“

”کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے تاکہ تمہیں پانے کے لئے دن رات وعائیں مانگی  
تھیں۔ اب تم میرے نام سے پھپھانی جاؤ گی۔ کھول جاؤ اپنے ماضی کو تمہارا حال میں ہوں، تمہارا  
مستقبل مجھ سے وابستہ ہے، اس لئے میرے بارے میں سوچو، مجھے دیکھو، مجھے پرکھو، مجھے چاہو۔“  
وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”کیسے کھول سکتی ہوں میں ماضی کی تلخیاں؟ میرا وجود کسی کے منہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے  
ہے۔“ وہ بھیکتے لہجے میں بولی۔

”میں جانتا ہوں کہ تم اُمید سے ہو۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ اس نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ڈاکٹر حمیرا سے اس روز میں نے معلوم کر لیا تھا۔“

”پھر کیوں کی آپ نے مجھ سے شادی؟“

”کیونکہ میری نظر میں تم باعفت اور باکردار ہو، پاکیزہ اور مقدس ہو۔“

”جھوٹ بول رہے ہیں آپ۔“ وہ اسے جھٹلاتے ہوئے سختی سے بولی۔ ”میری کوکھ میں

کسی کے گناہ کا پھل پروان چڑھتے کیسے دیکھ سکتے ہیں آپ.....؟ میں اس عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں پلیز میری مدد کریں..... میں اس بچے کو جہنم نہیں دینا چاہتا۔“

”ایسا کرنے سے تمہاری زندگی کو خطرہ ہے اور میں ایسا کوئی رسک نہیں لوں گا اور اس منہی بیان کا کیا قصور ہے جو تم اسے مارنے پر آمادہ ہو؟“ انیس نے سنجیدہ مگر دھیسے لہجے میں کہا۔

“سین”



انہیں اس کے قریب آکر لیٹا اور اس نے اُسے ابھی اٹھو اسی تھا کہ وہ خوف سے چیختے لگی۔

”نہیں..... مجھے مت اٹھو نا..... مجھے مت اٹھو نا پلیز.....“

”ٹٹا! ٹٹا! ہوش میں آؤ میں انہیں ہوں۔“ انہیں نے شپٹا کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ ایک ریست ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں کوڑ تھا کہ کہیں ریست ہاؤس کا عملہ ٹٹا کی چیخیں سن کر نہ چلا آئے۔ وہ کچھ نہ کر کے بھی شرمندہ ہو رہا تھا۔

”لائٹ کیوں بند کی ہے..... لائٹ جلا دیں پلیز۔“ وہ روتے، لرزتے لہجے میں بولی تو انہیں نے بیڈ سے اتر کر فوراً لائٹ آن کر دی۔ وہ سبھی سکڑی بیٹھی رو رہی تھی، کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر انہیں کا دل ڈوبنے لگا۔

”یا اللہ! میں کیا کروں کہ ٹٹا کے دل و دماغ سے اس واقعے کا خیال جاتا رہے یہ تو اپنے اندر خوف پال رہی ہے اوگا ڈمیری مدفر ما۔“ انہیں نے بے بسی سے باواؤ بلند اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تو ٹٹا کو جیسے ہوش سا آگیا۔ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے لگی۔

”ٹٹا میں ہوں تمہارا انہیں۔ مجھ سے مت ڈرو جان! اب میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا شہاباش لیٹ جاؤ سو جاؤ۔“

انہیں نے اس کے پاس آکر اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پیار سے کہا اور اُسے پکڑ کر لٹا دیا اور کبل اس کے اوپر پھیلا دیا۔

”لائٹ بند مت..... کیجئے گا۔“ وہ کانپتی آواز میں بولی۔

”اچھا نہیں کروں گا تم سونے کی کوشش کرو۔“ انہیں نے بیڈ کے کنارے پر بیٹھے ہوئے نرمی سے کہا تو اس نے آنکھیں سوند لیں۔ انہیں دیر دیر سے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا کچھ دیر بعد وہ نیند کی وادی میں اتر چکی تھی اور انہیں، اس کی آنکھوں کو رت جگا سوپ دیا تھا اس کے اس رد عمل نے..... وہ بہت دیر تک کمرے میں ٹھہرا رہا پھر وضو کر کے تہجد کی نماز کی نیت کر کے جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔

صبح وہ اٹھی تو انہیں سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ اپنی رات والی حرکت پر وہ بہت پشیمان تھی لیکن ایسا اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ وہ تو خود بخود ہو گیا تھا۔ انہیں اس کی کیفیت محسوس کر رہا تھا، دیکھ رہا تھا اسے وہ ناشتے کے وقت بھی خاموش نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ چپ تو وہ بھی تھا لیکن اس نے خود کو سنبا لیا تھا اور اس خاموشی کو توڑتے ہوئے ٹٹا کے لئے سلاکس پر جیم اور کھن لگا کر اس کے سامنے پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

”لہجے بیگم صلیب! ناشتہ شروع کیجئے۔“

ٹٹا نے اس کی جانب دیکھا وہ بڑے گمن انداز میں کپ میں چائے اٹھیل رہا تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی لیکن زبان اور ہمت ساتھ نہیں دے رہے تھے سو چپ چاپ سلاکس اٹھا کر کھانے لگی۔ آدھا سلاکس کھاتے ہی اسے تھکی ہونے لگی اور وہ تیزی سے اٹھ کر واش روم کی جانب دوڑی۔ کھایا بیا سب قے کے ذریعے باہر آگیا تھا۔ انہیں نے اپنے لئے سلاکس پر کھن لگایا تھا لیکن اب ٹٹا کی حالت دیکھ کر اس کا بھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ چائے کے دو گھونٹ بھر کر اٹھ گیا۔

”آپ مجھے اس مصیبت سے نجات دلانے میں میری مدد کیوں نہیں کرتے؟“ ٹٹا نے کمرے میں آتے ہی غر خال لہجے میں اس سے کہا۔

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں میں تمہاری جان کا رسک نہیں لے سکتا اور ایسا کرنے سے تم آئندہ کے لئے اولاد کی نعمت سے محروم بھی ہو سکتی ہو طرح طرح کی حبیڈ گیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ تو ایک معصوم جان کا قتل ہوگا۔ ٹٹا تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ اللہ بھی ناراض ہوگا ہمارے اس فعل سے اور جب میں اس بچے کو اپنا نام دے رہا ہوں تو تمہیں کیا پریشانی ہے ہاں؟“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہ بچہ آپ کا تو نہیں ہے۔“

”تمہارا تو ہے نا۔“

”میرا بھی نہیں ہے۔“

”پاگل لڑکی! بچہ تمہارے بواکس کا ہو سکتا ہے تم ماں ہو اس بچے کی، بچہ تو تمہارا ہی ہوا نا۔“ وہ اُسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”مگر میں اسے نہیں پالوں گی۔“ وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔

”تو کون پالے گا؟“

”دے دیجئے گا کسی یتیم خانے کو یا کسی بے اولاد جوڑے کو۔“

”کیوں دیں ہم اپنا بچہ کسی کو؟“ انہیں نے اس کے سامنے آکر سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کیونکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہاں ہم تو جیسے پہلے ہی درجن بھر بچوں کے ماما ہیں تاکہ ہم اپنا بچہ کسی غیر کی جھولی میں ڈال دیں۔ یہ بچہ تمہاری کود میں ہی پروان چڑھے گا..... اور اگر تم اسے ختم کرنا چاہتی ہو تو ایسا

کرنے سے پہلے تم مجھے ختم کر دینا۔“ وہ سپاٹ اور اٹل لہجے میں بولا۔

”ایسا مت کیجیے پلیز! میرا اب کون ہے آپ کے بوا؟ آپ کے بغیر تو میں پھر سے ذلت و رسوائی کے گڑھے میں گر جاؤں گی، بے سائبان ہو جاؤں گی۔“ وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر تڑپ کر روتے ہوئے بولی۔

”اچھا روؤ مت پلیز! تمہارے یہ آنسو مجھے رات بھر بے چین کئے رکھتے ہیں۔ میں تمہارا ہوں تمہارے ساتھ ہوں پھر کیوں ڈرتی ہو تم بھول جاؤ گزرے لمحوں کو، مت دہراؤ ماضی کو تمہارا آج اور کل اب میں ہوں مجھ پر بھروسہ کر دینا۔“ وہ اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھ کر نرمی سے بولا۔

”آپ پر تو بھروسہ ہے لیکن تقدیر سے ڈر لگتا ہے اگر وہ شخص کبھی اچانک میرے سامنے آ گیا تو.....“

”تو کیا تم اسے پہچان لو گی۔“

”نہیں، اس نے اپنا چہرہ سیاہ ماسک میں چھپا رکھا تھا لیکن اگر کبھی وہ دوبارہ میرے سامنے آیا تو میں اسے گولی مار دوں گی، ختم کروں گی اسے۔“ وہ غصے سے نفرت اور آنسوؤں میں بھیکتے لہجے میں بولی۔

”فی الحال تو تم آرام کرو اور ایک بات اور آئندہ ہمارے سچ اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں رونے ڈلانے نہیں آئے..... تم بھی عجیب لڑکی ہوا تنے رومیٹک ماحول میں اتنی آن رومیٹک گفتگو کر رہی ہو۔ میں تمہارا دھیان بٹانے، دل بہلانے کے لئے یہاں لایا ہوں اور تم ہو کہ خیر چھوڑو تم ناشتہ کرو اپنی صحت کا خاص خیال رکھنا ہے اب تمہیں۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔ وہ اس کا اتنا خیال رکھ رہا تھا اور وہ تھی کہ اسے مسلسل ہرٹ اور نظر انداز کئے جا رہی تھی۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اسے جیکٹ پہن کر دروازے کی جانب بڑھتے دیکھ کر اس نے فوراً پوچھا۔

”باہر مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کے رویے کی وجہ سے ہرٹ ہوا ہے اور خفا بھی ہے اس لئے اکیلا چلا گیا ہے۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

”میں کیا کروں اتنے پیارے شخص کو خفا کر کے میں کب خوش ہوں؟“ وہ بیڈ پر بیٹھتے

ہوئے بے بسی سے بولی۔

”ثنا تم خوش نصیب ہو کہ انیس جیسے اعلیٰ ظرف اور کشادہ دل انسان کی شریک حیات بنی ہو۔ اس نے تمہیں، تمہاری ذات سے وابستہ ہر ذلت، بدنامی اور رسوائی سمیت دل و جان سے قبول کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ تمہارے وجود میں پھوٹنے والی کوئیل کو بھی اپنا نام دے رہا ہے تمہاری پیشانی پر لگا داغ اپنی محبت کے پانی سے دھو رہا ہے اور تم اس شخص کو اپنی محبت سے، اس کے جائز اور شرعی حق سے محروم رکھے ہوئے ہو..... اس نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، پھر تم کیوں اس کے ساتھ یہ زیادتی کر رہی ہو؟ بھول جانے میں ہی عافیت ہے، اللہ کا شکر ادا کرو اور انیس کو اپنی محبت کا یقین دلا کر اسے منالو۔ وہ بہت محبت کرتے ہیں تم سے..... ایک خرم تھا جس کی بھیتیں محض دعویٰ تھیں، باتیں تھیں اور ایک انیس احمد ہیں جن کی محبت عمل سے شروع ہو کر عمل پر محیط ہو جاتی ہے۔ اپنے آج اور آنے والے کل میں جینا سیکھو ثنا..... یہ مت دیکھو اور سوچو کہ گزرے ہوئے کل نے تمہیں کیا دیا ہے.....؟ یہ دیکھو اور سوچو کہ آج اور آنے والا کل تمہیں کیا دے رہا ہے..... اپنے دامن میں پڑے ماضی کے دکھوں کے پتھر پھینک دو ورنہ یہ پتھر تمہیں تمام عمر لوہا بن کر رہیں گے۔ لہذا اپنے دامن میں کھلنے والے بھولوں پر نظر رکھو جو انیس احمد کی محبت سے جھک رہے ہیں۔“

ثنا کے دل و دماغ نے اسے سمجھایا تو ان کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ اب وہ اس کے آنے کی منتظر تھی لیکن پانچ گھنٹے گزر جانے کے باوجود جب وہ نہیں آیا تو ثنا کی جان پر بن آئی۔ وہ انجان جگہ پر اکیلی تھی۔ ہمت کر کے وہ کمرے سے ہی نہیں ریسٹ ہاؤس سے بھی باہر نکل آئی اور انیس کی تلاش میں چاروں طرف نگاہ دوڑا کر دیکھا تو اسے دائیں جانب ایک ہوٹل کے باہر رکھے سنگی بیچ پر بیٹھا دکھائی دیا۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے۔“ ثنا کی جان میں جان آئی وہ کلمہ شکر ادا کرتی ہوئی تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی اور اس کے قریب پہنچتے ہی شکوہ کٹاں ہوئی۔

”آپ..... یہاں بیٹھے ہیں اور میں وہاں اکیلی پریشان ہو رہی ہوں کب سے، ایک اجنبی جگہ پر آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے آئے۔“

”آئی ایم سوری تم چلو میں آتا ہوں۔“ انیس نے چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا جہاں سچ سچ پریشانی اور خوف تھا۔ وہ شرمندہ ہو کر بولا۔

”نہیں آپ بھی میرے ساتھ چلیں مجھے وہاں ڈر لگ رہا تھا۔“

”اچھا چلو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خاموشی سے اس کے ساتھ چلا ہوا،

”ریسٹ ہاؤس“ آگیا۔

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ ثناء نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”جان! بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ صبح سے ہم دونوں نے کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔ میں ابھی کھانا منگواتا ہوں پھر مل کر ہی کھائیں گے۔“ انیس نے مسکرا کر اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا آیا تو دونوں نے بہت خاموشی سے کھایا۔ پھر وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی اور اس کے بعد انیس ٹی وی آن کر بیٹھ گیا اور ثنا بھی خاموشی سے ٹی وی دیکھنے لگی مگر جلد ہی وہ آکٹا سی گئی اور اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ انیس نے کن اکھیوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ کافی دیر کے بعد بھی جب وہ واپس نہ آئی تو انیس کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ اٹھ کر باہر آگیا وہ بالکونی میں کھڑی دُور آفتی پر نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی رقم تھی۔ انیس لب کاٹنے لگا اور سرد ہوا کے جھوکے نے اسے کاپنے پر مجبور کیا تو وہ بڑھ کر ثنا کے قریب آیا اور اس کے شانوں پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیئے۔ ثناء نے شٹا کر گردن تھمائی۔

”اندر چلو ٹھنڈ لگ جائے گی میری غلطی کی سزا خود کو کیوں دے رہی ہو؟“ وہ نرمی سے بولا۔

”آپ کی غلطی.....“ وہ بھی نہیں اس کا اشارہ کس جانب تھا۔

”ہاں بھئی میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کئی گھنٹے باہر جو رہا ہوں آؤ شاباش رات ہو رہی ہے۔“

وہ محبت سے بولتا اسے اپنے ساتھ لگائے کمرے میں لے آیا۔ رات کو جب سونے کا وقت ہوا تو انیس بیڈ پر لیٹنے کی بجائے نکیہ اٹھا کر صوفے پر آگیا۔ ثناء نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

”آپ صوفے پر سوئیں گے کیا؟“

”ہاں!“

”کیوں.....؟“

”میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم تکلیف محسوس کرو اور سکون سے سو ہی نہ سکو۔“ انیس نے

سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ شرمندگی سے زمین میں گڑھ گئی اور پھر چند لمحوں بعد خود کو سنبھال کر بولی۔

”آپ پلیز بیڈ پر آ کر سوئیں، میری نیند تو ویسے بھی خراب ہو چکی ہے۔“

”جیسی تو میں بیڈ پر نہیں سونا چاہ رہا۔“ انیس نے اس کی بات سن کر کہا۔

”میں آپ کو صوفے پر بھی سونے نہیں دوں گی۔“

”اچھا بابا نہیں سوتا صوفے پر لو آگیا بیڈ پر اب خوش۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا اور بیڈ پر

آ کر نیم دراز ہو گیا۔

”آپ خفا ہیں مجھ سے؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ انیس نے کوئی جواب نہیں دیا ثناء نے بے قرار ہو کر اسے دیکھا اور دلگیر لہجے میں کہا۔

”آئی ایم سوری۔“

”سوری مگر کس لئے.....؟“

”کل رات میں نے آپ کو ہرٹ کیا تھا نا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟“ وہ نظریں جھکائے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کرتے ہوئے بھیکے لہجے میں بولی تو انیس کو اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔

”مجھے تم پر گزری قیامت کا اندازہ ہے۔ ثنا میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں لیکن میری جان، زندگی کسی ایک سانحے، واقعے یا حادثے پر ختم نہیں ہو جاتی۔ جب تک سانس باقی ہیں اسے تو جاری رہتا ہے تو اچھا نہیں ہے کہ ہم اس زندگی کو کبھی خوشی پیار محبت سے گزارنے کی کوشش کریں..... اور شاید میری جان میں تمہارا شوہر ہوں۔ تم بیوی ہو میری اور میاں بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ ان کی ہر خوشی اور راحت ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہے لیکن اگر تمہیں میرا قرب تکلیف دیتا ہے تو میں آئندہ تمہیں نہیں بھجوں گا۔ بس تم رویا نہ کرو تمہاری آنکھوں کے آنسو میری آنکھوں کے رت جگے بن جاتے ہیں۔“ وہ اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

”پلیز! مجھے معاف کر دیجئے میں جانتی ہوں آپ صحیح کہہ رہے ہیں..... میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ آپ نے مجھے محبت دی ہے بھلا مجھے آپ سے کیوں تکلیف ہوگی؟“ وہ اس کے چہرے کو پرہیزگار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کئی بات ہے؟“ انیس نے مسکراتے ہوئے اس کی شرعی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر یہاں آؤ۔“ انیس نے مسکراتے ہوئے اپنی ہاتھیں پھیلا کر کہا تو وہ لمبے بھر کو جھجکی مگر اب وہ اسے مزید امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی سو فوراً اس کی مہربان ہاتھوں میں آسمانی اور اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر سکون ہو گئی۔ انیس نے اسے متاع حیات کی طرح سمیٹ لیا تھا۔

چاند شب شانوں سے سرکتی جا رہی تھی۔ چاند اس کے آنچل میں ستارے ٹانگ رہا تھا۔ کتنی خوبصورت، انوکھی اور حسین رات تھی یہ انیس کی محبت بھری باتیں، اس کے پیار کا لمس، اس کی چاہت کا جادو ثنا کے پورے وجود کو سرشار، سیراب، شاداب کرتا جا رہا تھا۔



وہ رات بھرا سے اپنی محبتوں کا خراج پیش کرنے کے بعد صبح غنڈ کی وادی میں اتر گیا، وہ بہت سرور سی اس کے چہرے کو محبت سے دیکھ رہی تھی جو کسی معصوم بچے کی مانند لگ رہا تھا۔ ثنا کے دل میں اس کے لئے محبتوں کے نوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ اسے نگے جارہی تھی۔ محبت اور چاہت سے، جس کی محبتوں نے اس کی زندگی کی غزدہ، تاریک شب میں مسرتوں کا مانتاب روشن کر دیا تھا۔

اور پھر انیس احمد کی سنگت میں گزرتا ہر دن، ہر شب ہر پہل ثنا کے تن و من میں گلاب نکلاتا جا رہا تھا وہ بہت خوش تھی انیس احمد کے لئے اس کا دل محبت سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انیس کی بے حد ممنون تھی کہ جس نے اس کی مانگ میں اڑتی راکھ کو اپنے پیار کی افشائ میں بدل ڈالا تھا۔ اس کے تار تار آچھلے کوسٹاروں سے ٹانگ کر بھر دیا تھا۔ وہ دونوں پندرہ دن تک مثالی علاقہ جات میں سیر کرنے کے بعد گھر واپس لوٹے تو ان دونوں کے چہروں پر بہت تازگی اور شادابی تھی۔ جسے دیکھ کر سب نیا گھر والے بہت خوش تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوشگوار لمحات گزار رہے ہیں۔

عنا "نہیں ولا۔" ثنا سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ ثنا نے اُسے پورا گھر دکھایا پھر چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات سے اس کی تواضع کی۔ باقی گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اس لئے ثنا کو کیلئے ہی اسے کہنی دینا تھی۔ عنا دیکھ رہی تھی کہ شادی کے ایک مہینے کے اندر اندر ہی ٹاکھل کر پھر سے، گلاب بن گئی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی اور بڑھ گئی تھی۔ سیاہ ویلٹ کے نقس سوٹ میں "برے کا نازک سٹائٹ پہنے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ عنا کو اس سے حد محسوس ہو رہا تھا۔ بہن، "خوشی اسے ایک آنکھ نہیں بھار رہی تھی۔

"خاتم خوش تو ہونا یہاں؟" عنا نے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے میں بہت خوش ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"حالانکہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد تو تمہیں شرم سے ڈوب مرنے چاہئے تھا۔ خود کشی کرنے کی بجائے تم خوشی خوشی زندگی بسر کر رہی ہو۔ بہت ہی ڈھیت ہو بھی تم تو۔" عنا نے ہر افشائی کی تو اس کا دل چھلکی ہو گیا۔

"جب میرا کوئی دیش ہی نہیں تھا تو میں کیوں حرام موت مرقی؟ تم لوگوں کو تو خوش ہونا ہے کہ مصیبت سے قاری جان چھوٹ گئی ہے ہمیشہ کے لئے۔ انیس بہت اچھے انسان ہیں تو پھر خدا خوش کیوں نہ رہوں۔ اللہ کا شکر ادا کیوں نہ کروں؟" ثنا نے اپنی ہمت مضبوط کر کے سنجیدہ لہجہ لہا۔

"تمہیں انیس بھائی بزنس ڈنر وغیرہ میں تو لے جاتے ہوں مگر۔ سنا ہے کہ امیر آدمی

خوبصورت بیوی کے عیب صرف اس لئے بھلا دیتا ہے کہ اسے بیوی کی خوبصورتی اور حسن کو اپنے بزنس کی ترقی کا زینہ بنانا ہوتا ہے تمہارے شوہر تمہیں طعنہ تو ضرور دیتے ہوں گے انخوا شدہ اور زسوا لڑکی ہونے کا ہے نا۔" عنا نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ فوراً بولی۔

"نہیں..... انہوں نے مجھ سے اس واقعے کے متعلق کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ وہ بہت نفیس اور عظیم انسان ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اپنے بزنس کے متعلق بھی کوئی بات نہیں کی۔ تو تو مجھے سب کچھ بھول جانے کے لئے کہتے ہیں۔ اُن کے متعلق تم ایسی فضول باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے اس ایک واقعے نے کس طرح تمہاری ذہنی پستی کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ افسوس حد افسوس۔"

"تمہیں اتنا اچھا رشتہ نہ ملتا تب پہ چلا کہ زندگی کیسے گزرتی ہے۔"

"مس عنا! آپ کے بھائی آپ کو لینے آئے ہیں۔ جائیے۔" اسی وقت انیس ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدہ لہجے میں کہا وہ ان دونوں کی ساری گفتگو سن چکا تھا۔

"اوہ انیس بھائی آپ کیسے ہیں؟" عنا نے شپٹا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کم از کم میں ویسا نہیں ہوں جیسا آپ مجھے سمجھتی ہیں۔ میں بیوی کو اپنے دل اور گھر میں رکھنے کا قائل ہوں عنا بی بی۔ اُسے بزنس کی ترقی کا زینہ بنانے والوں میں سے نہیں ہوں اور الحمد للہ ہمارا بزنس پہلے ہی بہت ترقی کر چکا ہے ہمیں ایسی گھٹیا حرکتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں ایک بات اور۔" انیس نے اس کے شرم سے زرد ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا۔

"آئندہ اپنے دل و دماغ سے متنی سوچوں کو نکال کر اپنی بہن کے گھر تشریف لائیے گا۔ اس سے حد کرنے کی بجائے اپنی سطحی سوچ کو صحیح کرنے کی پاکیزہ اور مثبت بنانے کی کوشش کیجئے گا۔ ثنا ایک با حیا اور پاکردار لڑکی ہے اس کے کردار پر کچھ اچھا لے سے بہتر ہے کہ آپ اپنے کردار و گفتار پر غور کریں۔ مکی بہن ہو کر آپ کے یہ خیالات ہیں اپنی بہن کے لئے بہت افسوس کی بات ہے۔"

"آئی ایم سوری اللہ حافظ۔" عنا نے شرمندگی سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"لندن..... ہم لندن چلے جائیں گے پاپا مجھے وہاں بزنس کی دیکھ بھال کے لئے بھیجنا چاہ رہے تھے تب مجلس بھائی نے وہاں کا آفس سنبھال رکھا تھا۔ وہ اب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آگئے ہیں تو میں تمہیں لے کر وہاں شفٹ ہو جاؤں گا اور اس طرح تم بھی ان کم ظرف لوگوں کی باتوں کے نشتر سے محفوظ رہو گی۔" انیس نے سنجیدگی سے بتایا تو وہ اسے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ کیوں میرے لئے یہ سب کرنا چاہ رہے ہیں آپ اتنے اچھے کیوں ہیں؟"

”میں کہاں اچھا ہوں ڈارلنگ! میں تو بہت گناہ گار اور خطا کار انسان ہوں۔ بس تمہاری معصومیت اور محبت نے بہت پہلے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔“ وہ ذرا سا مسکرا کر بولا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ خود کو گناہ گار کیوں کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ آپ نے کبھی کوئی چوٹی بھی ماری ہوگی۔“

”ہاں چوٹی تو نہیں ایک تھلی میرے ہاتھوں میں دم توڑ گئی تھی۔“ انیس نے گہری سانس لے کر کہا تو وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

ان دونوں کے لندن جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے تھے اور انیس نے جانے سے پہلے بیگم آسیہ نفیس احمد یعنی اپنی ماما کو اپنے باپ بننے کی خبر سنا کر نہال کر دیا تھا اور انہوں نے اسے بہت ساری ہدایات دی تھیں۔

”انیس بیٹا! ثنا کا ہر طرح کا خیال رکھنا۔ اسے پریشان اور تھامت کرنا۔“

”اوکے ماما اور ثنا سے بھی کہئے کہ یہ میرا بہت سارا خیال رکھے وہاں۔“ وہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ثنا شرمیلے پن سے مسکرا رہی تھی۔

”تم دونوں ہی ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ ثنا بیٹا ڈرنا مت انیس تم سے بہت پیار کرتا ہے جانتی ہو تمہارے والدین کے رشتے سے انکار کے صدمے نے انیس کو پیار کر دیا تھا اور پھر جس روز اس نے تمہیں ہسپتال میں سے جاتے دیکھا تھا گھر آتے ہی میری منت سماجت کرنے لگا کہ ماما ثنا کو میرے لئے مانگ لیں ورنہ اس کے گھر والے اسے مار دیں گے اور میں مر جاؤں گا۔ یہ تو دیوانہ ہے تمہارا۔“ بیگم آسیہ نفیس احمد اس پر انکشافات کر کے اسے حیران اور شاداں کر رہی تھیں۔ وہ بہت چاہت سے انیس کو دیکھ رہی تھی۔

”ماما! آپ میرے سارے سیکرٹ آؤٹ کر رہی ہیں۔ دیکھ لیجئے گا یہ وہاں جا کر خڑے دکھائے گی سر چڑھ جائے گی۔“ انیس نے معنوی خشکی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس ہنسی سے انیس کی روح میں جیسے قوس قزح آگئی ہو۔ اس نے بہت چاہت سے ثنا کو دیکھا تھا۔

سب سے مل کر وہ دونوں لندن کے لئے پرواز کر گئے۔ ثنا کے میکے والوں نے اس کے لندن جانے پر کلمہ شکر ادا کیا تھا کہ اب لوگوں کی باتیں خود بخود دم توڑ دیں گی۔

رات کا تیسرا پہر تھا۔ ثنا کی اچانک آنکھ کھلی تھی اور اس نے انیس کو آج پھر اپنی جگہ سے غائب پایا تھا۔ ایسا اکثر ہوا تھا کہ انیس بستر سے غائب ہوتا تھا وہ اس کو ڈھونڈنے نکلتی تو وہ دوسرے کمرے میں جائے نماز پر رکوع و سجود میں تسبیح و مناجات میں مشغول دکھائی دیتا۔ وہ پانچ وقت باقاعدگی سے نماز ادا کرتا تھا اور تہجد بھی پڑھتا۔ اس کی آنکھیں رات کے اس پہر بھیگتی، چمکتی رہتی تھیں۔ وہ اتنا کیوں روتا ہے یہ بات ثنا کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر آکر لیٹ جاتی تھی لیکن آج اس نے اس سے پوچھنے کا تہیہ کر لیا تھا سو اس کے نماز و دعا سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ جائے نماز رکھ کر واپس پلٹا تو اسے دروازے میں کھڑا دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور اس کے پاس آتے ہوئے استفسار کرنے لگا۔

”تم..... کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری کیوں چلی آئیں؟“

”ایک بات پوچھوں.....؟“ ثنا نے اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”پوچھو.....“

”آپ اس وقت عبادت کیوں کرتے ہیں؟“

”اس وقت عبادت کا ثواب سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان پر آکر اپنے بندوں کی دعائیں، التجائیں اور فریادیں سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اس کا دامن بھردوں۔ کوئی ہے جو بخشش کا طلب گار ہو میں اسے بخش دوں معاف کر دوں۔“ انیس نے بھاری لہجے میں نرمی سے جواب دیا۔

”وہ تو میں جانتی ہوں لیکن آپ اتنا روتے کیوں ہیں؟“

”اس کو آنسو بہت پسند ہیں نا اس لئے، اور اس کی نعمتوں کے شکر کے لئے اپنی خطاؤں کی بخشش کے لئے اور اس نے مجھے تم سے ملا دیا اس کا شکر تو میں تمام عمر بھر دے کر کے ادا کرتا رہوں تب بھی نہ ادا کر پاؤں گا تمہاری محبت کا شکر یہ بھی تو ادا کرنا تھا آج کے آنسو اس لئے بہے تھے کہ انیس احمد تمہاری محبت پا کر مالا مال ہو گیا ہے۔ شکر کرنے سے نعمت بڑھتی ہے اور میں تمہاری محبت کی نعمت بڑھتے ہوئے دیکھتے رہتا چاہتا ہوں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا پیارا چاہتا ہوں اس لئے شکر ادا کرتا رہتا ہوں معافی مانگتا رہتا ہوں۔“ انیس نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ اس کے جذبوں کی شدتوں پر ششدرہ گئی۔ اس کی دیوانگی پر سہم سی گئی۔

”انیس!“ وہ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔

”نہیں، رونا نہیں، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا نا ادھر دیکھو۔“ وہ پیار سے بولا۔



”آپ بھی تو رو رہے ہیں۔“ اس نے سراسخا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو چپ کراؤ تا یا رتم میرے آنسو پونچھ لو اور میں تمہارے آنسو پونچھ لیتا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا اور آواز میں بولا تو وہ روتے روتے ہنس پڑی اور دونوں نے ایک دوسرے کے آنسو اپنے ہاتھوں میں جذب کر لئے۔

انہیں کی پُر خلوص اور پُر جوش محبتوں میں وقت اتنی تیزی سے گزرا تھا کہ اُسے پتہ ہی نہیں چلا تھا اور اس کی ڈیوری کا دن بھی آگیا۔ انہیں پریشان سالنڈن کے ایک معروف ہسپتال میں آپریشن تھیر کے باہر کھڑا تھا۔ ثنا کی طبیعت کافی خراب تھی وہ اس وقت اس صدمے سے روری تھی۔ وہ بار بار انہیں سے کہہ رہی تھی کہ میں اس بچے کو نہیں پالوں گی۔ اس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گی اور انہیں نے بمشکل اُسے چپ کرایا تھا۔ وہ اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کی بگڑتی حالت دیکھ کر اسے بچے سے زیادہ ثنا کی سلامتی کی فکر تھی۔ اب ایک گھنٹے بعد انگریز نرس نے اسے باپ بننے کی نوید سنائی۔ ثنا نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا تھا۔ ڈیوری نارمل ہوئی تھی۔ یہ سنتے ہی انہیں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ بچے کو نرسری میں شفٹ کر دیا گیا تھا آدھے گھنٹے کے لئے، اور ثنا کو ریکوری روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ انہیں بچے کو دیکھنے گیا تو حیران رہ گیا۔ وہ بچہ ہو، ہو اُن دونوں کا عکس تھا۔ گول منول سرخ و سفید رنگ، سیاہ بال نین نقش بھی ثنا اور انہیں کے چہرے تھے اُس نے۔ وہ بچے کو دیکھ کر دیر تک مسکراتا رہا پھر اُسے پیار کر کے نرسری سے باہر آیا تو نرس نے آکر اسے اطلاع دی۔

”آپ کی سز مسلسل رو رہی ہیں۔ انہیں جا کر سنبھالیں ورنہ ان کی حالت بگڑ جائے گی۔“ ”اوہ نو۔۔۔“ انہیں پریشان ہو کر ثنا کے کمرے میں آیا وہ بیڈ کی پشت سے تکیہ لگائے نیم دراز تھی اور رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھی۔ انہیں نے دیکھا تو تڑپ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”ثنا! یہ کیا کر رہی ہو تم کیوں اپنی جان ہلکان کر رہی ہو اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں خیریت سے اس مرحلے سے گزاردیا اور تمہاری آغوش میں ممتا کا مھول کھلا دیا ہے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے سے بولا۔

”وہ۔۔۔ مھول نہیں ہے۔۔۔ بھول ہے۔۔۔ جو ساری زندگی میرے دل میں چمکتا رہے گا۔“

”نہیں ثنا! تم کیوں اس معصوم سے متنفر ہو رہی ہو۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”اس لئے کہ وہ ایک شیطان کی اولاد ہے جس نے میری عزت کا آئینہ تار تار کیا تھا۔“

میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے بچے کو نہیں پالوں گی۔ اس کی۔۔۔۔۔ شکل بھی نہیں دیکھوں گی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ روتے روتے ہنکیاں لینے لگی۔ انہیں کی بے چینی و بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اسے اپنی ہانہوں میں لے کر نرمی اور محبت سے گویا ہوا۔

”ثنا میری جان! سنبھالو خود کو پرسکون ہو کر سوچو ثنا، تمہارے لہو نے اس کے وجود کو سنبھال دیا ہے وہ تمہارے وجود کا حصہ ہے ثنا تمہارا رنگ روپ لے کر پیدا ہوا ہے کیا تم اسے اپنی آغوش سے جدا کر کے جین سے جی سکو گی؟ جسے اس دنیا میں لانے کے لئے تم نے اتنی تکلیف جمیلی ہے کیا اسے اپنی ممتا سے محروم کر کے خوش رہ سکو گی؟ ثنا تم نے اسے جنم دیا ہے تم ماں ہو اس معصوم کی کسی غیر کے حوالے کر دو گی اپنے بچے کو۔“

”!۔۔۔۔۔ انہیں۔۔۔۔۔ انہیں۔“ ثنا کا روتے روتے سانس اُکھرنے لگا تھا۔ انہیں کی باتیں اس کی سمجھ میں تو آ رہی تھیں لیکن اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔

”ثنا! کیا ہوا ثنا؟ ڈاکٹر نرس۔“ انہیں نے پریشان ہو کر پکارا اور بیڈ کی سائیڈ پر لگی ہوئی بزر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ثنا تمہیں میرے لئے جینا ہے اپنے بچے کے لئے جینا ہے تمہیں میری قسم مجھے چھوڑ کے مت جانا ورنہ میں بھی یہ دنیا چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور تمہارا بیٹا اکیلا رہ جائے گا۔ ثنا میری خاطر خود کو سنبھالو پلیز یا اللہ رحم کر میں بہت گناہ گار ہوں مانتا ہوں کہ میں بہت خطا کار ہوں لیکن یہ سزا مجھے مت دینا۔۔۔۔۔ میری ثنا کو مجھ سے خدامت کرنا۔“

انہیں اس کا سراپے بازو پر رکھے کبھی اسے مخاطب کر رہا تھا اور کبھی رتب سے فریاد کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر اور نرس کمرے میں داخل ہوئے۔ ثنا منہ کھول کر سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے انہیں کا گریبان اپنی ٹٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے ثنا کو فوراً آکسیجن لگا دی اور نرس سے اسے آئی سی یو میں شفٹ کرنے کا کہا۔ انہیں اپنا دل تھام کر رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی محبت ریت کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی ہے۔ وہ اسی کمرے میں بستر کے کنارے کا سہارا لیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

”پریشان مت ہوں۔ خدا بہتر کرے گا۔“ نرس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تو وہ اپنی آنکھوں سے اپنے چہرے کو صاف کرتا ہوا باہر آگیا۔ ایک گھنٹے بعد ثنا کی حالت سنبھل گئی۔ اس کے منہ سے آکسیجن ماسک ہٹا دیا گیا تھا۔ ثنا نے آنکھیں کھولیں تو انہیں کا انگبار چہرہ اس کی نگاہوں کے عین سامنے تھا۔ وہ دیوار سے لگا کھڑا اُسی کو نک رہا تھا۔ اس کے ہوش میں

آنے پر اس کی روح کو بھی قرار آ گیا۔

”یہ پیارا انسان میرے سارے ذمہ اپنی محبت سے بھرتا رہا ہے اب تک میرے نام سے منسوب ساری ذلت و رسوائی اس نے اپنے نام کر لی مجھے اپنا نام دیا، مقام اور احترام دیا۔ بچے کو اپنے نام کی پہچان دے رہا ہے اور میں..... نئی کتنی ہنسنے لگی خود غرض و بے حس ہوں انیس کو شروع دن سے ہرٹ کرتی آرہی ہوں۔ میرے اللہ مجھے معاف کر دے میں اپنے بچے کو اپنے سینے سے ضرور لگاؤں گی۔“ ثناء نے دل میں کہا۔ انیس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کی اس حالت نے اس کی جان پر بنا دی تھی۔

”سوری انیس.....“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ثناء! آئی لو پوٹا۔“ اس نے روتے روتے اپنی پیشانی اس کے شانے پر رکھ دی۔ ثناء نے آہستگی سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھتے ہوئے بھیکتے لہجے میں کہا۔

”آئی لو پوٹا! آئی ایم سوری۔“

نرس نے ثناء کو بتایا کہ وہ اس کے آئی سی یو میں جانے کے بعد بچوں کی طرح مٹھوٹ مٹھوٹ کر رویا تھا۔ ثناء تو اس کی مٹھوٹوں کی مقروض ہو گئی تھی۔ اتنی محبت، اتنی چاہت، اتنا پیارا انیس نے اس کے جیون میں بھر دیا تھا کہ اس کا دامن تنگ پڑ گیا۔ وہ اس سے بہت شرمندہ تھی۔

”انیس ہمارا بیٹا کہاں ہے؟“ اس نے مدھم مدھم اور پر غم آواز میں پوچھا تو انیس نے فوراً سر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔

”ثناء! تم..... تم دیکھو گی اُسے، پیار کرو گی نا اُسے۔“ انیس خوشی سے بھیگی ہوئی آواز میں پوچھ رہا تھا تو اس نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تھینک یو ثناء! میں ابھی اُسے لے کر آتا ہوں۔“ وہ خوشی سے اس کا ہاتھ پٹوم کر بولا اور بچے کو لینے چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ سفید کمر میں لپٹے سرخ و سفید نو مولود کو لئے اس کے پاس آ بیٹھا۔ ثناء نے بچے کو دیکھنے کے لئے اٹھنا چاہا تو انیس نے اسے بازو سے سہارا دے کر احتیاط سے بٹھا دیا۔ ثناء نے اپنی سانسیں نارل ہونے پر بچے کو اپنی گود میں لینے کے لئے اپنی بانہیں انیس کے سامنے پھیلا دیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے بچے کو اس کی بانہوں کے پالنے میں لٹا دیا۔ بچے نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں تو ثناء کے لب مسکرا دیئے۔ اس نے تھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو وہ رونے لگا۔ اُسے ٹھوک ستا رہی تھی۔ ثناء نے اپنے سینے سے لگا کر ڈھیروں پیار کیا۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ انیس بہت محبت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ثناء اس وقت اسے

صرف ایک ماں دکھائی دے رہی تھی۔ ممتا کی محبت سے بھرپور ماں۔

”انیس! یہ تو ہم دونوں کی شہید ہے۔“ اس نے انیس کو دیکھ کر کہا۔

”ہاں کیونکہ تم اس کی ماں ہو اور بچے کی ماں جو چہرہ سب سے زیادہ اپنی لگا ہوں کے سامنے دیکھتی ہے یاد رکھنا چاہتی ہے سنا ہے کہ اس کے بچے میں اسی چہرے کا عکس شامل ہو جاتا ہے اس لئے یہ میرا ہم شکل بھی ہے کیونکہ تم نے پورے 9 ماہ یہی چاند چہرہ دیکھا ہے نا۔“ انیس نے مسکراتے ہوئے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ہاں!“ وہ فیس پڑی تو جیسے انیس کے اندر اطمینان کے جزیرے بھر سے آباد ہونے لگے۔ بچہ رو رہا تھا۔ انیس نے اٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

”اُسے ٹھوک لگ رہی ہے تم اسے فیڈ کراؤ میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“ انیس کے جانے کے بعد اس نے بچے کو دودھ پلایا اور ڈھیر سا پیار کیا۔

تیسرے دن وہ احد کو لے کر گھر آ گئی تھی۔ بچے کا نام انیس کے علاوہ نفیس احمد نے بھی احد تجویز کیا تھا۔ ثناء کے میکے اور سسرال میں ثناء کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر بہت خوشی سے سنی گئی تھی۔ انیس نے بچے کی تصاویر کھینچ کر بھجوائی تھیں پاکستان۔ بیگم آسیہ نفیس احمد تو پوتے کو دیکھنے اور بہو سے ملنے لندن چلی آئی تھیں اور پورے چار ماہ رہ کر واپس پاکستان آ گئی تھیں۔

”ہم لندن چلے جائیں گے۔ وہاں صرف ہم ہوں گے میں محبت اور تم اور کوئی نہیں ہو گا۔“ انیس کی بہت پہلے کہی گئی بات اسے یاد آرہی تھی۔ اس نے اپنا کہا ج کر دکھایا تھا۔ ان دونوں کے بیچ محبت ہی محبت تھی بس۔ انیس کی محبت میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ثناء کو بھی اس سے بل بھر کی جذباتی محال لگنے لگتی تھی۔ وہ آفس میں ہوتا تو دن میں کئی بار گھر فون کر کے اس سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کی محبت میں گم ہو کر اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔ اس کا گھر جنت کا نمونہ تھا۔

”میں محبت اور تم

اک لڑی میں ایسے گم۔

جیسے سیپ میں موتی کی چھب جیسے پھول میں خوشبو کا ڈھب۔

دونوں کو اک دوجے سے کون جدا کر سکتا ہے اب۔“

☆☆☆

اپریل، لندن: آئے تقریباً تین سال ہونے والے تھے۔ وہ اس دوران پاکستان نہیں گئے

تھے البتہ ندا کی شادی چند ماہ پہلے ہو گئی تھی۔ بیگم آسیہ نفیس اور نفیس احمد دو تین بار ان سے اور اپنے پوتے سے ملنے آچکے تھے۔ اب تو ثنا کا دل بھی پاکستان واپس جانے کو بے چین رہنے لگا تھا۔ انیس بھی وطن واپس جانا چاہتا تھا لیکن ثنا کی وجہ سے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ لندن میں اس نے بہت عمدگی سے بزنس سنبھالا تھا اور ہر کام کے لئے درکار بھی ٹرینڈ کر دیئے تھے۔ زیر ہمدانی کو وہ اپنی جگہ آفس میں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

بارش فریج کل پر سلسل ناچ رہی تھی۔ ہوا کی لے بے حد شوخ تھی بیڑ خوشی سے ٹھوم رہے تھے۔ ساری فضا چٹوں کی ہنسی سے گونج رہی تھی اور وہ اداسی کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ آج ان دونوں کی شادی کو پورے تین برس ہو گئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ثنا کو شادی کی سالگرہ کا تحفہ دیا تھا۔ اسے ڈھیر سارا پیار کیا سالگرہ کا ٹیکہ اس کے ساتھ مل کر کاٹا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا تھا اور پھر اس سے کافی کی فرمائش کی تھی۔ ثنا کافی بنا کر لے آئی تھی مگر انیس کی اداسی نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس نے کافی کے دونوں گ میز پر رکھ دیئے۔

”انیس!“ جیسے ثنائے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

”ہوں.....“ اس نے چونک کر دیکھا۔

”کیا کوئی پریشانی ہے آپ کو؟“

”کوئی نہیں۔“ وہ مسکرا دیا۔

”کوئی پریشانی، کوئی دکھ، کوئی غم، کوئی پچھتاوا کچھ تو ہے انیس جو آپ کو ہر خوشی کے موقع پر ایک دم سے اداس اور بے چین کر دیتا ہے۔ تین سال ہو گئے ہیں آج ہماری شادی کو اور ان تین سالوں میں میں نے بار بار آپ کو اٹک بھاتے رب کے حضور گڑ گڑاتے دیکھا ہے۔ ایسا کون سا دکھ ہے آپ کو اتنا رونے کے بعد بھی جو کم نہیں ہوتا۔ بتائیے ناں انیس..... آپ مجھ سے شیئر کیوں نہیں کرتے کیا مجھے اس قابل نہیں سمجھتے؟“

وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سنجیدہ مگر اہنائیت بھرے نرم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”نہیں جان! میں تو خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا۔“

”ایسا مت کہئے میرے لئے اس پوری کائنات میں آپ سے اچھا، قابل، پیارا اور قابل محبت کوئی دوسرا شخص نہیں ہے انیس۔ آپ نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا جب سارے سہارے مجھ سے چھن گئے تھے۔ مجھے اس وقت اپنا یا تھا جب سب اپنے غیر بن گئے تھے۔ آپ نے تو مجھے نئی زندگی دی تھی انیس! آپ نے مجھے پھر سے معتبر اور معزز بنایا ہے۔ میرے انیس جیسا عظیم انسان تو

اس پوری کائنات میں بھی نہیں ہوگا۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دل سے اعتراف کر رہی تھی اور وہ خوشی سے زوہی تو پڑا تھا۔

”ٹھانٹہ نے مجھے اس قدر محبت اور چاہت دی ہے کہ اب اگر تم نے کبھی اپنی محبت سے دور یا محروم رکھا تو جی کہتا ہوں میرا دل بند ہو جائیگا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ وہ تڑپ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ہاں ٹھانٹہ! میں تو پہلے ہی تمہارے بغیر زندگی گزارنے کا تصور کر کے مرنے لگا تھا اور اب تو میرا دم روم تمہاری محبت کے بل پر زندہ ہے۔ مہک رہا ہے، مجھے خود سے کبھی جدا نہ کرنا تھا ورنہ موت مجھ سے آٹے گی۔“

”انیس! خدا کے لئے مجھ سے مرنے کی باتیں مت کریں ورنہ میں رونے لگوں گی۔ میں اتنی بہادر نہیں ہوں کہ آپ کی جدائی کا غم سہہ لوں۔ آئندہ اگر آپ نے ایسی بات کی تو.....“ وہ بولتے بولتے رو پڑی۔

”آئی ایم سوری میری جان رینلی سوری۔ اٹھو میرے پاس بیٹھو آؤ ناں۔“ انیس اسے روتا دیکھ کر بے قرار ہو گیا اور بازوؤں میں پکڑ کر اٹھایا اور پورے استحقاق کے ساتھ اپنی آغوش میں سمولیا۔ وہ رو رہی تھی اور وہ اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

”آپ کو..... میری محبت پر اعتبار نہیں ہے نا..... جی تو ایسی باتیں کر کے میرے دل کو تڑپاتے اور آزماتے رہتے ہیں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”بھٹا میں تمہیں تڑپانے، آزمانے یا رلانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم تو سراپا محبت ہو میں اپنی خوش بختی پر جتنا ناز کروں وہ کم ہے۔ پتہ نہیں کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔“ وہ اس کے سر پر بوسہ دے کر پیار سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”ایک بات کہوں؟“ وہ خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھا جو اس کے چہرے سے مس ہو رہا تھا۔ دھڑکنیں دھڑکنیں سے تکرار رہی تھیں۔ وہ اُن کے قرب کی خوشبو میں مہک رہی تھی۔

”ہاں کہو.....“ اس نے بہت پیار سے کہا۔

”مگر واپس چلیں۔“

”ہم گھر میں ہی ہیں۔“ وہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

”میرا مطلب ہے پاکستان واپس چلیں۔ مجھے اپنا وطن اپنا گھر اور سب گھر والے بہت یاد آتے ہیں۔“ ثنائے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔



”یادو بیٹھے بھی بہت آتے ہیں۔“

”تو پھر چلیں نا اس بار بڑی عید ہم وہاں سب کے ساتھ منائیں گے اور آپ کی سالگرہ بھی، میرا اب یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ثنا میں بھی بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے بات کروں مگر میں یہ سوچ کر خاموش رہ گیا کہ شاید تم جانا نہ چاہو اور میری وجہ سے زبردستی ہاں کر دو تو یہ زیادتی ہوگی تمہارے ساتھ لیکن اب تم نے خود سے کہا ہے تو میں بہت خوش ہوا ہوں۔ انشاء اللہ ہم بہت جلد پاکستان واپس چلے جائیں گے اور عید الاضحیٰ سب کے ساتھ مل کر منائیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے سینکے وجود کی زماہٹوں کو محسوس کرتے ہوئے بولا، اور پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔

”ثنا! اگر تمہیں میرے بغیر جینا پڑے تو.....“

”تو جی نہیں سکوں گی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہا آپ نے ایسا یہ کیا ہو جاتا ہے اچانک آپ کو؟“ ثنا نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”ثنا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“

”کہئے.....“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”ثنا میرا جرم، میرا گناہ بہت بڑا ہے اس لئے وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس احساسِ جرم کے ساتھ مزید نہیں جی سکوں گا کیونکہ میں اپنی ہی نظروں میں گر چکا ہوں۔ اٹھنا بھی چاہوں تو نہیں اٹھ سکتا لیکن..... شاید تمہارے معاف کر دینے سے میرے احساسِ جرم میں کچھ کمی ہو جائے۔“

”ایسا کیا کیا ہے آپ نے؟“ ثنا نے حیرانگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھے معاف کر دو گی۔ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ مجھے اپنی محبت سے کبھی محروم نہیں کرو گی۔“ وہ اس کے ہاتھ تھامے بے قراری سے بولا۔

”آپ بتائیے تو کیا کیا ہے آپ نے؟“ اس کی حالت محال ہو رہی تھی۔

”میں نے وہ سب کیا جس کی بدولت تم اپنے گھر اور شہر میں بدنام اور زسوا ہوئیں اور بحالتِ مجبوری میرے نکاح میں دے دی گئیں۔“ انیس نے نظریں جھکا کر یہ انکشاف کرتے ہوئے بتایا۔

”کیا.....؟“ ثنا کی سماعتوں میں تو جیسے ایٹم بم پھٹ گیا تھا۔

”ہاں..... آحد میرا ہی خون ہے۔ میں ہی وہ بے غیرت ہوں جس نے تمہارے ساتھ.....“

”بس کچھ پلیز!“ وہ چیخ اٹھی جھپٹکے سے اپنے ہاتھ بھی اس کے ہاتھوں سے چھڑا لئے۔

”بٹا!“ انیس نے تڑپ کر پکارا۔

”کچھ مت کہئے انیس احمد!“ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”بے شک تم مجھے جان سے مار دو مگر مجھے میرے جیتے جی چھوڑ کر مت جانا۔ میں بہت بے بس ہو گیا تھا تمہارے گھر والوں کے انکار نے مجھے تار تار کر دیا تھا ثنا۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”اور آپ نے مجھے تار تار کر دیا انیس احمد مجھے..... اپنی محبت کو۔“ وہ روتے ہوئے بولی

انیس نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ روتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی اور بستر پر گرتے ہی مٹھوٹ مٹھوٹ کر رونے لگی۔

”یا اللہ! یہ تو نے کیسی تقدیر لکھی ہے میری مانگ میں راکھ ڈالنے اور میرا آنچل تار تار کرنے والے ہاتھوں نے میری مانگ افشاں سے بھردی اور آنچل ستاروں سے ٹانگ دیا۔ ذلت و رسوائی کا سبب بننے والے انیس احمد کو میری محبت اور پذیرائی کا باعث بنادیا۔ کیا سزا دوں میں انیس احمد کو اس گناہ کی جو وہ خود تین سال سے اس احساسِ گناہ میں گھرے تیرے دربار میں انکھوں کے موتی لٹاتے رہے ہیں۔ میں تین بیٹے جس کرب سے گزری تھی انیس احمد تین سال اور تین ماہ سے اس کرب کو جھیل رہے ہیں۔ ان کا ضمیر انہیں چین نہیں لینے دیتا اور ضمیر کا زہر تو سقراط کے پیا۔ سے بھی بڑا ہوتا ہے..... اس واقعے کے بعد میرے سب سے سوتیلے بن گئے تھے۔ اپنے پرانے گئے تھے۔ ماں باپ، بہن بھائی، بھائیوں رشتے دار دوست سب ہی کی نگاہوں میں میرے۔ حقارت اور تمسخر بھر گیا تھا۔ سب کی باتوں، لہجوں اور رویوں نے میری روح کو چھلنی کر دیا تھا۔ سر مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مجھے مار دینا چاہتے تھے اور سارے خون کے رشتے خوں رشتوں میں بدل گئے تھے۔ میرے کردار کو سب نے غلط جانا تھا اور یہ سب انیس احمد کے غلط اقدام سے ہوا تھا۔ ایک گناہ، ایک جرم جو یقیناً ناقابلِ معافی ہے لیکن..... انیس احمد بھی تو انسان فرشتے تو نہیں ہیں کہ ان سے کوئی غلطی، کوئی گناہ، کوئی خطا سرزد نہ ہو سکے۔ یہ گناہ، یہ جرم انہ نے مجھے پانے کے لئے کیا تھا۔ ان کی محبت اتنی خطرناک تھی کہ وہ مجھے، خیر جو گزر گیا اس پر کیا سزا تو میں جب انیس احمد کو دوں کہ انہوں نے مجھے بے آبرو کر کے بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہو۔ انہ نے اپنے جرم کا اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے، اس زیادتی کی تلانی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان تین برسوں میں انیس نے مجھے اتنی محبتیں دی ہیں کہ میری تین زندگیوں کے لئے بہت ہوں گی..... انیس نے مجھ سے بہت دھوم دھام سے شادی کی۔ آحد کو اسی لئے اپنا نام

رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی حالت پہ تڑپ رہے تھے۔  
 ”تم نے کہا تھا ثنا کہ اگر وہ شخص تمہارے سامنے آگیا تو تم اسے گولی مار دو گی ختم کر دو گی۔“ وہ شخص تمہارے سامنے ہے ثناء اُسے گولی مار دو، ختم کر دو اپنی عزت کے دشمن کو۔“  
 پستول لئے انیس نے بھیگتی آواز میں کہا تو چند سیکنڈ وہ اسے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر پستول اٹھالیا اور بستر سے اتر آئی۔

”یہ شخص تو میری عزت کا دشمن ہرگز نہیں ہے اس شخص کی وجہ سے میرے میکے والے اب مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ان کے سامنے مجھ بچھ جاتے ہیں۔“ ثناء نے دل میں کہا اور پستول میں سے گولیاں نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔ پستول اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے جا گرا۔  
 ”ختم کر دو انہنا سب کچھ ختم کر دوں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ دنیا والوں کی نظروں میں ایک عظیم انسان ہیں۔ میرا سہاگ ہیں میرے بچوں کے باپ ہیں۔ اور۔۔۔ اور میری محبت بھی تو ہیں میں۔۔۔ میں کیسے مار دوں آپ کو انیس احمد کیسے؟ میں پھر سے رسوائیوں کے مجبور میں نہیں پھنسا چاہتی۔ آپ کو مار کر مجھے کیا ملے گا؟ ذلت، رسوائی جیل اور جگ ہنسا۔۔۔ میرا بچہ زل جائے گا۔ پہلے کیا کم رسوائی ہوئی تھی میری کہ اب میں شوہر کو قتل کر کے پھر سے ذلت کا اشتہار بن جاؤں۔ نہیں انیس احمد میری بے گناہی اور پارسائی پر تو پھر بھی کوئی قیامت تک یقین نہیں کرے گا۔ آپ تو تب بھی۔۔۔ مظلوم۔۔۔ معصوم اور عظیم ہی کہلائیں گے۔ جائے انیس احمد میں نے آپ کو معاف کیا۔ اس محبت کے صدقے جو آپ نے مجھے۔۔۔ ان تین برسوں میں دی ہے۔ اس راحت و مسرت کے صدقے جو آپ مجھے مہیا کرتے رہے ہیں اور۔۔۔ اور اس اولاد کے صدقے جس کا ہونا آپ کے وجود کے سبب ہے۔ میں نے آپ کو اس گناہ کے لئے معاف کیا انیس احمد۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی آپ کو معاف کرے۔“ وہ روتے ہوئے اس کے دل پر پہاڑ جتنا بوجھ اٹھاتی اس کے لئے اور بھی اصول ہو گئی تھی۔

”ثنا! میں تمہارا قصور وار ہوں۔ مجرم ہوں تمہارا مجھ سے بھول ہو گئی تھی ثناء میں بہک گیا تھا۔ شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ میرے دوست فیضان نے میری تمہاری لئے بے قراری دیکھتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا وہ ویں میں ہوتا ہے آج کل اسے معلوم ہے کہ میں نے تم سے شادی کر لی تھی۔“

”تو وہ دوسرا شخص آپ کا دوست تھا۔“ ثناء نے اس کا ندامت سے چور چہرہ دیکھتے ہوئے کہا تو نظریں جھکا کر سنجیدگی اور رنجیدگی سے گویا ہوا۔

اور مجھے جنم دینے پر آمادہ کرتے رہے کہ وہ جانتے تھے کہ اُحد اُن کا خون ہے ان کا بچہ ہے، اسے بہر حال انہوں نے جائز اولاد کی صورت میں اس دنیا میں لانے کے لئے مجھ سے نکاح کر لیا تھا ازالہ تو کر دیا تھا اپنے گناہ کا مجھ سے شادی کر کے، بچے کو اپنا نام دے کر۔ میں ان کا یہ جرم کیسے ان کے سامنے رکھوں۔ اب تو وہ خود ہی احساسِ جرم سے اندر ہی اندر گھلتے رہے ہیں۔ ان کا راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کے حضور گڑ گڑانا اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ وہ اپنے کئے پر بہت نادم تھے۔ اتنے برس احساسِ جرم کی آگ میں تہا چپ چاپ جلتے رہے۔ اس ڈر سے مجھے بھی نہ بتایا کہ کہیں میں ان سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤں۔ انہیں چھوڑ کر نہ چلی جاؤں۔ یہ سزا تو بڑی تھی ان کے لئے اب میں کیا سزا دوں انیس کو اور کیوں دوں؟

”شادی کے ان تین برسوں میں انیس نے مجھے ایک بار بھی تو نہیں ڈانٹا۔ اتنی محبت دی ہے مجھے کہ میں تو ان کی عیادت کے تصور سے ہی مرنے لگتی ہوں۔ اتنا زیادہ خیال رکھا ہے میرا کہ مجھے ان سے دُوری کا خیال بھی ترپانے لگتا ہے۔۔۔ میرے روم روم میں انیس احمد نے اپنی محبت کی حرارت بھردی ہے۔ اتنی محبت کرنے والے جانثار اور کیڑے انسان کی میں ایک غلطی، ایک گناہ بھی معاف نہیں کر سکتی کیا۔۔۔؟ اُن کی زبان سے یہ حقیقت جان کر میرے دل میں ان کے لئے نفرت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ بالفرض میں انیس کو سزا کے طور پر چھوڑ دوں تو میں کہاں جاؤں گی؟ یہ دنیا والے مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میکے والوں کے رویے پھر سے ناقابلِ برداشت ہو جائیں گے جو کچھ میرے اغواء کے بعد انہوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ اب کی بار اس سے زیادہ نفرت اور ذلت دیں گے مجھے۔۔۔ انیس احمد کا سلوک اگر مجھ سے بُرا ہوتا تو پھر بھی میں واپسی کا نہیں سوچ سکتی تھی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ انیس احمد کے سوا میری کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اب بھی میں واپس جانے کا نہیں سوچ سکتی میرے پاس واپسی کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس اغواء والے واقعے کے بعد جو ذلت، اجنبیت، غیریت، نفرت اور اذیت میں نے سہی تھی۔ اپنوں پرانیوں سب کی باتوں کے نفرتوں کے فکرت برداشت کئے تھے۔ وہ سب پھر سے جھیلنے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ انیس کا جرم بے شک بڑا تھا لیکن انہوں نے اس کی غلطی کر دی ہے اور کر رہے ہیں اتنی محبت، توجہ اور خیال کے خوبصورت جذبے مجھے سوچ کر۔۔۔ وہ۔۔۔ مادتا اگر بُرے ہوتے تو مجھے کبھی نہ اپناتے یا کم از کم مجھ سے اعترافِ جرم نہ کرتے مگر وہ ایک اچھے انسان ہیں اور اچھے انسان کو اگر اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔“

ثنا کے دل و دماغ سوچتے سمجھنے کی جانب مائل تھے۔ رات کی چادر شانوں سے سرکئی جا



”ہاں میں کمزور لمحے کی گرفت میں آ گیا تھا اور پستی میں جا گرا تھا مگر یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں پانے کے لئے وہ سب کیا تھا۔ میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا..... ٹا! اگر تم میری زندگی میں نہ آتی تو مر جاتا۔ تمہاری محبت کی شدت نے مجھے اس حد تک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اپنے کئے پر بہت نادم ہوں۔ ٹان تین برسوں میں نہیں پل پل مرا ہوں، احساسِ گناہ نے مجھے چین نہیں لینے دیا تھا تمہاری محبت، قربت اور رفاقت پر جب جب میں نازاں اور شاداں ہوتا مجھے جب تب اپنے اس جرم نے لعنِ طعن کیا۔ آج میرا ضبط جواب دے گیا تھا ٹان میں مزید تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا تھا سب سچ سچ بتا دیا ہے۔ اب تم مجھے..... جو چاہو سزا دے لو لیکن جیتنے جی مجھے اپنی جڈائی کی سزا مت دینا۔“

”کتنی عجیب بات ہے مجھے آپ سے نفرت نہیں ہو سکی۔ یہ سب جان کر بھی نہیں یا شاید اس لئے کہ آپ نے اپنی محبتوں سے اپنا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے انہیں اب آپ خود کو سزا دینا چھوڑ دیں..... لیکن کسی سے اتنی محبت نہیں کرنی چاہئے کہ اس کی عزت اور آبرو کے بدلے رسوائی حاصل کرنی پڑ جائے۔ محبت کو اپنی عزت سمجھنا اس کی اولین شرط ہے۔“ وہ بھیکتی آواز میں بولی تو اس نے شرمندگی سے کہا۔

”جانتا ہوں سب جانتا ہوں لیکن میں بے بس ہو گیا تھا کیا کرتا میں..... میں اندھا ہو گیا تھا تمہاری محبت میں۔“

”اور پھر مجھے ابھی اندھا کر دیا اپنی محبت میں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”ٹا! میری جان!“ وہ خوشی سے ہانپیں پھیلائے اس کی جانب بڑھا تو وہ بھی تڑپ کر اس کی پناہوں میں آ سائی۔

کل اس نے جو بھی کیا تھا آج وہ اس کے لئے خوشیوں اور محبتوں کا محور تھا۔ اس کی سب سے مضبوط، محفوظ اور محبت بھری پناہ گاہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم بھوٹ بھوٹ کر رو دیئے تھے۔ جب سن کا سارا میل دھل گیا تو محبتوں کا چاند سن کے افق پر پوری آب و تاب سے چمکنے لگا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے آنسو صاف کئے۔ ٹان اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”آج کے بعد آپ نہیں روئیں گے۔ ہم نئے سال کا آغاز نئے اعتماد اور اعتبار کے ساتھ کریں گے۔ اب آنکھوں کا بادل ہماری آنکھوں میں نہیں چھائے گا۔ آپ میرے لئے اب بھی وہیں انہیں ہیں جو اس اعترافِ جرم سے پہلے تھے۔ آپ کی محبتوں نے آپ کے اس گناہ کو بھی دھو دیا ہے۔ آپ میرے لئے بہت پیارے، اُجلے اور اچھے انسان ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ کو

نگاہ نہ کھاکر نہیں بلکہ نگاہ اٹھا کر ہمیشہ میرے سامنے رہتا ہے۔ میرے ساتھ میرے پاس..... لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ اگر آپ کی محبتوں میں ذرا سی بھی کمی محسوس ہوئی تو میں آپ سے خفا ہو جاؤں گی۔“

”اوں ہوں میں اپنی زندگی کو کبھی خفا ہونے نہیں دوں گا میری محبتیں ہمیشہ تم پر سایہِ کلن رہیں گی۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ میں محبت اور تم۔“ وہ اس کو اپنی بانہوں کے حصار میں لئے خوشی سے کانپتے ہوئے لہجہ میں بولا۔

”انشاء اللہ!“ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”تھینک یو جان! تم بہت عظیم ہو آج تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اب میں تمہیں عید اور نئے سال کے تحفے دوں گا بہت محبت سے۔“ انہیں نے محبت پاش لہجہ میں کہا وہ مسکرائے مٹکی۔

نئے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا ان کی محبتوں اور رفاقتوں کے نئے سال کا آغاز نئے اور انوکھے انداز میں ہو رہا تھا۔



”لا حول ولا قوۃ۔“ وہ غصے سے بولا۔

”یہ آپ نے اپنے لئے پڑھا ہے نا۔“ رانیہ نے اسے مزید تپانے کو مصیبت سے کہا تو وہ سمجھ گیا کہ اتنی دیر سے لائن بڑی کیوں مل رہی تھی، یقیناً یہ باتوں لڑکی ٹیلی فون پر اپنی کسی سہیلی سے کہیں مار رہی ہوگی۔

”میں ہارون ضیاء کا بھائی اور ضیاء الدین کا بیٹا، مامون ضیاء بات کر رہا ہوں، آیا آپ کی سمجھ میں، اب بات کرایئے میری رضیہ خالہ سے۔“ مامون نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اپنا مکمل تعارف کرایا۔

”اور اگر نہ کراؤں بات تو۔“ رانیہ کو بھی اب اپنے کزن کو ستانے میں حرا آ رہا تھا، جس کو آج تک اس نے دیکھا نہیں تھا۔ شرارت سے کہا۔

”میں دیکھ لوں گا تمہیں۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

”دیکھ لینا مگر اچھی نظر سے کہیں مجھے نظر ہی نہ لگا دیتا۔“

”دل تو تھپڑ مارنے کو چاہ رہا ہے۔“ وہ بولا تو رانیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور مامون کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کی ساعتوں میں جبر نے گتکٹانے لگے ہوں، کتنی دلنشین ہنسی تھی اس کی وہ کھوسا گیا۔

”اماں! آپ کے بھانجے مامون ضیاء کا کراچی سے فون ہے لیں بات کریں ہامون جادوگر سے۔“ رانیہ نے رضیہ بیگم کو آواز دے کر کہا مامون کو اس کا ہامون جادوگر کہنا سلا گیا، کتنی دلیر تھی یہ لڑکی کیسی بے تکلفی سے کزن ہونے کا حق استعمال کر رہی تھی۔ مامون کو حیرت ہو رہی تھی۔ آخر یہ لڑکی کیا چیز ہے؟

رانیہ نے ریسور رضیہ بیگم کو تھما دیا اور خود چھت پر سوکھے کپڑے اتارنے چلی گئی۔ کپڑوں کا ڈھیر اتار کر اٹھائے ہوئے نیچے واپس آئی تو رضیہ بیگم کو خوشی سے براۓ میں ٹپکتے دیکھا۔

”خیر تو ہے اماں! کیا کہہ دیا اس ہامون جادوگر نے جو آپ اس قدر خوش دکھائی دے رہی ہیں؟“ رانیہ نے کپڑے تخت پر رکھتے ہوئے ان کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اے نام کیوں بگاڑ رہی ہے بچے کا، اتنا تو بیا رانا م ہے مامون، سب اسے چاند کہتے ہیں۔“ مومن وہ پرسوں یہاں آ رہا ہے، اس کی تین مہینے کی کوئی ڈینگ ہے، اس لیے کہہ رہا تھا کچھ دن آپ کے پاس رہوں گا پھر کوئی اور بندوبست کر لوں گا۔ تین ماہ تک آپ پر بوجھ نہیں ہوں گا۔ میں نے تو ڈانٹ دیا کہ یہ کیسی باتیں کرتے ہو، خالہ کے گھر پہلی بار آ رہے ہو اور کہیں اور جانے کی بات بھی سوچے ہوئے ہو۔ تو میں نہ ہونے دوں گی۔ تم تین مہینے یہاں رہو گے ورنہ آنے کی

## چاند رات کو چاندنی ملی

اب سے تو وہ سادوں کی پھواروں جیسا اور گھٹل جائے تو پھر چاند ستاروں جیسا اس کا آئٹل ہے کہ ڈھلکا ہی چلا جاتا ہے پھر بھی معصوم ہے وہ ابر کے پاروں جیسا ”فرن فرن“ ٹیلی فون کی کھنٹی بجی تو رانیہ باہر جاتے جاتے پٹئی۔

”جھنجھکس گا ڈالائن تو ملی۔“ دوسری جانب مامون ضیاء نے لائن ملنے پر کلمہ شکر ادا کیا۔

”ہیلو۔“ رانیہ کی مترنم آواز مامون کے کان میں پڑی۔

”السلام علیکم! یہ رضیہ خالہ کا گھر ہے؟“

”جی ہاں! آپ کون صاحب؟“

”میں رضیہ خالہ کا بھانجا بات کر رہا ہوں کراچی سے، رضیہ خالہ سے بات کر دیجئے۔“

مامون نے مہذب۔ لہجہ میں اپنا تعارف کرایا۔

”آپ کا نام؟“

”بھئی کیا یہ کہہ دیتا کافی نہیں ہے کہ میں رضیہ خالہ کا بھانجا بات کر رہا ہوں۔“ مامون نے چڑ کر کہا۔

”مستر بھنچے! یہاں محلے میں میری اماں کو سب لڑکے لڑکیاں خالہ کہتے ہیں اس کا یہ

مطلب نہیں ہے کہ وہ سب کے سب اماں کے بھانجے، بھانجیاں ہو گئے وہ بھی سکے والے۔“ رانیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

نہیں آیا تھا، بس عید بکرا عید پر فون کر کے اس نے جیسے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ رضیہ بیگم اور امجد علی کو اکلوتے بیٹے کی لاپرواہی اور بے حسی کا بہت رنج تھا اور وہ دونوں دل ہی دل میں بیٹے کی یاد میں خون کے آنسو روتے تھے۔ رانیہ کو امجد علی پر غصہ آیا کرتا تھا، اسے دولت والوں سے اس لئے سخت چڑ ہو گئی تھی کہ وہ خون کے رشتوں کو دولت کی ہوس میں بھلا دیتے ہیں۔ رزق کی امداد دوڑ میں رشتے کتنے پیچھے رہ جاتے ہیں رانیہ کو بہت کم عمری میں ہی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے مڈل کلاس سے تعلق ہونے پر شاکر تھی۔ اسے روپے پیسے، کار، کوٹھی کی خواہش تھی نہ ہوس۔ حال ہی میں اس نے بی ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ وہ بہت ذہین تھی ہر سال اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ ہمیشہ اسے گریڈ لیتی تھی۔ اس بار بھی وہ خاصی پُر امید تھی۔ رضیہ بیگم کی ایک ہی خالہ تھیں اور سہیلی ان کی بیٹی تھیں، ان کی شادی ضیاء الدین سے ہوئی تھی جو فیکٹریوں اور کار کوٹھی کے مالک تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، ہارون ضیاء جو شادی شدہ اور بچوں والے تھے اور فیکٹری چلا رہے تھے ان سے چار سال چھوٹا مامون تھا بہت لائق تھا۔ ایم سی ایس کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا اور اب اس سے اچھی کمپنی میں جاب ملنے پر ٹریننگ کے لئے لاہور آ رہا تھا۔ رضیہ بیگم کے ایک ہی بھائی تھے، مجید غفار اور ان کی بیوی رخسانہ مجید ان کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے، رخسانہ مجید رانیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور امجد علی کے بھائی ارشد علی بھی رانیہ کو اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ دونوں طرف دولت کا بھاری جہیز کا لالچ تھا کہ امجد علی دینی گیا ہے تو خوب دولت کما کما کر بھیج رہا ہوگا، لیکن جب انہیں گھر میں کوئی خوشگوار تبدیلی نظر نہیں آئی اور یہ معلوم ہوا کہ امجد علی نے گھر والوں سے رابطہ ہی تقریباً ختم کر رکھا ہے، پیسے بھی نہیں بھیجتا تو وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ رانیہ ان کی نیتوں سے بے خبر نہیں تھی۔ جیسی وہ ان سب سے اور دولت سے بیزار رہتی تھی۔ جس نے اس کے خون کے رشتوں میں کھوٹ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے سبب بھائی کو اس سے دُور کر دیا تھا۔

”امجد ہاؤس“ چم چم کر رہا تھا، رانیہ نے اماں (رضیہ بیگم) کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اوپر والے کمرے کو بھی دھوکر، جالے صاف کر کے خوب سلیقے سے سیٹ کر دیا تھا اور باقی گھر کو بھی دھو کر صاف ستھرا کر دیا تھا۔ مامون بارہ بجے کی فلائٹ سے آ رہا تھا۔ ابا دو پہر کا کھانا کھانے کے لئے گھر ہی آ گئے تھے۔ رانیہ نے چکن بریانی، مٹن قورمہ، کسٹرڈ اور سلاڈ بنایا تھا۔

”اماں! یہ موصوف تین ماہ یہاں رہیں گے اور آپ نے آج ہی سارے پکوان پکوا لئے۔“ رانیہ نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

”پہلی بار آیا ہے مامون یہاں، کیا سوچتا کہ خالہ ایک وقت اچھا کھانا بھی نہیں کھلا سکتی۔“

ضرورت نہیں ہے۔ بڑی نہ نہ کرتا رہا ہلا خرمان گیا۔“ رضیہ بیگم نے ساری بات تفصیل سے بتا دی۔

”اماں! ابھی کل تو میرے امتحان ختم ہوئے ہیں اور ابھی میری پڑھائی کی تھکن بھی نہ اتری کہ آپ نے مستقل مہمان کو دعوت دے دی ہے۔ وہ بھی تین مہینے کے لیے گویا میری ساری چھٹیاں ان موصوف کی خاطر تواضع کرتے ضائع ہو جائیں گی۔“ رانیہ نے منہ بسور کر کہا۔

”چپ نادان! مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتا ہے اور پہلی بار مامون یہاں آ رہا ہے، کبھی دو چار سال کی عمر میں یہاں آیا تھا، بڑے گھر کا بچہ ہے کار، کوٹھی کا عیش آرام ہے نوکر چاکر آگے پیچھے پھرتے ہیں اس کے۔“

”پھر بھی آپ نے اسے اپنے اس چھ سات مرلے کے گھر میں آنے کے لئے کہا دیا یہاں کون سے نوکر چاکر ہیں جو اس مامون جادوگر کی خدمت گزاری میں لگے رہیں گے اور روز روز نت نئے پکوان کہاں سے کھلائیں گے ہم اسے، بے شک ابا کا جزل اسٹور ہے مگر آپ کے بھانجے کو وہ اس کی حیثیت کے مطابق تو نہیں رکھ سکیں گے یہاں۔“ رانیہ نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجہ میں کہاں کہاں تو وہ بولیں۔

”ہم مامون کو اپنی حیثیت کے مطابق رکھیں گے، اس کے ماں باپ کو ہمارے حالات کا علم ہے۔“

”اماں! یہ مامون ضیاء آپ کی خالہ کی بیٹی سہیلی آنٹی کا بیٹا ہے نا۔“

”ہاں اور تیز سے بات کر، پانچ برس بڑا ہے وہ عمر میں تجھ سے، ایم سی ایس کیا ہے، بڑی اچھی نوکری ملی ہے اسے لاہور میں۔“

”ملی ہوگی میری بلا سے، میری چھٹیاں تو برباد ہو گئیں ناں اس کی وجہ سے۔“ رانیہ کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”وہ تجھے کیا کہہ دے گا، خبردار جو اس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کی ہاں اوپر والا کرہ اچھی طرح سے صاف کر کے پتنگ پر نئی چادر بچھا دینا اور غسل خانے میں نیا تولیہ اور صابن وغیرہ بھی رکھ دینا۔“ اماں نے ہدایات دینا شروع کر دیں اور رانیہ غصے سے ہر پٹختی اوپر چلی گئی۔

رضیہ بیگم اور امجد علی کے دو بچے تھے، ایک بیٹا امجد علی اور اس سے پانچ سال چھوٹی رانیہ علی، امجد علی کا جزل اسٹور تھا جو کامیابی سے چل رہا تھا۔ سات مرلے کا مکان بھی اپنا تھا۔ امجد علی نے ایف اے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی اور سنار کا کام سیکھ کر اپنے ایک دوست کے ساتھ دینی چلا

وہ آگیا ہے خبردار جو اس کے سامنے الٹی سیدھی یکو اس کی۔ شرمندہ نہ کر دینا مجھے اس کے سامنے۔“ رضیہ بیگم نے آہستگی سے اسے ڈپٹے ہوئے کہا۔

”ہاں جیسے پہلے تو میں ہر کسی کے سامنے آپ کو شرمندہ کراتی رہی ہوں نا۔“

”اری میری رانی! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا، اچھا دس پندرہ منٹ میں کھانا لگا دینا اور مامون کو بھی آکر سلام کر دینا۔“

”اس حلیے میں۔“ رانیہ نے اپنے میلے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”صبح سے تو آپ نے کچن میں گھسا رکھا ہے میں کھانا لگا کر نہانے چلی جاؤں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے ڈھنگ کے کپڑے پہننا۔“ رضیہ بیگم نے جلدی سے کہا اور تیزی سے ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ جہاں مامون آچکا تھا اور امجد علی سے مجو گفتگو تھا۔ رضیہ بیگم سے بھی وہ بہت مہذب انداز میں ملا کچھ دیر دونوں میاں بیوی اس سے گھروالوں کی، اس کی ملازمت کی بابت گفتگو کرتے رہے پھر تینوں نے مل کر کھانا کھایا، مامون کو ٹیلی فون پر بات کرنے والی لڑکی یعنی رانیہ کو دیکھنے کی تمنا تھی اور وہ کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ امجد علی کھانے کے بعد مامون کو آرام کرنے کا کہہ کر واپس اپنے اسٹور پر چلے گئے تھے۔

”خالہ جان! میں نے جب فون کیا تھا تو کس نے اٹھایا تھا؟“

”رانیہ نے اٹھایا تھا۔“

”رانیہ کون؟“ اسے سلیٹی بیگم نے بتایا تھا کہ رانیہ ان کی بیٹی ہے مگر وہ انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔

”میری اکلوتی بیٹی ہے اور کون، تم لوگ کبھی ملے جو نہیں اسی لئے تمہیں معلوم نہیں ہے۔“ کھانا اسی نے پکایا تھا، صبح سے کام میں لگی ہوئی تھی شاید تھک کر سو گئی ہو۔ بیٹا اب تم بھی آرام کرو تمہارا کمرہ اوپر چھت پر ہے اپنا سامان بھی وہیں لے جاؤ انشاء اللہ شام کو ملاقات ہوگی۔“ رضیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے خالہ جان!“ وہ سعادت مندی سے بولا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر بیڑھیاں چڑھتا جونہی اوپر پہنچا اس کی نظر رانیہ پر پڑی جو نہانے کے بعد دھوپ سینکے چھت پر آگئی تھی۔ وہ سفید شلوار ہلکے نیلے رنگ کی کاشن کی قمیض دوپٹے میں نکھری نکھری بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ رانیہ بھی آہٹ سن کر بیڑھیوں کی جانب مڑی تو اپنے روبرو ایک چھ فٹ لمبے، مضبوط وجیہ سرخ و سفید رنگت والے خوب روٹو جوان کو دیکھ کر شیشا گئی، اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ اوپر تو اب مامون کا کمرہ

سیٹ کر دیا گیا ہے۔ وہ آرام کرنے یہیں آتا مگر رانیہ تو نہا کر حسب عادت اوپر آگئی تھی۔ اب شرمندہ سی واپس جانے لگی تو مامون نے اس کے سراپے پر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے شوخ لہجے میں مسکرا کر کہا۔

”اوہ! تو آپ ہیں ملکہ رانیہ۔“

”اوہ! تو آپ ہیں مامون جادوگر۔“ رانیہ نے برجستہ جواب دیا تو مامون کو بے اختیار ہنسی آگئی اور وہ نروس ہو کر نیچے جانے کے ارادے سے آگے بڑھی ہی تھی کہ مامون نے اس کا ہاتھ تھامنے کی جسارت کر ڈالی۔ رانیہ اس کی اس حرکت پر حیران رہ گئی۔

”آتے ہی اپنی اوقات دکھا دی نا، چھوڑو میرا ہاتھ۔“ رانیہ نے غصے سے اس کے خوب رو چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”فون پر خود ہی تو کہا تھا تم نے کہ مجھے دیکھ لینا مگر اچھی نظر سے کہیں نظر نہ لگا دینا اور میں نظر تھوڑی لگا رہا ہوں، میں تو تمہیں اپنی نظر میں سارہا ہوں، بسا رہا ہوں۔ رانیہ تم واقعی رانی ہو۔“ مامون نے اس کے چہرے کو دالہانہ پن سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ خوب جانتی ہوں میں تم جیسوں کو، کلی کلی منڈلانے والے لہندے، لڑکی دیکھتے ہی تم جیسوں کی شرافت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔“ وہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے نفرت سے بولی۔

”شٹ آپ!“ مامون کی غیرت و آنا پر تازیانہ لگا تھا۔ اس نے غصے میں رانیہ کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا۔ رانیہ اس کے اس رد عمل کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی لڑکھڑا کر صحن کی دیوار سے جا ٹکرائی، اس کے سر پر زور کی چوٹ لگی تھی۔ رانیہ کی چیخ نکل گئی۔ مامون کو اپنی غلطی کا فوراً ہی احساس ہوا تھا، وہ اُسے پکڑنے کے لئے بڑھا تو رانیہ نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور اتنی حقارت سے اسے گھودا کہ وہ اندر تک سے شرمسار سا ہو گیا۔ وہ اس پر قہر آلود نگاہ ڈال کر تیزی سے نیچے دوڑ گئی۔ مامون نے اس کی آنکھوں میں سے چھلکتی نفرت کو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔

”اوگا ڈا! یہ مجھ سے کیا ہو گیا؟“ مامون نے بے بسی سے اپنے اس ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا جو غصے میں رانیہ پر اٹھ چکا تھا۔ ”اسے بھی تو وہ سب نہیں کہنا چاہئے تھا میں نے کب کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھا یا پھوٹا ہے کسی کو بھی نہیں..... رانیہ کو دیکھتے ہی میں بے قابو، بے خود اور بے اختیار ہو گیا تھا۔ شاید شرارت اور مذاق کی نیت سے، اسے تنگ کرنے کے لئے بول گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟ وہ تو مجھے ایک بڑا انسان سمجھے گی۔ اب کتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں میرے لئے، یہ



آتے ہی میں نے کیا گل کھلایا ہے۔ اُف میرے اللہ۔“ مامون اپنے کمرے میں آ گیا تھا اور سامان رکھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹھٹھٹے ہوئے سوچ رہا تھا، خود کلائی کر رہا تھا، بہت بے چین ہو رہا تھا۔ ”گھٹیا، آوارہ، قلرٹ کیسے مجھے دیکھتے ہی لٹو ہو گیا اور میں نے آئینہ دکھایا تو الٹا بھی پر ہاتھ اٹھا لیا۔ مامون ضیاء تم نے بہت بُرا کیا ہے میرے ساتھ! اب اچھا تو میں بھی تمہارے ساتھ نہیں کروں گی۔ میں اماں کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتی ورنہ ابھی میں تمہاری اس گھٹیا حرکت کے بارے میں ضرور بتا دیتی۔ تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر دشمنی مول لی ہے، تمہارا پہلا تاثر ہی قابل نفرت ہے، آئی ہیٹ یو مامون ضیاء، آئی ہیٹ یو، تم نے اپنی اس حرکت سے ثابت کر دیا ہے کہ تم ایک بگڑے ہوئے آوارہ مزاج امیر زادے ہو لیکن میں تمہارے مزاج کی لڑکی نہیں ہوں، یہ تم بھی جان لو گے۔“ رانیہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر ڈھسے گئی۔ خاموشی سے روتے ہوئے دل میں سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گئی۔

دو دن ہو گئے تھے اس واقعے کے بعد رانیہ اور مامون کا آنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ رانیہ دانستہ اس کے سامنے آنے سے کتراری تھی۔

”رانیہ بیٹی! یہ مامون ابھی تک نیچے نہیں آیا، دیکھنا جا کر کہیں سوئی نہ رہا ہو، دفتر بھی تو جاتا ہے اسے۔ کبھی دیر ہو جائے۔“ رضیہ بیگم نے اگلی صبح رانیہ سے کہا امجد علی ناشتہ کر کے اسٹور پر چلے گئے تھے اور مامون ابھی تک ناشتے کے لئے آیا نہیں تھا۔

”اماں! میں نہیں جا رہی بھوک لگے گی تو آجائیں گے موصوف۔“ رانیہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ انہوں نے ٹرے اٹھا کر کہا۔

”اچھا چل یہ ناشتہ بھائی کو اوپر ہی دے آ۔“

”میرا کوئی بھائی نہیں ہے، جب سگا بھائی اپنا نہیں بنا تو یہ کیوں میرا بھائی بنے لگا۔“ وہ غصے سے کبھی کچن سے تیزی سے باہر نکل گئی اور اس جانب آتے مامون سے ٹکرائی۔

”اپنی آنکھیں کھلی رکھا کرو مسٹر۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا رانیہ نے فوراً ہی اسے اس ٹکراؤ کا دوش دیتے ہوئے غصے سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آنکھیں کیا میں نے تو اپنے دل کے دروازے بھی تمہارے لئے کھول رکھے ہیں۔“

”اپنی کھال میں رہو ورنہ میں ابا سے تمہاری شکایت کر دوں گی اور اس گھر کے دروازے تم پر ضرور بند کر دیئے جائیں گے سمجھو تم۔“ رانیہ نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ بھی سپاٹ لہجے میں بولا۔

”سمجھ گیا تم بھی سمجھ جاؤ، پانچ چھ سال بڑا ہوں میں، تم سے عمر میں، تیز سے آپ کہہ کر بات کیا کرو مجھ سے۔“

”عمر میں بڑے ہو کر تیں تو بہت چھوٹی اور گری ہوئی کرتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی اور اپنے کمرے میں جا گئی تھی۔

”مامون بے بسی سے لب کاٹا ناشتہ کئے بغیر ہی آفس کے لئے نکل گیا۔

”رانی! تو نے کیا کہا ہے مامون سے جو وہ ناشتہ کئے بغیر ہی آفس چلا گیا؟“

رضیہ بیگم نے باورچی خانے کی جالی دار کھڑکی سے اسے مامون سے الجھتے دیکھ لیا تھا جیسی اس کے جانے کے بعد رانیہ کے سر پر جا پہنچیں اور جرح کرنے لگیں۔

”واپس آئے گا تو اسی سے پوچھ لیجے گا۔“ رانیہ نے چڑ کر جواب دیا۔

”تمہاری ان حرکتوں اور ردیوں کو دیکھ کر وہ یہی سمجھے گا کہ تمہیں اس کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا، وہ واپس چلا جائے گا تو کیا عزت رہ جائے گی میری۔ اس کے ماں باپ کی نظر میں، کیا سوچیں گے وہ کہ رضیہ چار دن بھی ہمارے بیٹے کو اپنے گھر مہمان نہیں رکھ سکی۔ آخر تیرا مسئلہ کیا ہے بتا مجھے؟“ رضیہ بیگم نے غصے سے سوال کیا۔

”آپ جانتی ہیں مجھے امیر لوگ اچھے نہیں لگتے۔“

”لاٹھی لوگ اچھے نہیں لگتے مجھے۔“ سارے امیر بُرے تھوڑے ہوتے ہیں اور مامون کی طبیعت کتنی سادہ ہے، امیروں والے چوٹیلے ہیں نہ خُڑے اتنا پیارا سعادت مند اور نیک بچہ ہے کبھی اس سے فس بول بھی لیا کر کون سا پردہ ہے تیرا اس سے؟“ رضیہ بیگم نے اس کی بات کی صحیح کرتے ہوئے مامون کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

”اچھا اماں، کرلوں گی بات ابھی تو مجھے سونے دیں۔“ اس نے ان کی ڈانٹ سے بچنے کے لئے ان کی بات مانتے ہوئے کہا۔

”نہ یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔ اٹھ کر کام ختم کر، نخواست پھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ رضیہ بیگم کو بھر جلال آ گیا سختی سے بولیں۔

”کام ختم کر تو لیا ہے، جھاڑو پوچھا، ڈسٹنگ کر دی ہے بستر درست کر دیئے اب اور کون سا کام کروں؟“

”مامون کا کہہ اس گھر کا حصہ نہیں ہے کیا چار دن ہو گئے آج ٹوٹنے صفائی تک نہیں کی وہ کیا سوچے گا کسے گندے کمرے میں رہ رہا ہوں۔“

کے اس کا راستہ روک لیا۔ رانیہ نے اسے خوشخوار نظروں سے دیکھا۔

”کبھی پیار سے بھی دیکھ لیا کرو۔“

”جہیں بخار ہے۔“ رانیہ نے بے اختیار ہی میں پوچھا تھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”ہاں!“

”کب سے۔“

”جب سے جہیں دیکھا ہے۔“

”اچھا! تو یہ دوا ڈاکٹر سے کیوں لینے گئے تھے؟“ وہ طنزیہ لہجے میں پوچھنے لگی۔

”تم نے اپنے پیار کو مسیحا کی سے جو محروم کر رکھا تھا پھر مرنا کیا نہ کرتا۔“ مامون نے بخور

لہجے میں جواب دیا۔

”بکواس۔“ وہ جھلائی۔ ”میں نے غلطی کی جو یہاں صفائی کرنے چلی آئی، مجھے کیا معلوم

تھا کہ اس وقت شیطان بھی نازل ہو سکتا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میں شیطان نہیں ہوں رانیہ! بلکہ تمہارا قدر دان ہوں۔“ وہ تڑپ کر بولا تو اس نے تلخی

سے کہا۔

”آتے ہی تھپڑ دے مارا ایسے ہی ہوتے ہیں ناں قدر دان۔“

”آئی ایم سوری! تمہارے سامنے کھڑا ہوں چاہو تو بدلہ لے سکتی ہو۔ کیونکہ میں تب سے

بہت بے چین تھا، اب تک اس تھپڑ کا بہت افسوس تھا مجھے، چاہو تو یہ ہاتھ ہی تلم کہ دو جو تم پر غصے

میں، انجانے میں اٹھ گیا تھا۔“ مامون نے اس قدر عداوت کے احساس سے پُر لہجے میں کہا کہ اس کا

دل پگھل گیا۔ اس نے ایک نظر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور خاموشی سے سائیز سے نکل کر

چلی گئی۔ مامون سرور سا ہو کر مسکرانے لگا۔

”اماں! مامون کو بخار ہے، دوا لائے ہیں وہ ڈاکٹر سے چیک آپ کرا کے۔“ نیچے آ کر

اس نے رضیہ بیگم کو بتایا۔

”ہائے جیسی تو میں کہوں کہ بچہ نیچے کیوں نہیں آیا، وہ تو فجر کے وقت اٹھ جاتا ہے۔ بخار

تھا اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ اوپر ٹھنڈ بھی بہت ہوتی ہے، نہ کوئی میٹر ہے کہ سردی کا اثر کچھ کم ہو سکے وہ

تو کراچی کا پاس ہے، کراچی والوں سے اتنی سردی کہاں برداشت ہوتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں جا کے

ایک تو یہ جوڑوں کے درد نے الگ میٹر صیاں چڑھنے اترنے میں مشکل پیدا کر دی ہے۔“ رضیہ بیگم

نے نگر بندی سے کہا اور اوپر ہانے لگیں۔

”آپ کو تو بس اپنے اس لاڈلے کی فکر ہے، وہ کیا سوچے گا۔ اس کے اماں ابا کیا سوچیں

گئے، کر دیتی ہوں صفائی۔“ وہ جلتی ہوئی بستر سے اترتے ہوئے بولی تو انہوں نے ہدایت دی۔

”ممن میں بھی جھاڑو لگا دینا، وہ گیا ہوا ہے اس کے آنے سے پہلے ہی صفائی کر لے،

بعد میں اس کے سامنے جاتے ہوئے غزے کرے گی۔“

”جی اچھا، سارا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے موصوف نے۔“

کمرے میں جھاڑو پوچا لگانے کے بعد منہ ہاتھ دھویا اور اس کے کمرے کی ڈسٹنگ

کرنے لگی۔ مامون کی تمام چیزیں ترتیب سے رکھنے کے بعد وہ ڈسٹنگ کرتے ہوئے رائیگٹ ٹیبل

پر رکھی اس کی فریم شدہ تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ ایک وجیہ مرد تھا۔ سرخ و سفید رنگت، ڈارک

براؤن گھٹے سلی بال، ڈارک براؤن چمکدار آنکھیں پر کشش چہرہ اس پر مسکراتے احمر لب، دراز

قامت، کسرتی بدن کا مالک مامون ضیاء کسی شہزادے سے کم نہیں تھا۔ لڑکیاں اس کی مردانہ وجاہت

پر مرقی تھیں مگر رانیہ سوچ رہی تھی کہ کاش! اس خوبصورت مرد کی سیرت بھی اتنی ہی خوبصورت ہوتی،

یہ دل پھینک نہ ہوتا، کہ لڑکی دیکھتے ہی ڈانٹ لگا بولنے لگے۔“

مامون کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے ہلکا سا بخار تھا وہ اسی لیے دیر سے گھر سے نکلا تھا

اور آفس میں دو دن کی چھٹی کی درخواست دے کر ڈاکٹر سے چیک آپ کروا کے دوا خریدتا ہوا واپس

گھر آیا تھا اور اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر رانیہ پر پڑی جو اس کی تصویر پر اپنا آنچل

پھیرتے ہوئے اسے بخور دیکھ رہی تھی، وہ لمحے بھر کو ٹھنڈا پھر جانے کیوں مسکرایا۔ رانیہ عام سے

گھریلو جلیے میں بھی بے حد پُر کشش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کر

رہی تھیں۔

”اتنے غور سے میری تصویر میں کیا دیکھ رہی ہو؟“ مامون نے اپنے بھاری دلکش لہجے میں

سوال کیا تو وہ بری طرح شپٹا کر اس کی سمت دیکھنے لگی اور پھر اس کی مسکراہٹ سے گھبرا کر تصویر

واپس میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھ رہی تھی کہ اس تصویر کی آنکھوں میں شرم و حیا ہے کہ نہیں۔“

”پھر لی؟“ وہ دو قدم آگے چلا آیا اور دواؤں کا لفافہ میز پر رکھ دیا۔

”کیا؟“

”شرم و حیا“ وہ بولا

”ہونہ۔“ وہ سر جھٹک کر بولی اور کمرے سے جانے لگی تو مامون نے اپنا بازو آگے کر

وہ بھی اتنی صبح صبح۔“ رضیہ بیگم نے انہیں بٹھانے کے بعد مسکراتے ہوئے پوچھا تو رخسانہ مجید کہنے لگیں۔  
 ”بھئی ہم نے سنا ہے کہ سسلی کا بیٹا تمہارے ہاں آیا ہوا ہے اور تم لوگوں نے ہمیں بھٹک  
 تک نہیں پڑنے دی کہاں ہے وہ؟“

”اوپر ہے، ذرا طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسی لئے آج آفس بھی نہیں گیا۔“

رضیہ بیگم نے مسکرا کر بتایا رخسار مجید تیر لہجے میں بولیں۔

”طبیعت کیوں خراب ہو گئی اس کی، کیا کھلا پلا دیا بچے کو کہ وہ یہاں آتے ہی بیمار پڑ گیا۔“

”انہیں سردی لگی ہے۔“ رانیہ نے اپنا غصہ ضبط کر کے کہا۔

”سردی تو لگے گی ہی اوپر چھت پر پہنچا دیا اسے نیچے بندوبست کر دیجے، ورنہ ہمارے

ہاں بھیج دیجے، آخر ہمارا گھر بھی تو اس کے ماموں کا گھر ہے، اس کا حق ہے ماموں پر اور ہمارا حق

ہے اس پر۔ نام کیا ہے اس کا، ماموں ہے نا؟“ رخسانہ مجید تیزی سے بولتی چلی گئیں۔

دراصل وہ اپنی بیٹی کے لئے ماموں کو رام کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھیں،

ماموں کو اپنا داماد بنانا چاہتی تھیں۔ رضیہ اور رانیہ ان کی آمد کا سبب خوب سمجھتی تھیں۔

”اے تو بلاؤ نا اسے کیا ہم سے پردہ کرے گا وہ؟“

”رانیہ! جاؤ بھائی کو نکالاؤ، کہنا رخسانہ ممانی آئی ہیں اور ساتھ شبانہ بھی ہے وہ بہت خوش

ہو گا ان سے مل کے۔“ رضیہ بیگم نے رانیہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو رخسانہ مجید فوراً بول پڑیں۔

”ہم اس سے اوپر جا کر ہی مل لیتی ہیں۔“

”ممانی وہ سو رہے تھے، ویسے بھی وہ مہمانوں سے اپنے کمرے میں نہیں ملتے۔ میں جا کر

دیکھتی ہوں اگر جاگ رہے ہوں گے تو انہیں آپ کی آمد کی اطلاع کر دوں گی۔“ رانیہ نے سنجیدگی

سے کہا اور ان کا بگڑنا منہ دیکھ کر دل ہی دل میں مسکراتی ہوئی اوپر ماموں کے کمرے میں چلی آئی تو

اسے موجود نہ پا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ماموں! کہاں چلے گئے؟“ وہ آواز بولی تھی اور جواب بھی فوراً ملا تھا۔

”ماموں کہاں جا سکتا ہے، اب تم نے تو اس کے جانے کے تمام راستے ہی بند کر دیئے

ہیں۔“ ماموں نے اسے اپنے کمرے میں جاتے دیکھ لیا تھا جبکہ رانیہ اپنی دھن میں چلتی ہوئی صحن میں

دھوپ والی جگہ پر نگاہ دوڑائے بغیر ہی سیدھی کمرے میں چلی آئی تھی۔

”نیچے مجید ماموں کی بیگم اور بیٹی آئی ہیں آپ سے ملنے، یہی بتانے آئی تھی۔ اماں نے

نکالنے کے لئے کہا ہے۔“ رانیہ نے اس کی بات دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آنے کا مقصد

شام تک ماموں کا بخار مزید بڑھ گیا تھا۔ اتنی سردی میں اسے گرمی لگ رہی تھی کبھی کبھی  
 اوڑھ لیتا کبھی اتار پھینکتا، سب ہی گھبرا گئے تھے اس کی حالت دیکھ کر۔

اجعلی نے گیلیا کپڑا اس کے ہاتھوں اور چہرے پر پھیرا تا کہ گرمی کم ہو، اور رضیہ بیگم سے

ایسا ہی کرنے کی تاکید کی۔

”میں ڈاکٹر کو نکالا لاتا ہوں۔“ اجعلی نے نیچے آ کر رضیہ بیگم سے کہا اور ڈاکٹر کو لینے چلے گئے۔

”رانیہ جا بھائی کے پاس اور جیسے تیرے ابا نے کہا ہے ویسے کر مجھ سے بار بار میٹھییاں

نہیں چڑھی جاتیں۔“ رضیہ بیگم نے اسے کہا تو چونکہ ماموں کی حالت کی وجہ سے پریشان تھی اس

لئے انکار نہ کر سکی اور فوراً اوپر اس کے کمرے میں چلی آئی اور وہ بچنے پر سردائیں بانٹیں بے چینی

سے ہلا رہا تھا۔

وہ خاموشی سے رومال اٹھا کر اس کے چہرے پر پھیرنے لگی، ماموں مسکرا دیا اور اس کے

ہاتھ تھام لئے، وہ شیشا گئی دروازے کی سمت دیکھا کہ کہیں اماں ابانہ آ رہے ہوں۔ ماموں نے

آنکھیں موند لیں اور اس کے ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرنے لگا۔

”رانیہ، رانیہ۔“ ماموں مدھوشی کے عالم میں اسے پکار رہا تھا۔

”چپ کرو، اماں ابانے سن لیا تو، شرم نہیں آتی تمہیں، بیماری میں بھی چین نہیں ہے، میں

باز آئی تمہاری سیما کی ہے۔“ رانیہ غصے سے اسے دیکھتے ہوئے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر نے ماموں کا چیک آپ کیا، اسے 102 بخار تھا۔ اجعلی نے اسے دلہ کھلانے

کے بعد دوا کھلا دی۔ پھر وہ سو گیا تو سب نیچے آ گئے۔ مگر ماموں کی فکر بھی تھی کہ اگر وہ رات کو جاگ

گیا تو اس کی دوا کا خیال کون رکھے گا اسی خیال سے اجعلی اس کے کمرے میں جا کر سو گئے۔ صبح

تک اس کا بخار اتر چکا تھا مگر کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے دوا کھائی اور کمرے

سے باہر صحن میں رکھی کرسی پر آ بیٹھا جہاں صوب کی سنہری کرنیں اپنی نرم گرم شعاعیں چار سو پھیلا رہی

تھیں۔ وہ رانیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو بھاگتی تھی۔ اس کی روح

میں سما گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو اپنے سندرسپنوں سے سجا گئی تھی۔ اس کی بیماری نے اسے بھی

پریشان کر دیا تھا۔

☆☆☆

رخسانہ مجید اپنی بیٹی شبانہ کے ساتھ ”اجمل ہاؤس“ آئی تھیں۔

”بھابھی! خیریت ہے نا آج اتنے مہینوں بعد ہمارے گھر کا رستہ کیسے بھول گئیں، آپ اور



بیان کیا۔

”ٹھیک ہے، تم چلو میں آتا ہوں۔“ مامون نے جواب دیا تو وہ سر ہلا کر واپس جانے لگی، مامون دروازے کی چوکت پر کھڑا تھا۔

رانیہ کے قریب آنے پر ایک طرف ہو گیا مگر جو بی رانیہ گزرنے لگی اس نے اس کے آگے پیچھے اپنے ہاتھ چوکت پر رکھ کر اس کا راستہ مسدود کر دیا اور پھر اس کی بے باک اور شرارت بھری جسارت پر رانیہ کے رخسار دھک اٹھے۔ یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ کسمسا کر غصے سے بولی۔

”یہ اس تھپڑ کا کفارہ ہے اور اس میحائی کا شکریہ ہے جو تم نے دن بھر کی تھی، آئی لو یو رانیہ، آئی رنٹی لو یو، تم میری زندگی ہو، روح ہو راحت ہو، اب کوئی دوسرا تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتا، تم صرف میری ہو، صرف میری۔“ مامون نے اس کے حیا کی لالی اور غصے کی حدت سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا اور اس سے پہلے خود ہی نیچے چلا گیا اور رانیہ وہیں حیران، پریشان اور غصے سے بھری کھڑی رہ گئی۔

”مامون بیٹا! کچھ دن اپنے ماموں کے گھر بھی آ کر رہ لو، کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟“ رخسانہ مجید نے اسے دیکھتے ہوئے لگاؤ سے کہا۔

”آئی! یہ بات نہیں ہے، دراصل میں یہاں کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ صبح گھر سے نکلتا ہوں تو شام کو لوٹتا ہوں، انشاء اللہ کسی روز آؤں گا آپ کی طرف بھی۔“ مامون نے نرمی سے جواب دیا۔

”یعنی آپ ہمارے گھر رہنے کے لئے نہیں آئیں گے۔“ شبانہ نے بڑی ادا سے کہا۔ فل میک آپ اسٹائلش لباس میں وہ اسے مرعوب و مائل کرنے کے ارادے سے آئی تھی۔ رخسانہ مجید بھی یہی چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹیوں بیٹیوں میں سے کسی ایک کو تو مامون پسند کر ہی لے تو مزے آجائیں گے وہ بھی اوبے۔ یاد ادا ملنے پر اتر آیا کریں گی۔

”میں آپ کو گوارا نہ دیتا چاہتا، یہاں آرام ہے، تنہائی ہے، خاموشی ہے، میں سکون سے اپنا کام کرتا ہوں۔ آپ جتنا میری وجہ سے بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا، جو میں نہیں چاہتا۔“ مامون نے مہذب سب سے طریقے سے جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”ارے بیٹھو بیٹا، کہاں چل دیئے؟“ رخسانہ مجید نے فوراً کہا۔

”آئی پلیز! آپ مائنڈ مت کیجئے گا میری طبیعت خراب ہو رہی ہے، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں، انشاء اللہ سنڈے کو آپ کی طرف ضرور آؤں گا۔“ مامون نے نرم اور مہذب لہجے

میں جواب دیا۔

”ضرور آنا، ہم انتظار کریں گے۔“ رخسانہ مجید نے تاکید کی۔

”جی ضرور اچھا خدا حافظ!“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

پھر رخسانہ مجید اور شبانہ بھی مزید نہیں رکیں اپنے آنے کا مقصد پورا ہوتے ہی واپس چلی گئیں۔

”مجھے لگتا ہے اس کلمو ہی رانیہ نے مامون کو قابو میں کر لیا ہے، جیسی تو وہ تمہاری طرف دیکھنے سے بھی کتر رہا تھا۔ حالانکہ تم رانیہ سے زیادہ حسین ہو، گوری چٹنی ہو، اس کا تو رنگ ہی کالا ہے۔“ گھر آتے ہی رخسانہ مجید نے اپنی بھڑاس نکالتے ہوئے شبانہ سے کہا۔

”تو یہ کریں امی، رانیہ کا رنگ کھلتا ہوا گندمی سا ہے، اتنی اٹریکشن ہے اس کے چہرے میں کہ سچ اگر میں لڑکا ہوتا تو رانیہ کو اپنی دلہن بناتی۔“ سب سے چھوٹی رانیہ کی ہم عمر رومانہ نے مسکرا کر کہا تو ڈپٹ کر بولیں۔

”چپ بے شرم، میں اپنے گھر میں کسی غریب سی لڑکی کو دلہن بنا کر نہیں لانے والی ہاں، اور تو تو ہمیشہ رانیہ کی حمایت میں ہی بولا کر۔ اپنی فکر کرو تم بیٹیوں، مامون سنڈے کو آنے کا کہہ رہا تھا، ذرا ڈھنگ سے تیار ہونا کسی ایک کو تو وہ پسند کر ہی لے گا۔“

”رانیہ نے کوئی بناؤ سنگھار نہیں کر رکھا تھا، عام سے کپڑے پہن رکھے تھے، بھلا مامون جیسا امیر گھر کا لڑکا ایسی لڑکی کو کیوں پسند کرے گا اور پھوپھی بھی تو رانیہ سے کہہ رہی تھیں کہ بھائی کو نکالاؤ، وہ بھی بھائی ہی کہتی اور سمجھتی ہو گی مامون کو۔“ شبانہ نے کہا۔

”جو بھی سمجھتی ہے سمجھا کرے، مامون یہاں سے ہو کر چلا جائے پھر میں اس کی ماں کو فون کروں گی اور طریقے سے بات اس کے کان میں ڈال دوں گی۔“ رخسانہ مجید نے بیزاری سے کہا تو وہ بیٹیوں مسکرانے لگیں۔

سنڈے کو مامون مجید غفار اور رخسانہ مجید کے گھر پہنچا تو اس کا بہت گر بخوشی سے استقبال کیا گیا تھا۔ رخسانہ مجید تو اس پر صدقے واری جاری تھیں اور وہ حیران حیران سا انہیں دیکھ اور سن رہا تھا۔ مجید مامون بہت کم بولتے تھے۔ ان کی کمی بھی رخسانہ مجید ہی پوری کر رہی تھیں۔ شبانہ، شاہانہ اور رومانہ بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھیں۔ جیسے کسی فیشن شو میں شرکت کے لئے جا رہی ہوں، ان کے دونوں بھائی، حمید اور نوید بھی مامون کو کمپنی دے رہے تھے۔ مامون کو اپنی اس قدر پذیرائی کی وجہ بھی جلد ہی معلوم ہو گئی کیونکہ رخسانہ مجید اپنی بیٹیوں کے سلیقے کی ان کی خوبیوں کی کہانی بار بار سنارہی



سب کی صورتوں کو بغور دیکھا تھا اور خوب جھٹاٹھا تھا بلکہ واپسی پر اس نے بطور خاص تینوں بہنوں کی سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے دعا بھی دی تھی اور رخسانہ مجید کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

”بیٹھے بٹھائے دو ہزار روپے کی چوٹ لگ گئی اور مامون میاں دو تین سو روپے کا کیک لا کر دو چار نوالے کھا کے جاتے ہوئے لڑکیوں کو نہیں کہہ کر ان کے سر پر دست شفقت دھر گئے۔ خیر میں ہار مانتے والی نہیں ہوں، رانیہ کا جادو نہیں چلے دوں گی اس پر۔“ رخسانہ مجید غصے سے بولتے ہوئے کباہوں پر ہاتھ صاف کرنے لگیں۔

مامون خاصہ بیزار ہوا تھا مجید مامون کے گھر جا کر ”امجد ہاؤس“ واپسی پر اس کی ساری بیزاری دور ہو گئی چونکہ اسے وہاں اپنی اولین محبت و چاہت رانیہ کی معصوم اور دلکش صورت زندگی کا احساس دلانے کے لئے موجود تھی۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا۔ رانیہ صحن میں رکھے گلوں کو پانی دے رہی تھی۔

”ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“ مامون نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے اس کے پاس آ کر آہستگی سے کہا۔

”دعوت پر گئے تھے انہوں نے چائے نہیں پلائی کیا؟“ وہ شاہر بند کر کے رکھتے ہوئے بولی۔

”انہوں نے تو میز پر انواع و اقسام کے کھانے جن رکھے تھے، مگر کچ پوچھو تو میں ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھاسکا، کچھ عجیب سی نہیں ہیں یہ رخسانہ آئی۔“ مامون نے سنجیدگی سے بتایا۔

”جہاں نہیں۔“ رانیہ نے یہ کہتے ہوئے جگن کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا تھا مگر اسی وقت اس نے رانیہ کا ہاتھ تمام لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ رانیہ ایک دم سے جیسے ہوش میں آ گئی۔

”یہ محبت ہے جس کی مسیحا کا لیس ہر تکلیف مٹا دیتا ہے۔“ وہ محبت سے بولا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ بدتمیز آدی۔“

”یہ ہاتھ تو میں نے اب زندگی بھر تھامے رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”یک طرفہ فیصلہ۔“ وہ سلگ کر بولی۔

”انشاء اللہ یہ فیصلہ دو طرفہ ہوگا رانی جان۔ میری ٹریننگ مکمل ہوتے ہی جاب ہو جائے گی، زبردست سیکری دوکمر اور گاڑی بھی ملے گی۔ یہ جاب نہ بھی رہے گی تو بھی میرے نام ٹیکسری ہے، گاڑی ہے، میں تمہیں بہت آرام اور راحت سے رکھوں گا۔“ وہ نرم اور دھیمے لہجے میں بولا اسے نروس کر رہا تھا۔

تھیں اور کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے کھانے چنے دیکھ کر مامون حیران رہ گیا۔

”مامون بیٹا یہ کباب لو، یہ شبانہ نے خاص ترکیب سے تمہارے لئے بنائے ہیں۔“

رخسانہ مجید نے کباہوں کی پلیٹ ان کی جانب بڑھا کر کہا تو شبانہ نے بڑی ادا سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”شکریہ آئی!“ مامون نے ایک کباب اٹھالیا۔

”یہ چکن تو رمد میری شاہانہ نے بنایا ہے، لو کھا کر دیکھو، بہت ذائقہ ہے میری شاہانہ کے ہاتھ میں۔“ دوسری ڈش اس کی جانب بڑھا کر اب کی بار شاہانہ کو سراہا گیا، حالانکہ سوائے بریانی اور روٹی سلا دو غیرہ کے تمام لوازمات ہوٹل سے کپے پکائے منگوائے گئے تھے۔

”بس آئی! بہت کھالیا، آپ نے ناحق اتنا تکلف کیا، میں تو ابھی تازہ تازہ بیماری سے اٹھا ہوں، پر میز پر کھانا کھا رہا ہوں، اتنی مرغین اور مصلے دار چیزیں کھا کر تو میں پھر سے بیمار پڑ جاؤں گا۔“ مامون نے ان کی نیت کو بھانپتے ہوئے ایک دم سے بیزار ہوتے ہوئے بمشکل نرم اور مہذب لہجے میں کہا۔

”لو بھلا کھانے سے بھی کوئی بیمار پڑتا ہے، صبح سے شام تک کام کرتے ہو، کھاؤ پیو گے نہیں تو طاقت کیسے آئے گی۔ اچھا لو یہ فرنی تو کھاؤ اس سے تمہاری صحت پر بُرا اثر نہیں پڑے گا۔“

یہ رومانہ نے بڑے شوق سے بنائی ہے تمہارے لئے۔“ رخسانہ مجید نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور فرنی کا ڈونگہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ مجبوراً مامون نے دو چھ فرنی چکھ لی۔

”آئی! تمام چیزیں تمام ڈشز بہت مزیدار تھیں۔“

”تو بیٹا لو تا تم نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔“ وہ خوش ہو کر بولیں۔

”شکریہ آئی میرا آپ سے وعدہ تھا اس لئے میں چلا آیا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنا اہتمام کر لیں گی تو میں آپ کو پہلے ہی منع کر دیتا بہر حال بہت بہت شکریہ۔“ مامون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کو سب سے زیادہ کون سی ڈش پسند آئی ہے۔“ شبانہ نے پوچھا۔

”بھئی تمام ڈشز ہی بہت مزیدار تھیں کسی ایک کی تعریف کر کے میں باقی دو بہنوں کی دل آزاری نہیں کر سکتا۔ میری تینوں بہنوں نے ہی بہت مزیدار پکوان تیار کئے ہیں شاہانہ۔“ مامون نے دانستہ بہنوں کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کہا تو جہاں رومانہ کی ہنسی بے ساختہ نکلی تھی وہاں رخسانہ مجید، شبانہ اور شاہانہ کے چہروں پر اترنے والی بیزاری اور شرمساری بھی بر محل تھی۔ مامون نے ان

”مجھے اپنی دولت سے مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو۔“

”تو اپنی محبت سے مرعوب کرنے کی کوشش کروں۔“ وہ شرارت سے کہتے ہوئے بولا۔  
”پیچھے ہٹو۔“

”میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”ہونہ، بہت دیکھے ہیں تم جیسے محبت کے دعوے دار۔“ رانیہ نے مذاق اڑایا۔

”میری بات سچی ہے، ایک دن تم جان لو گی، تم پر ثابت ہو جائے گا کہ میں تم سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں۔“

”لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی، میں صرف اس شخص سے محبت کروں گی جس سے میری شادی ہو گی اور وہ تم نہیں ہو گے۔“ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چمڑایا۔

”وہ شخص میرے سوا کوئی اور بھی ہرگز نہیں ہو گا، میں تمہیں کسی اور کی ہونے نہیں دوں گا، تمہاری نفرت کو اپنی محبت میں بدل کر رہوں گا۔“ وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے یقین اور اٹل لہجے میں بولا۔

”ایسا اظہار نکاح کے بعد ہی اچھا لگتا ہے مامون خیاں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”تو تم نکاح کے لئے تیار ہو؟“ وہ شریہوا۔

”شٹ آپ!“ وہ جھلا کر بولی اور وہاں سے چلی گی۔

رات کو مامون نے اپنے موبائل فون سے اپنے گھر فون کیا اور اپنی مامی کو رانیہ کے لئے اپنی پسندیدگی کا احوال کہہ سنایا، انہیں کوئی اعتراض نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ ڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی۔

”مئی! آپ کا تعلق بھی تو ڈل کلاس سے تھا نا، ڈیڑی سے شادی کے بعد آپ کا اسٹیشن ہاؤس ہوا ہے پھر رانیہ کے معاملے میں آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں، وہ بہت شاندار اور باوقار لڑکی ہے۔

خالہ جان اور انکل بھی بہت ناگس ہیں، کوئی بناوٹ، دکھاوا اور غرض شامل نہیں ہے ان کے خلوص میں، بس میں نے کچھ دیا ہے، میری شریک حیات صرف رانیہ ہی بنے گی، ورنہ کوئی نہیں۔

آپ کو خالہ اور انکل سے ہماری رشتے کی بات کرنا ہو گی۔“ مامون نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ہار مانتے ہوئے بولیں۔

”اچھا بابا اگر لیں گے تمہارے رشتے کی بات لیکن دس بارہ روز تک تو ہم بالکل فارغ نہیں ہیں، یہاں کئی شادیوں کا اہتمام کرنا ہے، اس کے بعد انشاء اللہ تمہاری شادی کی تیاری شروع کر دیں گے۔“

”اوجھنک یومی آئی لو یومی۔“ وہ خوش ہو کر بولا تو وہ ہنس پڑیں۔

”آئی لو یو مائی سن او کے اللہ حافظ۔“ دوسری جانب سے فون بند ہو گیا تو مامون خوشی خوشی سونے کے لئے لیٹ گیا۔

☆☆☆

رانیہ کا بہت اچھا رشتہ آیا تھا، لڑکا بینک منیجر تھا، دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا، بینکس، شاپنگ، شہہ تھیں، باپ کا انتقال ہو چکا تھا، ماں حیات تھی۔ انہیں امجد علی کے دوست نے امجد علی کے گھر کا راستہ دکھایا تھا۔ امجد علی لڑکے سے مل چکے تھے، انہیں لڑکا بہت پسند آیا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے لڑکے والوں کو گھر آنے کی اجازت دے دی تھی۔ رضیہ بیگم نے چائے کے ساتھ بہت سی چیزیں تیار کر لی تھیں، کباب اور چکن روٹز تو رانیہ نے بنا لئے تھے۔ مٹھائی، کیک اور سمو سے امجد علی بازار سے خرید لائے تھے۔ رانیہ نے رضیہ بیگم کی ہدایت پر نہا کر نیا جوڑا پہنا تھا۔ میرون شلوار قمیض پر چڑی کا دوپٹہ بالوں کی لمبی سی چٹیا بنائے آنکھوں میں کا جل سجائے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ شام کو امجد علی جلدی گھر آ گئے تھے۔ چار بجے ان لوگوں کو آنے کا کہا تھا اور ساڑھے چار بجے کے قریب وہ لوگ ”امجد ہاؤس“ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ لڑکے انور صغیر کی والدہ، دونوں بینیں اور انور صغیر کے بڑے بہنوئی ریاض پر مشتمل یہ قافلہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رانیہ خوشگوار احساسات، تیز حیرت و حیرتے دل اور شرم و حیا سے جھکی ہوئی نظروں میں رضیہ بیگم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی تو سبھی نے اسے دیکھ کر ماشاء اللہ کہا۔ رانیہ کو لڑکے کی والدہ نے اپنے پاس بٹھالیا۔

”بھئی ہم تو منگنی کی تاریخ لے کر ہی جائیں گے۔“ لڑکے کی ماں نے مسکرا کر کہا۔

”جیسے آپ کی خوشی بہن جی۔“ امجد علی نے خوش ہو کہا۔

”رانیہ کا بھائی کہاں ہے؟“ لڑکے کی ماں نے پوچھا تو وہ تینوں بیٹھا گئے۔

”ہماری رانیہ تو چاند کا ٹکڑا ہے۔“ انور صغیر کی بڑی بہن نے رانیہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کر کے دیکھتے ہوئے کہا تو رانیہ نے بے اختیار ہی پلکیں اٹھا کر سامنے دیکھا تھا جہاں مامون کھڑا تھا اور اس کی حالت ایسی تھی کہ ابھی گر جائے گا۔ دروازے کی چوکت کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے اس کی اٹھلیاں سفید ہو رہی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں اور ساعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رانیہ نے اس کی حالت دیکھ کر شرمندگی اور گھبراہٹ سے نظریں جھکا لیں۔

”مامون! آؤ بیٹا اندر آ جاؤ، اچھے وقت پر آئے، اپنی رانیہ کو دیکھنے کچھ لوگ آئے ہوئے

ہیں۔ ”امجد علی کی نظر مامون پر پڑی تو فوراً بولے۔

”السلام علیکم!“ مامون نے اعدا آتے ہوئے ان سب پر نگاہ ڈال کر مرے مرے لہجے میں سلام کیا، سب نے اسے بخور دیکھا۔

”وعلیکم السلام!“ سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔

”یہ ہیں رانیہ کے بھائی۔“ لڑکے کی بڑی بہن نے پوچھا۔

”جی ہاں رانیہ کا خالہ زاد بھائی ہے۔ میرا بیٹا تو دعویٰ میں ہوتا ہے۔“ رضیہ بیگم نے بتایا اور امجد کے ذکر پر ان کا دل تو بہت دکھا تھا۔

”آئی ہم تو چٹ مکتی اور پٹ پیاء کریں گے بس آپ ہاں کر دیں۔“ لڑکے کی دوسری بہن نے مسکراتے ہوئے کہا تو رضیہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔

”بیٹی جو اللہ کو منظور ہماری طرف سے تو ہاں ہی سمجھو۔“

”مبارک ہو!“ وہ سب خوشی سے بولیں اور مامون کے دل کا خون کر گئیں اور وہ اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھ اٹھا۔

”خالہ جان! میں ضروری فائل لینے آیا تھا مجھے دوبارہ آفس جانا ہے۔ اس لئے میں اجازت چاہوں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا خیر سے جاؤ۔“ رضیہ بیگم نے محبت سے کہا وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر سیدھا اوپر اپنے کمرے میں گیا تھا۔

”آپ کا یہ بھانجا کیا بیٹیں رہتا ہے آپ کے ساتھ؟“ لڑکے کی ماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بیٹی نہیں! مون تو کراچی میں رہتا ہے، وہیں بزنس کمر اور فیملی ہے یہاں تو آفس کے کام کو دو چار دن کے لئے آیا ہوا ہے۔“ رضیہ بیگم ان کی بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھیں سمجھداری سے بولیں۔

”اچھا!“ وہ مطمئن سی ہو کر سر ہلانے لگیں۔

”پھر مکتی کی تاریخ طے کر لیں میری بیٹیوں کے سسرال والے اور شہر میں جتنے بھی رشتہ دار موجود ہیں سبھی مدعو ہوں گے چالیس کے قریب تو ہو ہی جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، اتنے ہی مہمان ہماری طرف سے بھی ہوں گے تو پھر اگلے جمعے کی شام چھ بجے کا وقت رکھ لیتے ہیں۔“ امجد علی نے کہا۔

”یہ بہت مناسب رہے گا۔ بھائی صاحب مبارک ہو۔“ لڑکے کی ماں نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا تو رانیہ شرمناک روہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ یہ خوشی کا موقع تھا اور

وہ نجانے کیوں افسردہ ہو رہی تھی۔ اس کی نظروں میں مامون کی صورت گھوم رہی تھی۔ کیسے اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کس قدر یاسیت اور دکھ در آیا تھا۔ وہ بے چین سی ہو کر کمرے میں بیٹھنے لگی۔

”رانیہ تمہیں مامون سے نفرت ہے نا پھر اس کے لئے پریشان کیوں ہو رہی ہو؟“ رانیہ کے دل نے سوال کیا۔

”میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی اپنی وجہ سے کسی کو آزرہ نہیں کر سکتی، اس کے اعزاز مجھے بڑے لگتے تھے، وہ بہت بے باک ہے اپنی محبت کے اظہار میں مگر پتا نہیں وہ محبت بھی تھی کہ بخش وہ مجھے آزما رہا تھا، یہ امیر زادے دل لگی تو کر سکتے ہیں محبت ان کے بس کا روگ نہیں ہے لیکن مون کا میری مکتی کی خبر سن کر شک میں رہ جاتا یہ سب کیا ہے؟“

اس کے دماغ نے جواب دیا اور پھر خود ہی سوال بھی کر ڈالا وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد رضیہ بیگم رانیہ کے کمرے میں آئیں تو بہت خوش نظر آ رہی تھیں، اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

”بیٹا مامون کو بھی چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو دے آؤ وہ اوپر ہی ہے اپنے کمرے میں۔“

”اماں! میں ابھی شادی نہیں کروں گی، مجھے ابھی بہت آگے تک پڑھنا ہے، ایم ایس سی کرنا ہے، کالج میں لیکچرار بننا ہے، اتنی جلدی شادی کر کے میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گی۔“ وہ ان کے ہاتھ تھام کر بے چینی و بے قراری سے بولی۔

”بیٹا! انہیں کونسا تم سے نوکری کروانی ہے ماشاء اللہ اچھا کھاتا ہے لڑکا، میاں بیوی اور ساس ہی تو ہوگی، مزے سے رہو گی اتنا اچھا رشتہ پھر نہیں ملے گا اور ضرورت کیا ہے مزید پڑھنے کی۔

بی ایس سی کر لیا ہے بہت ہے اب گھر داری سنبھالنے کی فکر کرو۔“ رضیہ بیگم نے نرمی سے سمجھایا مگر دل نہیں سمجھ رہا تھا۔ دل بے کل اور بوجھل ہو رہا تھا۔

”اماں! مجھے ڈر لگ رہا ہے پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟“ وہ پریشانی سے بولی دماغ میں مامون کی صورت اور باتیں گھوم رہی تھیں۔

”خواہ خواہ کے دوسرے دل میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے ابا نے سب پتا کر دیا ہے، لڑکا بہت نیک اور شریف ہے۔ اچھا خاندان ہے اور کیا تم نہیں چاہتیں کہ ہم جلد از جلد تمہارے فرض سے سکندوش ہو جائیں اور سکون سے مر سکیں۔“ رضیہ بیگم نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ

ترپ کر بولی۔

”اللہ نہ کرے اماں، آپ کو اور ابا کو کچھ ہوائی باتیں نہ کریں اماں۔“



”ارے بچی! یہاں تو تندرست انسان کی زندگی کا بھروسہ نہیں ہے اور ہم تو پھر بیمار ہیں، کیا خبر کس گھڑی بلاوا آجائے۔ تیرے بھائی کی جدائی نے تو ہمیں ادھ موا کر کے رکھ دیا ہے۔ تجھے محفوظ ہاتھوں میں سوئپ دیں گے تو تیری فکر تو ختم ہوگی اب ہمارے دل بہت کمزور ہو گئے ہیں، کوئی صدمہ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ خوشی ہی شاید دل کو سکون دے دے۔ بس تو فکر نہ کر اللہ نے تیرا نصیب اچھا ہی لکھا ہوگا۔ میری رانیہ انشاء اللہ رانی بن کر راج کرے گی اپنے گھر پر بھی اور شوہر کے دل پر بھی۔“ رضیہ بیگم نے اسے گلے لگا کر بھیگتی آواز میں کہا تو وہ افسردگی سے مسکرا دی۔ رانیہ چائے کے ساتھ چکن روٹز کباب اور مٹھائی ٹرے میں رکھ کر مامون کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ اس کا اپنی منگنی کے حوالے سے رد عمل دیکھنا اور سننا چاہتی تھی اس لئے چلی آئی۔ مامون بیڈ پر نیم دراز بازو آنکھوں پر رکھے ہوئے تھا۔ رانیہ نے ایک نظر اسے دیکھا پھر ٹرے میز پر رکھی تو آہٹ سن کر مامون نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا، جانے کیا تھا اس کی آنکھوں میں کہ رانیہ جیسی مضبوط اعصاب کی لڑکی کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ وہ نظریں چرا کر جانے لگی تو اس نے تڑپ کر پکارا۔

”رانیہ.....“

اور رانیہ کے قدم خود بخود ساکت ہو گئے۔ اس نے گردن گھما کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا اور بغور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مدھم اور جھکے جھکے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

”کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں اعتبار نہیں کیا میرے پیار کا؟ کیوں کسی اور کے نام کی الجھنی پہننے کے لئے راضی ہو گئیں تم، بولو؟“

”کیونکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور نہ ہی میں نے تم سے کوئی عہد وفا باندھا تھا جو میں تمہاری پابند ہو جاتی اور اماں ابا کے سامنے اس رشتے کا انکار کر دیتی۔“ رانیہ نے ہمت کر کے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تم میری ہو رانیہ میں نے تم سے کہا تھا نام صرف میری ہو، ٹھیک کہا تھا اس خاتون نے کہ تم چاند کا ٹکڑا ہو، یعنی میرا ٹکڑا ہو مامون کا ٹکڑا۔ حصہ ہو میرے وجود کا، میں کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا رانی، میں یہ منگنی نہیں ہونے دوں گا۔ اگر یہ منگنی ہوگئی تو ختم کرا دوں گا تمہارے ہاتھوں پر صرف میرے نام کی مہندی بچے گی، سنا تم نے، تم صرف میری دہن بنو گی۔ کسی اور کے لئے ہاں کرنے سے پہلے سوچ لینا رانیہ علی کہ مامون ضیاء کا قتل تمہارے سر ہوگا۔“ وہ اسے شانوں سے پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا تو وہ اندر سے ڈر گئی۔

”پاگل پن کی باتیں مت کرو، میں وہی کروں گی جو میرے باپ چاہیں گے۔“ وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولی۔

”تمہارے ماں باپ بھی وہیں چاہیں گے جو میں چاہتا ہوں میں نے می سے بہت دن پہلے تمہارے متعلق بات کر لی تھی۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے، اس رشتے پر میں کل شام کی فلائٹ سے کراچی جا رہا ہوں۔ می ڈیڈی کو ساتھ لے کر ہی آؤں گا اور تمہیں اپنے نام کرا کے ہی دم لوں گا۔“

”میں کوئی فیکٹری یا زمین کا ٹکڑا نہیں ہوں جو تم مجھے اپنا نام کروالو گے۔“

”تم تو چاند کا ٹکڑا ہو۔ میرے دل کا ٹکڑا ہو۔“

”سلٹی جیلے بولنے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے تمہیں ایڈیٹ۔“

”وہی کچھ بولو رانیہ ڈیر جس پر تمہیں بعد میں ندامت نہ محسوس ہو۔“ مامون نے سنجیدگی سے کہا تو وہ ”ہونہہ“ کہہ کر اسے پیچھے دھکیل کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

مامون کراچی پہنچ گیا تھا، پہلی فرصت میں اس نے سلٹی بیگم سے اپنی اور رانیہ کی شادی کی بات کی تو سلٹی بیگم نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”چھوڑو رانیہ کو میں نے تمہارے لئے جو لڑکی پسند کی ہے اسے دیکھو گے تو وہی تمہیں اپنے سہنوں کی رانی اور شہزادی لگے گی۔“

”مہی! میری زندگی صرف رانیہ ہے، میں کسی دوسری لڑکی کو اس نظر سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔“ مامون نے نہایت سنجیدہ اور اٹل لہجے میں ایمانداری سے کہا۔

”اور رانیہ جو گناہ کا کھیل کھاتی رہی ہے وہ تمہیں نظر نہیں آیا۔“

”مہی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ سناٹے میں آ گیا۔

”میں نے تمہیں وہاں بھیج کر ہی غلطی کی، مجھے کیا پتہ تھا کہ رانیہ بیگم میرے بیٹے پر ڈورے ڈالے گی۔ اسے اپنی اداؤں سے اپنی محبت کے جال میں پھنسا لے گی۔ بڑا لمبا اور اونچا ہاتھ مارنے کی کوشش کی ہے اس نے۔“

”مہی! اسٹاپ اٹ پلیز!“ وہ غصے سے چلا اٹھا۔ ”آپ کو اُس مصوم اور ہاکردار لڑکی کے متعلق ایسی نازیبا گفتگو کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہ مصوم تو کئی کئی دن میرے سامنے بھی نہیں آتی۔ میں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اس کی صورت دیکھنے کو ترس جاتا ہوں اور نہ ہی اس نے اس ڈیڑھ ماہ کے دوران مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی ہے۔ وہ تو صرف کھانے کے لئے



مجھے بلانے آتی تھی، میں ہی اسے روک کر بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ امیر زادوں سے نفرت کرتی ہے کیونکہ اس کا بھائی بھی دولت کمانے دئی گیا تھا اور پھر ان لوگوں کو بھول گیا۔ اُسے تو میرا اپنے گھر میں آنا اور رہنا بھی سخت ناپسند ہے، وہ بھلا مجھے کیوں ادا نہیں دکھائے گی۔ وہ تو اتنی معصوم اور سن موٹی ہے کہ دل و روح خود بخود اس کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔ وہ مجھ سے گریز کرتی ہے۔ مجھے نظر انداز کرتی ہے۔ میری صورت سے بھی بیزار رہتی ہے مگر اس لئے تو وہ مجھے اور زیادہ اچھی لگتی ہے، کیونکہ اس میں لالچ نہیں ہے۔ خود غرضی اور بناوٹ نہیں ہے۔ میں اسے اپنی محبت سے جیت لوں گا۔ آپ میرے ساتھ اس کے گھر تو چلیں، بات تو کریں خالہ خالو سے۔“ وہ سنجیدگی سے رانیہ کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے بولا۔

”یہی مصومیت تو اس کا ہتھیار ہے، خوب اُلو بنایا ہے اس نے تمہیں۔ میں تمہیں ایسی چلن لڑکی سے کبھی نہیں بیاہوں گی، محلے بھر کے لڑکوں سے تو اس کی دوستی اور دل لگی رہ چکی ہے۔“ سلسلی بیگم نے غصے سے کہا۔

”جھوٹ ہے، یہ بکواس ہے سب، نبھانے کس نے آپ کو اس معصوم کے خلاف بھڑکایا ہے۔ پہلے جب میں نے بات کی تھی تب تو آپ راضی ہو گئی تھیں، پھر دس پارہ دن کی بجائے بیس دن ہو گئے آپ نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی یا تو آپ پہلے ہی رانیہ کو اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتی تھیں اور مجھے ٹال رہی تھیں یا پھر ضرور کسی کی باتوں میں آکر آپ اس با کردار اور بہادر لڑکی کی کردار کشی پر اتر آئی ہیں۔ معاملہ جو بھی ہے میں رانیہ سے کسی صورت دستبردار نہیں ہوں گا، یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔“ وہ غصے اور جوش سے بولا۔

”دیکھا کیسا بہکایا ہے میرے بیٹے کو اس کلمہ ہی نے۔ اب ماں کے سامنے زبان چلا رہا ہے، ماں کو جھوٹا کہہ رہا ہے اور جب اس کی منقہ طے ہو چکی ہے تو ہم کیوں بات کریں جا کر، بھول جاؤ اسے۔“ سلسلی بیگم نے غصے سے کہا تو اس نے دلگیر لہجے میں سوال کیا۔

”آپ بھول سکتی ہیں مجھے؟“

”دیکھی بات کر رہے ہو تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو، میں کیسے بھول سکتی ہوں تمہیں۔“ سلسلی بیگم نے بے قرار ہو کر جواب دیا۔

”تو رانیہ بھی میرے دل کا ٹکڑا ہے، میری محبت ہے میں کیسے بھول سکتا ہوں اسے۔“

مامون نے بہت جذب سے کہا۔

”اس جیسی ہزار مل جائیں گی تمہیں۔“

”ہزار ضرور مل جائیں گی مگر اس جیسی کوئی دوسری نہیں ملے گی۔“  
”دیوانے ہو گئے ہو تم تو۔“ سلسلی بیگم مزید برہم ہو کر بولیں۔

”ہاں میں مانتا ہوں، بس آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ اور ڈیڈی میرا رشتہ لے کر رانیہ کے گھر جا رہے ہیں یا نہیں؟“  
”نہیں!“ سلسلی بیگم نے فوراً صاف انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے مہی، میرا فیصلہ بھی دوبارہ سن لیجئے، رانیہ نہیں تو کوئی دوسری بھی نہیں، اب میں جانوں اور میری قسمت، آپ سے کچھ نہیں کہوں گا میں۔“ مامون نے نرم مگر سنجیدہ لہجے میں کہا اور باہر جانے لگا تو ضیاء الدین کو دروازے میں کھڑے پایا، وہ ان دونوں کی ساری باتیں سن چکے تھے۔ انہیں مامون کی خوشی عزیز تھی مگر جو کچھ وہ اپنی بیوی کی زبان سے سن چکے تھے اس نے انہیں بھی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

”خدا حافظ ڈیڈی!“ مامون انہیں دیکھ کر کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

”سلسلی بیگم آپ اس بچی رانیہ سے نہ ملی ہیں نہ اس کو قریب سے دیکھا ہے پھر آپ کیسے اسے بدکردار کہہ سکتی ہیں اور مامون گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ان کے ہاں مقیم ہے، اس نے رانیہ کو قریب سے دیکھا ہے، وہ اسے جانتا ہے، جیسی تو وہ اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔“ ضیاء الدین نے اندر آکر سلسلی بیگم کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولیں۔

”وہ تو باؤلا ہو گیا ہے، اسے تو ہر لڑکی سے پیار ہو جاتا ہے۔“

”غلط، بالکل غلط اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک آپ کی پسند کی جانے والی لڑکیوں سے بھی عشق فرما چکا ہوتا اور کسی سے شادی بھی کر چکا ہوتا مگر اس نے تو انہیں بغور دیکھنا بھی پسند نہیں کیا۔ مامون نے رانیہ سے محبت کا دعویٰ کیا ہے اس لڑکی میں کچھ تو ایسا ہوگا نا جو ہمارے بیٹے کے من کو بھانگی ہے۔ سلسلی بیگم! بڑے بیٹے کی شادی میری بیٹی سے ہوئی ہے اور جھوٹے بیٹے کی شادی آپ اپنی بھانجی سے کرادیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس طرح دونوں خاندانوں سے مستقبل میں بھی رشتہ جڑا رہے گا۔“ ضیاء الدین نے نرمی سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”لیکن میں رانیہ کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گی، مامون جذباتی ہو رہا ہے جب اس کی اصلیت جان جائے گا تو خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا اور رانیہ کی منقہ طے ہو رہی ہے، جسے کوہم کیوں وہاں جا کر رنگ میں بیٹھ ڈالیں۔“ سلسلی بیگم نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”سلسلی بیگم! سوچ لیں جو کچھ آپ رانیہ کے متعلق کہہ رہی ہیں اگر وہ جھوٹ اور الزام ہوا

”مامون سنبالو خود کو جو لڑکی تم سے نفرت کرتی ہے تم اس کے لئے خود کو روگ کیوں لگا رہے ہو؟“ دماغ نے سمجھایا۔

”نہیں وہ مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی وہ تو کسی سے بھی نفرت نہیں کر سکتی۔ بس چڑتی ہے، میں نے بھی تو اسے خوب تنگ کیا تھا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں تو اس سے ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔“

”امجد ہاؤس“ میں خاندان اور محلے کی عورتوں کا تنگٹھکانا لگا ہوا تھا۔ رخسانہ مجید بھی اپنی بیٹیوں بیٹیوں کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔ مجید مامون بھی بھانجی کی معشوقہ میں خوشی خوشی شریک تھے۔ رخسانہ مجید کو تو آگ لگ رہی تھی کہ ان کی بیٹیاں بیٹیاں ہیں اور رانیہ ان سے چھوٹی ہونے کے باوجود معشوقہ شدہ ہو گئی ہے اور وہ بھی بچیاں ہزار کی تنخواہ والے اکلوتے بیٹے کا رشتے ملا تھا اسے۔ جب سے انہوں نے رانیہ کی معشوقہ طے ہونے کا سنا تھا تب سے وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھیں اور ایک تیر سے دو ٹکار کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ معشوقہ کی رسم دھوم دھام سے ادا ہوئی تھی۔ رانیہ گلابی شرابہ سوٹ میں بہت ہی حسین لگ رہی تھی۔ مامون کو موجود نہ پا کر اور اس کے رضیہ بیگم کی زبانی کراچی جانے کا سن کر رخسانہ مجید کو دلی مسرت ہوئی تھی۔ سب مہمان کھانا کھا رہے تھے جب رخسانہ مجید رانیہ کی ہونے والی ساس بیگم صغیر کے قریب چلی آئیں جو بڑی رغبت سے بریانی اور چکن تورمہ کھا رہی تھیں۔ رخسانہ مجید سے ان کا تعارف ہو ہی چکا تھا۔

”مجھے تو رانیہ کی قسمت پر رشک آ رہا ہے، بہن، ورنہ ایسی لڑکی کو کوئی شریف خاندان کیوں قبول کرنے لگا۔ سچ کہتی ہوں بڑا دل ہے آپ کا جو رانیہ کی لغزشوں پر پردہ ڈال کر اسے اپنی بہو بنانے جا رہے ہیں اور وہ بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے۔ آپ نے ایسی چالاک لڑکی پسند کی ہے خیال رکھیے گا بہن کہیں رانیہ آپ کے بیٹے کو ہی نہ لے اڑے۔“

رخسانہ مجید نے بیگم صغیر کے قریب ہو کر بہت آہستگی سے زہرا لگا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا، کیسی لڑکی ہے رانیہ؟“ بیگم صغیر کھانا بھول گئیں اور پریشان ہو کر پوچھنے لگیں۔

”میں تو آپ کے بھلے کو بتا رہی ہوں، وعدہ کریں میرا نام سچ میں نہیں آئے گا۔ سمجھا کریں ناں رشتے داری کا معاملہ ہے۔“ رخسانہ مجید نے آہستگی سے کہا تو وہ تیزی سے بولیں۔

”آپ بے فکر ہو کر بتائیں آپ کا نام نہیں آئے گا۔“

”دراصل رانیہ کا کردار اچھا نہیں ہے، محلے کے ہر لڑکے سے تو اس کا پکڑ پکڑ چکا ہے۔ اب آپ تو جانتی ہیں ناں کہ یہ آج کل کے لڑکے ایسی لڑکیوں سے صرف دل لگی کرتے ہیں۔ شادی

تو آپ اپنے بیٹے کو کھو دیں گی۔ جانتی ہیں ناں مامون کو، اس نے آج تک ہمیں کسی معاملے میں پریشان اور شرمسار نہیں ہونے دیا کوئی ایسا کام یا فیصلہ نہیں کیا جس سے ہمارا سر تنکھ گیا ہو۔ وہ بہت سمجھدار اور ذہن کا پکا ہے۔ اگر اس نے کہا ہے کہ وہ رانیہ کے سوا کسی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا تو لکھ لیجئے کہ وہ اپنے کہے پر عمل کر کے دکھائے گا تب کیا آپ اپنے بیٹے کو تنہا اور آزرده دیکھ کر خوش رہ سکیں گی؟“ ضیاء الدین نے سنجیدگی سے کہا تو وہ لاجواب ہو کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

مامون کو اپنی کمپنی کی طرف سے گھر کی سہولت ملی ہوئی تھی مگر وہ رانیہ کو دیکھنے کی چاہ میں ”امجد ہاؤس“ میں رکا ہوا تھا۔ اب جبکہ رانیہ کسی اور کے نام سے منسوب ہونے جا رہی تھی تو اس نے کمپنی کے گھر میں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کراچی سے سیدھا لاہور ہوئی آیا تھا اور اگلے روز اپنے گھر کی چابیاں لے کر اپنا سامان وہیں لے گیا تھا۔ ”امجد ہاؤس“ میں اس کا کچھ سامان موجود تھا لیکن وہ اس قدر دہکی اور دلگیر تھا کہ وہاں جانے کا حوصلہ نہیں کر سکا۔ اس کو اپنی ماں کی بدگمانی اور رانیہ کے متعلق رائے اور رویے نے بہت مایوس اور دل برداشتہ کر دیا تھا۔ رانیہ کو تو وہ اپنی محبت سے اپنا اسیر بنا لینے کا یقین رکھے ہوئے تھا لیکن وہ اپنی ماں کو کیسے منانا کس طرح سمجھاتا کہ رانیہ کے متعلق ان کی سوچ غلط ہے۔ وہ خود سے رانیہ کے والدین سے اپنے رشتے کی بات بھی نہیں کر سکتا تھا کہ نہ اس کے والدین اس کے ساتھ تھے اور اب جبکہ اس کی معشوقہ طے ہو چکی تھی تو رانیہ کے والدین مامون کے پروپوزل اس کے می ڈی کی رضا مندی کے بغیر کسی صورت قبول نہ کرتے۔ یہی بے بسی کا احساس مامون کو ٹوڑا رہا تھا۔ وہ رانیہ کو کسی اور کی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بے قراری سی بے قراری تھی، چین، سکون، نیند، آرام، کھانا پینا سب ختم ہو گیا تھا۔

”مامون اگر رانیہ اس رشتے سے خوش ہے تو تمہیں بھی اس کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔“ اس کے دماغ نے اسے سمجھایا۔

”کہاں سے لاؤں میں اتنا حوصلہ اپنی محبت کو گنوا کر کیسے خوش رہ سکتا ہوں میں۔“

آج جمعہ تھا، رانیہ کی معشوقہ انور صغیر سے ہو رہی تھی۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، مامون آج اپنی محبت کو دیکھنے نہیں آیا تھا۔ کیسے وہ رانیہ کے سامنے آ کر کہتا کہ وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اس کے ماں باپ نے اس کا فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ تو بڑے یقین اور مان سے رانیہ کو بتا کر گیا تھا کہ وہ اپنے می ڈی کو لینے جا رہا ہے، وہ اسے اس کے والدین سے ہمیشہ کے لئے مانگ لیں گے، لیکن اس کا یقین اور مان تو اس کی پیاری ماں نے ہی توڑ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں اندھیرا کے تنہائی میں تڑپ رہا تھا۔

وہ کسی نیک پروین سے ہی کرتے ہیں۔ رانیہ جیسی لڑکی سے سب اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد اپنا راستہ بدل گئے۔“ رخسانہ مجید نے سادھی لہجہ میں کہا۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“ بیگم صغیر کے تو پسینے چھوٹ گئے تھے۔ ان کی باتیں سن کر مرے مرے لہجہ میں تصدیق چاہی۔

”خدا کو منہ دکھانا ہے، بہن، میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گی۔ آپ سے مجھے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی اسی لئے بتا رہی ہوں کہ کل کلاں کو جب رانیہ کے عاشق نے رانیہ سے رابطہ کر لیا تو آپ ہی کی بدنامی ہوگی..... اور اگر رانیہ اتنی ہی باکردار اور نیک ہوتی تو میں اسے اپنی بہو بنا لیتی، خیر سے دو بیٹے ہیں میرے، مجھے رانیہ پسند بھی بہت تھی لیکن جب اس کی حرکتیں سامنے آئیں اور تصویریں دیکھیں تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں آنکھوں دیکھی کبھی کیسے نگل سکتی ہوں۔ میرے لڑکوں کے لئے رشتوں کی کمی تھوڑی ہے جو میں گناہ کی اس پوٹ کو اپنے بیٹے کے سر منڈھ دیتی۔ اسی لئے خاموش ہو گئی۔ یہ دیکھو یہ تصویر اللہ جانے کس لڑکے کے ساتھ دلہن بنی کھڑی ہے۔“

رخسانہ مجید نے سوچنی سمجھی اسکیم کے تحت جلدی جلدی بتایا اور اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکال کر ان کے سامنے کردی۔ تصویر رانیہ کی ہی تھی جس میں وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ایک دولہا بھی مونچھوں والا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہ تصویر دراصل رانیہ کے کالج کے ورائٹی پروگرام کی تھی جس میں اس نے فنیسی ڈریس شو میں حصہ لیا تھا۔ رخسانہ مجید کی چھوٹی بیٹی شاہانہ رانیہ سے ایک سال سینئر تھی اور کالج کی فینر ویل پارٹی میں اس نے یہ تصویر اتاری تھی۔ رانیہ کے ساتھ جو دولہا تھا دراصل رومانہ تھی جو مردانہ لباس اور گیٹ آپ کی بدولت پہچانی نہیں جا رہی تھی..... رخسانہ مجید اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھیں۔ بیگم صغیر نے اپنی بیٹیوں اور بیٹے اور صغیر کو بلا کر تصویر بھی دکھائی اور ساری بات بتانے کے علاوہ منگنی اسی وقت ختم کرنے کا فیصلہ منادیا جو ان تینوں نے بلا تامل قبول کر لیا۔ بیگم صغیر رانیہ کے پاس گئیں جو ڈرائنگ روم میں شاہانہ اور شاہانہ کے سچ بیٹھی شرمیلے پن سے مسکرا رہی تھی۔

”لڑکی ہاتھ ادھر لاؤ۔“ بیگم صغیر نے غصے سے کہا تو وہ تینوں انہیں حیرانگی سے دیکھنے لگیں۔ رضیہ بیگم بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”رضیہ بیگم! میں یہ منگنی ابھی اور اسی وقت ختم کر رہی ہوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بہن؟“ رضیہ بیگم نے دل تمام کر حیرت و صدمے سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو رانیہ نے بھی جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”اپنی اس بدکردار اور آوارہ لڑکی کو کسی اور بیوقوف کے سر منڈھنا، مجھے نہیں لے جانی یہ گناہ کی گھڑی اپنے گھر، یہ منگنی ختم ہو گئی۔“ بیگم صغیر نے سفاکی سے کہتے ہوئے رانیہ کے ہاتھ سے منگنی کی انگلی اتاری۔ تمام مہمان خواتین حیرت اور افسوس سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ رانیہ کے متعلق جو کچھ انہوں نے سنا تھا اس پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا اور رانیہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار قرار دے دی گئی تھی۔ رضیہ بیگم اور امجد علی کے لاکھ سمجھانے، روکنے اور منت و فریاد کے باوجود بیگم صغیر کی نہیں تھیں اور اپنے بیٹے بیٹیوں اور دیگر رشتے داروں سمیت وہاں سے چلی گئی تھیں۔ بیٹے بڑے گھر میں پل بھر میں صف ہاتھ بچھ گئی تھی۔ امجد علی یہ ذلت و رسوائی بیٹی کی بدنامی اور جگ ہشائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکے تھے اور لڑکے والوں کے اپنے گھر پہنچنے سے پہلے ہی وہ دل کا دورہ پڑنے سے موت کی وادی میں جا پہنچے تھے۔ رانیہ نے سیاہ مائٹی لباس زیب تن کر لیا تھا۔ اسے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ رضیہ بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ کبھی رشتے دار جو منگنی میں شریک تھے، اب امجد علی کی موت کے غم میں شریک تھے۔ رانیہ کو ہر کوئی حسب توفیق برا کہہ رہا تھا اور وہ سب کی زہر آلود دل فگار باتیں سن رہی تھی۔

”تو بہ تو بہ، ایسی بے حیا لڑکی جسے ماں باپ کی عزت کا بھی خیال نہ آیا، باپ کی غیرت کا جنازہ نکال دیا، رانیہ نے۔ باپ بے چارہ صدمے سے ہی مر گیا۔“ ایک محلے دار عورت کہہ رہی تھی۔

”شکل اور عمل سے تو بڑی معصوم لگتی تھی ہمیں کیا خبر تھی کہ اندر ہی اندر یہ گل کھلا رہی ہے۔“ دوسری عورت نے کہا۔

”ارے یہ اچھی شکل ہی برے عمل کراتی ہے۔ لڑکے والوں کا دماغ تھوڑی خراب تھا جو منگنی کرتے ہی توڑ ڈالی۔ آخر انہیں بھی تو اپنے خاندان میں منہ دکھانا تھا۔ ان کی عزت بھی تو مٹی میں مل گئی ایسی لڑکیوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔“ تیسری عورت نے رائے دی۔

”ماں باپ کا قصور تو نہیں تھا۔ اتنے نیک ماں باپ کی اتنی بدکردار اولاد۔ چہ چہ..... ہائے رضیہ بہن اکیلی رہ گئی امجد بھائی تو بیٹی سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور پیار کا یہ نتیجہ دیا ہے بیٹی نے کہ ذلیل کرا کے مار دیا باپ کو ہائے ہائے۔“

ایک اور آواز رانیہ کی روح چھلنی کر گئی۔ کتنی ہی لفظوں کی انیاں، باتوں کے خنجر اور لہجوں کے نشتر اس کی روح میں پیوست ہو گئے تھے اور اسے لہو لہو کر گئے تھے۔

”اگر یہ منگنی ہو گئی تو ختم کرا دوں گا، تمہارے ہاتھوں پر صرف میرے نام کی مہندی ہے گی سنا تم نے۔ تم صرف میری دلہن بنو گی۔“ رانیہ کی سماعتوں میں ماموں کی کبھی ہوئی بات گونجی تھی



اور وہ چونک کر حواسوں کی دنیا میں لوٹ آئی تھی۔ "مامون ضیاء تم نے میرے انکار کا بدلہ لے لیا ناں تم نے منگنی ختم کرانے کی دھمکی دی تھی ناں اور اپنے گھٹیا منصوبے پر عمل کر بھی دکھایا۔" رانیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا، اس کے قریب بیٹھی رخسانہ مجید نے اس کی بات سن لی تھی اور فاتحانہ انداز میں دل ہی دل میں مسکرا دی تھیں۔ اب مامون ضیاء اور انور صغیر دونوں رانیہ کی بدنامی کے سبب اس سے دور ہو گئے تھے اور اب رخسانہ مجید کو انہیں اپنا داماد بنانے کا مرحلہ آسان نظر آ رہا تھا، دونوں اتنے اچھے رشتے تھے وہ ہر صورت انہیں حاصل کر لینا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

مامون کے موبائل کی بپ بج رہی تھی، اس نے تھکے تھکے انداز میں موبائل اٹھا کر دیکھا ہارون بھائی کا موبائل نمبر تھا۔ اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

"ہیلو!"

"مامون!" کیا بات ہے یا رکب سے می ڈیڈی تمہیں فون کر رہے ہیں تم فون کیوں نہیں ریسو کر رہے؟" ہارون بھائی نے اس کی آواز سننے ہی پوچھا۔

"خیریت ہے بھائی۔"

"خیریت نہیں ہے لومی سے بات کرو۔"

"ہیلو مومن چچا کہاں ہو تم؟" سلیٹی بیگم کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

"میں ادھر ہی ہوں می اپنے گھر میں۔"

"کچھ خبر بھی ہے تمہیں امجد بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" مامون ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کک کون می! رانیہ کے ابا؟"

"ہاں! ان کا ہارٹ فل ہو گیا ہے، ابھی ابھی ان کے گھر سے فون آیا تھا میں اور تمہارے ڈیڈی کل صبح تک کھنچے جائے، اے، جنازہ کل صبح دس بجے ہے۔ تم بھی وہاں جاؤ، رضیہ اکیلی ہوگی، سو کام ہوں گے کرنے والے۔" سلیٹی بیگم نے جلدی جلدی بتایا وہ صدمے سے غڑ حال ہو گیا۔

اسے رانیہ کا خیال آ رہا تھا۔ رضیہ بیگم کی شفقت صورت نگاہوں میں محوم رہی تھی۔ امجد علی کی بے ریا محبت و عنایت دل دکھا رہی تھی۔ "می، یہ سب کیسے ہو گیا آج تو رانیہ کی منگنی تھی؟"

"منگنی ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی توڑ دی گئی تھی کہ لڑکی یعنی رانیہ بدکردار ہے آوارہ ہے بس اسی صدمے سے امجد بھائی چل رہے۔ رضیہ کی نجانے کیا حالت ہوگی، بہت ذلت اور رسوائی ہوئی ہے رانیہ کی..... تم اس لڑکی کے گن گاتے تھے نا دیکھ لے اس کے لمبھن، منگنی ہوتے ہی ٹوٹ

گئی اور باپ کی موت کی ذمے دار بھی وہی رانیہ ہے، لعنت ہو ایسی بیٹی پر۔" سلیٹی بیگم طنزیہ اور تلخ لہجے میں بولیں۔

"میرا دل نہیں مانتا می، رانیہ ایسی نہیں ہے۔ وہ اگر کمزور کردار کی مالک ہوتی تو میری بار بار کی جانے والی پیش قدمی پر نفرت اور غصے کا اظہار نہ کرتی..... نہیں وہ ایسی نہیں ہے۔" مامون نے پریقین لہجے میں کہا اور موبائل آف کر دیا۔ دوسری جانب سلیٹی بیگم رانیہ کو کوس رہی تھیں جس نے ان کے بیٹے پر بقول ان کے جادو کر دیا تھا جو اس کی اس قدر ذلت و رسوائی کے باوجود اسے نیک پارسا اور پاک کردار سمجھے ہوئے تھا۔

امجد علی کو منوں مٹی تلے دفن دیا گیا تھا۔ رضیہ بیگم اور رانیہ کا رورو کرنا حال تھا۔ مامون نے رانیہ کو بس دور سے ہی دیکھا تھا اور اس کی حالت پر تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس کے سارے آنسو، سارے غم اپنے دامن میں جذب کر لیتا۔ اس نے بھی لوگوں کی زبانی رانیہ کی منگنی ٹوٹنے اور امجد علی کو دل کا دورہ پڑنے کی کہانی سنی تھی۔ یہی نہیں ہر زبان پر رانیہ کے لئے لعنت ملاحت کے کلمات تھے۔ جنہیں سن سن کر مامون کا دل چھلنی ہو رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی یہ حالت ہے تو رانیہ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

"خدا غارت کرے اسے جس نے میری معصوم بچی پر الزام لگایا ہے۔ اللہ کی لائٹی بے آواز ہے، وہ ضرور میری بچی کے مجرم کو سزا دے گا۔" رضیہ بیگم روتے ہوئے بولیں تو رخسانہ مجید نظریں چرا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ سلیٹی بیگم اور ضیاء الدین سوئم کے بعد واپس چلے گئے تھے۔

دس دن ہو گئے تھے امجد علی کو رخصت ہوئے اور رضیہ بیگم رورو کر پیار پڑ گئی تھیں۔ نزلہ، کھانسی، بخار انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ امجد علی باپ کی موت پر بھی نہیں آیا تھا، اس کا صدمہ الگ تھا رضیہ بیگم کو، رانیہ کے تاریک مستقبل کے خیال نے بے موت مار دیا تھا۔ شوہر ابدی جدائی دے گیا تھا۔ بیٹا جیتے جی منہ موڑ گیا تھا اور بیٹی کا گھر آباد ہونے سے پہلے ہی برباد ہو گیا تھا۔ ذلت و رسوائی اور بدنامی کا داغ اس کی پیشانی پر لگ گیا تھا۔ رضیہ بیگم یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھیں کہ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو رانیہ کا کیا بنے گا؟ اسے اتنی ذلت و رسوائی کے بعد اب کون قبول کرے گا؟ اور اکیلی لڑکی کو کون چین سے جینے دے گا؟ ان کے سکے بھائی تک نے رانیہ کے کردار کی اس رونمائی کے سبب اسے اپنی ذمے داری سمجھ کر قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ رانیہ کے سامنے سب کے روپے تھے۔ اس نے ماں کو حوصلہ دینے اور دنیا کو دکھانے کے لئے خود کو سنبھال لیا تھا۔ مضبوط بنا لیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اب اسے اکیلے ہی زندگی کی گاڑی کو کھینچنا ہے۔ لہذا اپنے دل اور اعصاب



کو اپنے ارادوں کو مضبوط تر بنانا ہوگا۔ وہ اللہ سے مدد مانگ رہی تھی اور رضیہ بیگم بھی دن رات روتے ہوئے اللہ سے گڑگڑا کر رانیہ کے بہتر و خوشحال اور محفوظ مستقبل کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔

رانیہ کالی ایس سی کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا اور اس نے پورے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔ رضیہ بیگم یہ خوشخبری سن کر رو دیں اسے گلے لگا کر خوب پیار کیا، رانیہ اپنی سند لینے کالج جا رہی تھی، جانے سے پہلے دوپہر کے لئے کچھڑی پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دی تھی کیونکہ رضیہ بیگم بیماری کی وجہ سے پرہیزی کھانا کھا رہی تھیں۔ رانیہ بھی وہی کھا لیتی تھی۔ اپنے لئے علیحدہ سے کچھ نہیں پکا تھی۔

”رانیہ.....“ وہ کالج جانے کے لئے چادر اوڑھ رہی تھی کہ مامون کی آواز پر چونک کر پلٹی، سیاہ پینٹ شرٹ اور کوٹ میں ہلکی سی شیو بڑھائے وہ کچھ غمزہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

”رانیہ جو کچھ بھی ہوا ہے مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔“

”کیوں آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ جو کچھ بھی آپ نے چاہا وہ آپ کی پاننگ کے تحت کامیابی سے ہو گیا۔“ وہ نچی سے بولی۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”میں تو ہوں ہی غلط، پوچھ لیجئے محلے میں کسی سے بھی، بلکہ شہر بھر آپ کو میرے غلط ہونے کی گواہی دے گا۔“ وہ تلخ لہجے میں بولتی اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

”مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ تم بہت معصوم اور باکردار ہو۔“ وہ دل سے کہہ رہا تھا۔

”ظاہر ہے آپ جانتے تھے جیسی تو آپ نے مجھے بدنام کیا، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت آپ نے مجھے رسوا کیا۔ آپ کو خود تو معلوم ہی تھا کہ رانیہ ایک باکردار لڑکی ہے۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”تم کہیں جا رہی تھیں شاید۔“ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”کہاں جانا ہے آؤ میں چھوڑ دوں۔“

”آپ مجھے چھوڑ ہی دیں تو اچھا ہے مسٹر مامون ضیاء۔“

☆☆☆

”رانیہ! ہمیں آپ پر فخر ہے آپ نے پورے سائنس گروپ میں ٹاپ کیا ہے، اب آگے

کیا ارادے ہیں آپ کے؟“

رانیہ کالج کی پرنسپل فرحت نسیم کے آفس میں ان کے رو برو بیٹھی تھی اور وہ اسے سراہتے

میں، محبت اور تم  
ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”میڈم میں کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنا چاہتی ہوں۔“ رانیہ نے جواب دیا۔

”ہوں ویری گڈ..... لیکن میں نے تو سنا ہے کہ آپ کی منگنی ہوتے ہی ختم ہوگئی تھی۔“

پرنسپل فرحت نسیم نے کہاں کی بات کہاں جوڑی تھی۔ رانیہ کو اعزازہ تھا کہ یہ قصہ اب ہر جگہ اس کی زندگی کو متاثر کرے گا اور وہ خود کو اس قسم کے سوالات کے لئے تیار کر چکی تھی۔

”میڈم! منگنی ختم ہوئی ہے میری زندگی تو ختم نہیں ہوگئی۔ مجھے اپنے حصے کی سائنس اسی

عزم و ہمت کے ساتھ پوری کرنی ہیں جس طرح کہ جینے کا حق ہے زندگی پر۔“ رانیہ نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”دیشن لائک اسے بریو گرل..... مجھے یقین تھا کہ تم پر تہمت لگائی گئی ہے تم ایک مضبوط

کردار اور پاکیزہ اطوار کی لڑکی ہو، تمہارے والد کی وفات کا مجھے بہت افسوس ہے لیکن تم ہمت مت ہارنا، میرے لائق کوئی کام ہو تو مجھے ضرور بتانا میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے اعزازہ ہے کہ ایسے

حالات میں ایک جوان اور اکیلی لڑکی کے لئے اس معاشرے میں سرواؤ کرنا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے، یہ معاشرہ قدم قدم پر ایسی لڑکیوں کو ہنک آمیز سلوک کا نشانہ بناتا ہے۔ ان پر زندگی کے

دروازے بند کر دیتا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تم ہمت ہارنے والی لڑکی نہیں ہو، تم زندگی کو اس کے اصل رنگ میں جینے کے قابل ضرور بنالوگی میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ پرنسپل فرحت نسیم

نے سنجیدہ اور پریقین لہجے میں اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا تو رانیہ نے مسکرا کر دھمے اور مہذب لہجے میں جواب دیا۔

”تھینک یو میڈم! آپ کی باتوں سے مجھے ذلت و رسوائی کے اس اندھیرے میں امید اور آبرو کی کرن جگمگاتی دکھائی دے رہی ہے۔ شکر ہے کہ اس معاشرے میں سب عقل کے اندھے اور

کانوں کے کچے نہیں ہیں، آپ جیسے لوگوں کی موجودگی بھی غنیمت ہے اس معاشرے میں بلکہ نعمت ہے مجھ جیسے لوگوں کے لئے تو۔ تھینک یو میڈم تھینک یو ویری مچ۔“

”یو آر آل ویز ویلکم مائی چائلڈ..... اور ہاں یہ کارڈ رکھ لو۔“ پرنسپل فرحت نسیم نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے پرس میں سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا جو اس نے لے لیا۔

”یہ کس کا کارڈ ہے میڈم!“

”یہ میری چھوٹی بہن کا کارڈ ہے اس پر جس اسکول کا ایڈریس اور فون نمبر درج ہیں وہ اسکول میری بہن مدحت نسیم چلا رہی ہے اسے ایک سائنس ٹیچر کی ضرورت ہے تم اگر انٹرسٹڈ ہو تو

میں مدحت سے بات کہتی ہوں، تمہارے لئے کسی سفارش کی ضرورت تو نہیں ہے، تمہارا شاعر تعلیمی کیریئر ہی تمہاری سفارش ہے۔“ فرحت حیم نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ تشکر اور حیرت سے بولی۔

”تمینک یومیڈم! لیکن یہ سکول تو اسلام آباد میں ہے اور میں یہاں لاہور میں ہوں۔“  
”اوہ! مجھے خیال ہی نہیں رہا نجانے میں نے تمہیں یہ کارڈ کیوں دے دیا ہے۔ خیر رکھ لو شاید کبھی تمہارے کام آجائے۔“ وہ فیس کر بولیں تو وہ ان کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلی آئی۔  
گھر پہنچی تو رضیہ بیگم کو عائب پاکر پریشان ہو گئی۔  
”اماں، اماں کہاں ہیں آپ؟“ وہ چیخ رہی تھی۔

”باجی! مون بھائی آپ کی اماں کو ہسپتال لے کر گئے ہیں ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔“ محلے کے ایک بچے نے آکر اسے بتایا۔

”یا اللہ خیر میری ماں کو کچھ نہ ہو اللہ میاں۔“ رانیہ نے بے اختیار دُعا مانگی۔  
”کس ہسپتال لے کر گئے ہیں؟ بھائی جان کہہ رہے تھے کہ آپ کو بتا دوں۔“ اس بچے نے اسے ایک چٹ دیتے ہوئے بتایا رانیہ نے چٹ لے کر پڑھی اور بچے کا شکریہ ادا کر کے اپنی چیزیں اپنے کمرے میں الماری میں رکھنے کے بعد شو لڈریجک میں کچھ پیسے رکھے اور ہسپتال روانہ ہو گئی۔ ہسپتال پہنچی تو مامون اسے ایمر جنسی کے باہر پریشان ٹھہلتا ہوا مل گیا۔ رانیہ نے اس کے پاس پہنچنے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”کیا ہوا ہے اماں کو، کہاں ہیں میری اماں؟“

”ایمر جنسی روم میں ہیں، خالہ جان، ڈاکٹر کے مطابق انہیں ٹائی فائیڈ، نمونیا کا ایک ہوا ہے۔“ مامون سنجیدہ مگر نرم لہجے میں بولا۔

”اولو.....“ وہ ایک دم ست دیوار سے جا لگی۔

”ہمت سے کام لو انشاء اللہ خالہ جان ٹھیک ہو جائیں گی ان کو سانس لینے میں پر اہلیم ہو رہی تھی پھر بھی وہ ہسپتال نہیں آتا چاہے وہی تھیں مگر میں زبردستی لے کر آیا ہوں، ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اگر ذرا دیر ہو جاتی تو.....“

مامون ا۔ سے ساری تفصیل بتا رہا تھا کہ اچانک اس کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا تو اپنی بے نیازی کا احساس ہوا اور ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

”اف میرے اللہ اگر آپ گھر میں نہ ہوتے تو.....“ رانیہ نے خوفزدہ لہجے میں کہا وہ کبھی

اسے آپ کہتی تھی تو کبھی تم مامون اس کی اس پل پل کی بدلتی عادت و کیفیت پر متحیر ہوا۔  
”گھبراؤ نہیں اللہ بہتر کرے گا۔“

”تمینک یو!“ رانیہ نے تشکر سے نظریں جھکا کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، وہ خالہ ہیں میری، میرا فرض ہے ان کا خیال رکھنا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو وہ بس ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر رہ گئی۔

اس کا لہجہ اور انداز بے حد پر خلوص تھا رانیہ کو شرمندگی ہو رہی تھی کہ اس نے چند گھنٹے پہلے اس کو بہت برا بھلا کہا تھا اور پھر بھی وہ اس کی ماں کو ہسپتال لے کر آیا تھا۔ اس کے لئے پریشان ہو رہا تھا اسے تسلی دے رہا تھا۔

”کہیں موصوف میری ہمدردی، توجہ اور محبت حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنا احسان مند بنا کر حاصل کرنے کی غرض سے تو یہ نیکی نہیں کر رہے؟“ رانیہ کے دماغ نے سوال اٹھایا۔

اسی وقت ڈاکٹر ایمر جنسی روم سے باہر نکلا۔ مامون اور رانیہ اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔  
”ہمیں مریضہ کو ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑے گا۔ انہیں آکسیجن لگا دی گئی ہے، آپ دُعا کریں کہ وہ نارمل ہو جائیں فی الحال ہم انہیں آئی سی یو میں رکھیں گے۔“ ڈاکٹر وزیر علی نے انہیں رضیہ بیگم کی حالت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔

”ڈاکٹر صاحب وہ تندرست تو ہو جائیں گی ناں۔“ رانیہ نے بے چینی سے پوچھا۔  
”انشاء اللہ آپ دُعا کیجئے اور مسٹر مامون آپ میرے ساتھ آئیے۔“ ڈاکٹر وزیر علی نے رانیہ کو تسلی دینے کے بعد مامون سے کہا تو رانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا وہ اس کا شانہ تھکتے ہوئے اسے تسلی دیتا ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا اور وہ اماں کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

”ڈاکٹر صاحب کوئی خاص بات ہے کیا؟“

مامون نے ڈاکٹر کے ساتھ ان کے کمرے میں آتے ہی سوال کیا۔

”جی ہاں! دراصل مریضہ کے بھیچروں میں پانی چلا گیا ہے ان کو نمونے کا بیس شدید ایک ہوا ہے، مجھے افسوس ہے کہ آپ کی مریضہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گی۔“

”اوہ مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا ڈاکٹر ابھی تو ان کے شوہر کے انتقال کو بھی دس بارہ روز ہی ہوئے ہیں۔ ان کی بیٹی وہ کیسے سہہ پائے گی یہ صدمہ؟“ مامون نے دکھ اور پریشانی سے اپنا سر پکڑ کر کہا۔

”یقیناً یہ بہت دکھ کی خبر ہے لیکن ہم ڈاکٹر کی بھی مجبوری ہے، ہم اپنے مریض کے لواحقین کو اندھیرے میں نہیں رکھ سکتے۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے دعا کرو کہ رضیہ بہن تندرست ہو جائے۔“ مجید ماموں نے سختی سے انہیں ٹوک کر کہا۔ رضیہ بیگم بظاہر سو رہی تھیں مگر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ جان بوجھ کر سوئی بن گئی تھیں۔ انہیں اپنی رانیہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”تندرست ہو کر کوئی خوشی ملتی ہے اس بے چاری کو، بیٹی نے سہاگ بھی چھین لیا اور ان کی آبرو بھی خاک میں ملا دی، ایسے میں بھلا کوئی ماں تندرست ہو سکتی ہے۔ یہ تو آزاد ہو جائے گی کہ ماں باپ کوئی بھی روکنے ٹوکنے کو موجود نہیں ہے پھر جہاں چاہے گی اور جس کے ساتھ چاہے آوارہ پھرے گی۔“

”بس کریں مامی! آپ بھی بیٹیوں والی ہیں، کیوں کسی کی بیٹی کو الزام دے رہی ہیں، اس کی ساری زندگی آپ کے سامنے گزری ہے، پھر بھی آپ اس کے کردار کو داغدار کر رہی ہیں، بڑے انوس کی بات ہے۔“ ماموں سے جب ضبط نہ ہوا تو اندر داخل ہوتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ رانیہ نے نفرت سے اسے دیکھا تھا اور دل میں کہا تھا۔

”خود ہی مجھے بدنام اور رسوا کیا ہے اور اب خود ہی میرے حق میں بول کر میری نظروں میں معتبر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”ماموں بیٹا، سارا شہر یہی بات کہہ رہا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی صداقت تو ہوگی نا۔“ رخسانہ مجید نے اپنی شرمندگی مٹانے کو نرمی سے کہا تو وہ غصے سے بولا۔

”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس، یا شہر بھر کے پاس رانیہ کی آوارگی اور بے حیائی کا بتائیں مجھے، دکھائیں مجھے؟“

”خاموش ہو جائیں آپ لوگ“ رانیہ چیخ اٹھی۔ ”آپ میری ماں کی تمارداری اور عیادت کے لئے آئے ہیں یا ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے اور نئے زخم لگانے آئے ہیں۔ میرے کردار پر انگلی اٹھانے والے اور بات کرنے والے اپنے کردار کا جائزہ تو لے لیں۔ مجھے کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرنی اور مسٹر ماموں ضیاء مجھے آپ کی گواہی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں کس کردار کی مالک ہوں، اس لئے مجھے کسی کی رائے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو میری پاکبازی کی گواہی دینے یا میرے حق میں بولنے کی اور ماموں آپ! مجید ماموں آپ کیسے بھائی ہیں کہ اپنی بہن سے دو بول تسلی کے بھی ڈھنگ سے نہ بول سکے۔ آپ کی بھانجی آپ پر بوجھ نہیں بنے گی ماموں، بے فکر ہو جائیے۔ مجھے اپنا بوجھ اٹھانا آتا ہے۔“

رانیہ نے سب کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ سے ایک ایک کر کے کمرے

”ڈاکٹر صاحب! آپ پلیز رانیہ کے سامنے یہ سب باتیں مت کہیے گا۔ ورنہ وہ ان سے پہلے مر جائے گی۔“ ماموں نے جتنی لہجے میں کہا۔

”آپ اطمینان رکھیں، مجھے اعزاز ہے اس بات کا اسی لئے میں نے آپ کو علیحدہ بلا کر یہ بات بتائی ہے۔“ ڈاکٹر وزیر علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”تھینک یو ڈاکٹر۔“ ماموں نے اٹھتے ہوئے کہا اور واپس رانیہ کے پاس آگیا۔

”کیا کہا ڈاکٹر نے؟“ رانیہ نے بے قراری سے پوچھا۔

”کچھ نہیں وہ ہسپتال کے بل وغیرہ کی بات کر رہے تھے کمرہ بک کرانا ہوگا خالہ جان کے لئے۔“ ماموں نے فوراً بہانہ بتایا۔

”کتنا خرچہ ہوگا؟“ رانیہ نے سوال کیا۔

”جتنا بھی خرچہ ہوگا بل میں پے کر دوں گا تم فکر نہ کرو۔“

”آپ کیوں پے کریں گے؟“

”کیونکہ وہ میری خالہ ہیں اور وہ مجھے اپنا بیٹا کہتی اور سمجھتی ہیں اور ایک بیٹے کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ماں کے علاج پر خرچ کرے یہ میرا اور خالہ جان کا معاملہ ہے تمہیں اس معاملے میں جھکے گئے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

وہ لا جواب ہو گئی۔

رانیہ نے مجید ماموں کو فون کر کے رضیہ بیگم کی حالت سے آگاہ کر دیا تھا وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کچھ دیر کے لئے انہیں دیکھنے آئے تھے۔ رضیہ بیگم کو ریکی روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

”رانیہ تو ڈائن ہے ڈائن، پہلے اپنے باپ کو کھانسی اور اب ماں کو موت کے دہانے پر لے آئی ہے۔ ہائے ہائے ابھی تو امجد بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور ان کی بیوہ بھی مرنے کو پڑی ہے۔“ رخسانہ مجید نے دہائی دیتے ہوئے کہا رانیہ کا دل پاش پاش ہو گیا۔ ماموں کمرے میں آتے آتے ان کی باتیں سن کر دروازے پر رک گیا تھا۔

”رخسانہ! چپ کرو بچی پہلے ہی بہت پریشان ہے تم حریف پریشان مت کرو اسے، اس کا کیا قصور ہے اس میں؟“ مجید ماموں نے کہا۔

”تو اور کس کا قصور ہے اس سے پوچھیں ذرا اپنی بھانجی سے کہ بیگم صغیر نے اسے آوارہ اور بدکردار کہتے ہوئے آدھے گھنٹے کے اندر اندر مٹگنی کس کے کہنے پر توڑ دی تھی۔ ایک دم سے ان پر اس کی اصلیت کیسے ظاہر ہو گئی تھی؟“ رخسانہ مجید نے تلخ لہجے میں کہا۔



”اماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”دیکھ تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اب مکرنا نہیں، مجھے جمن سے مرنے دے میری بیٹی۔“  
رضیہ بیگم نے دکھ سے کہا۔

”اماں!“ وہ رونے لگی۔

”مومن بیٹا! کیا سوچتے گئے، کہیں تم بھی تو رانیہ کے نام سے منسوب رسوائی سے خوفزدہ تو نہیں ہو گئے اے۔“

”نہیں خالہ جان! رانیہ میرے لئے بہت مقدس، معصوم اور معتبر ہستی ہے، میں اسے بہت خوش رکھوں گا انشاء اللہ!“ وہ ان کی بات کاٹ کر نرمی سے بولا تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

”جیتے رہو بیٹا، اللہ تمہیں ہر سکھ اور خوشی نصیب کرے۔ بیٹا مومن مجھے..... معاف کر دینا چاہتا! تم بھی کیا سوچتے ہو گے کہ کسی خود غرض اور مطلبی خالہ ہے اپنا مطلب پڑا تو تمہیں رانیہ کا بھائی بنا دیا..... اور اب مطلب پڑا ہے تو شوہر بننے کا کہہ رہی ہے۔“ رضیہ بیگم خوشی سے روتے ہوئے بولیں۔

”خالہ جان! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، آپ نے تو مجھ پر احسان کیا ہے، میں تو خود رانیہ کا ہاتھ ماتلنا چاہتا تھا لیکن آپ لوگوں نے جب اس کی منگنی طے کر دی تو مجبوراً مجھے خاموش رہنا پڑا اور نہ میں نے تو مٹی سے بات بھی کر لی تھی، ہماری قسمت میں شاید اسی طرح ملنا لکھا تھا، آپ کی رانیہ کو میں بہت خوش رکھوں گا، بس آپ بتائیں کہ کیا کرنا ہے، کب کرنا ہے۔“ مامون نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا تو وہ نہال ہو گئیں۔

”بیٹا! کیا تم آج ہی رانیہ سے نکاح کر سکتے ہو، یہاں میرے سامنے؟“ انہوں نے اس کے سہارے سے اٹھتے ہوئے پوچھا تو مامون نے پیار بھری نظروں سے رانیہ کو دیکھا جو اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

”خالہ جان! اطمینان رکھیں میں تھوڑی دیر میں سارا انتظام کر کے آتا ہوں۔“ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”رانیہ، ادھر دیکھ میری رانی۔“ رضیہ بیگم نے اسے پیار سے بلایا۔

”جی اماں!“ وہ ان کے قریب آ گئی۔

”وہ جو میرا صندوق ہے چابی کو رو والا۔ اس میں تیرے کچھ جوڑے رکھے ہیں تیرے جہیز کے لئے بنوا کے رکھے تھے۔ اس میں میرون اور سنہری سوٹ نکال کر نہا کے پہن لینا، میں تجھے پوری طرح تو دلہن بنے نہیں دیکھ سکوں گی لیکن آدمی تیاری تو اتنی جلدی میں ہو ہی جائے گی اور مومن

سے باہر چلے گئے۔ مامون وہیں کھڑا رہا اور رانیہ کا چہرہ تنکٹا رہا جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حالات و واقعات اور پے در پے ملنے والے صدمات نے اسے غصیلا، چڑچڑا اور گستاخ بنا دیا ہے، اسی لئے وہ اس کی کسی بات کا برا نہیں مناتا تھا۔ لہذا اس کے لئے پریشان رہتا تھا۔

”آپ بھی چلے جائیے۔“ رانیہ نے مامون کو کھڑے دیکھ کر سختی سے کہا۔

”میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے رانی۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا جس نے رانیہ کے دل میں طوفان پکا کر دیا تھا۔

”رانیہ.....“ رضیہ بیگم نے آنکھیں کھول کر اسے پکارا۔

”جی اماں! کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ وہ دوڑ کر ان کے قریب چلی آئی۔

”رانی میری بیٹی مجھے لگتا ہے کہ..... میرے پاس زیادہ..... وقت نہیں ہے۔“

”اماں! مت کریں ایسی باتیں، مجھے کس کے سہارے چھوڑ کر جائیں گی؟“ وہ روتے ہوئے بولی اور ان کا ہاتھ تمام کر چہرے سے لگا لیا۔

”میری آخری بات ماننے کی رانی؟“

”اماں! آپ حکم کریں..... جو کہیں گی میں مانوں گی، بس مجھ سے مرنے کی باتیں مت کریں۔“ وہ روتے ہوئے تڑپ کر بولی۔

”مجھے تیری فکر ہے رانی تو..... اکیلی کیسے جئے گی، دیکھ یہ میری وصیت بھی ہے..... اور آخری خواہش بھی وعدہ کر میری وصیت، خواہش، پوری کرے گی۔ کرے گی نا!“ رضیہ بیگم نے ٹھہر ٹھہر کر انک انک کر اپنی بات مکمل کی۔

”ہاں اماں میں وعدہ کرتی ہوں آپ جو کہیں گی، میں پورا کروں گی آپ کی بات، آپ خواہش، میں پوری کروں گی اماں۔“ وہ روتے ہوئے بولتی مامون کے دل پر خنجر چلا رہی تھی۔

”چاند بیٹا۔“ رضیہ بیگم نے مامون کی طرف دیکھا۔

”جی خالہ جان!“ مامون نے ان کے بیڈ کے قریب آ کر ان کا ہاتھ تمام لیا۔

”بیٹا! اپنی مرنی ہوئی خالہ کی ایک بات مانو گے۔“

”آپ کہئے تو خالہ جان!“ وہ خلوص سے بولا۔

”مومن میرے چاند، میری رانیہ کو اپنا لوا سے اپنا نام دے دو۔ یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا اپنی خالہ پر۔“ رضیہ بیگم نے مسمولی ہوئی سانسوں کے بیچ اپنی خواہش بیان کی تو مامون پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی اور رانیہ وہ حیرت اور بے بسی سے بولی۔

تھا کہ وہ اپنی محبت سے رانیہ کی نفرت اور بے رخی کو ختم کر دے گا اور اس کی محبت اس کا نصیب ضرور بن جائے گی۔

”رانیہ بیٹی! مامون ادھر آؤ چندا میرے پاس۔“ رضیہ بیگم نے دونوں کو اپنے پاس بلایا تو وہ ان کے سامنے دائیں بائیں آ بیٹھیں۔ رضیہ بیگم نے دونوں کے ہاتھ پکڑ لئے اور رانیہ سے کہنے لگیں۔

”رانیہ بیٹی! مامون اس چودھویں کے چاند کو خوش رکھنا، بیٹی، یہ بہت محبت کرنے والا بچہ ہے اس کی قدر کرنا۔“

”کتنی پیاری بات کہی ہے خالہ جان نے اسے اپنی گرہ سے باندھ لو رانیہ مامون۔“ مامون نے شوخ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے غصے سے منہ پھیر لیا۔

”دیکھ لیجئے خالہ جان، آپ کے سامنے ہی یہ مجھ سے منہ پھیر رہی ہے۔ بعد میں بیچے نجانے کیا کرے گی؟“ مامون نے معصوم سا شکوہ کیا۔

”رانیہ! تم نے سنا! میں نے کیا کہا ہے ابھی؟“ رضیہ بیگم نے اس سے کہا۔  
”اماں! کچھ نہیں ہوتا آپ کے اس چاند کو۔۔۔ ایک دم سے شکایتیں لگانی شروع کر دی ہیں۔“ رانیہ نے غصے سے مامون کو دیکھ کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔

”رانی بیٹی! یہ تو پیار میں کہہ رہا ہے۔۔۔ ایک دوسرے کی قدر کرنا۔۔۔ میں بہت خوش ہوں آج۔۔۔ اب مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے۔۔۔ اطمینان ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک قلعہ اور محبت کرنے والے شخص کے ہاتھ میں دیا ہے۔۔۔ اللہ تم دونوں کو ایک دوسرے کی راحت اور مسرت کا باعث بنائے۔ سدا شاد آباد رکھے میرے بچو۔“ رضیہ بیگم نے رانیہ کا ہاتھ مامون کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دل سے دعا دی۔

”آمین!“ مامون نے دل سے کہا اور رانیہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا جو اس نے بمشکل چھڑایا اور رخ پھیر کر وہاں سے اٹھ گئی۔ مامون کو ہنسی آ گئی۔

”مامون بیٹا۔۔۔ میرے پاس نرس موجود ہوگی۔۔۔ تم رانیہ کو گھر لے جاؤ صبح آ جانا۔“ رضیہ بیگم نے جانے کس خیال سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو رانیہ شیشا گئی، وہ تو پہلے ہی اتنا بے باک تھا اب تو نکاح ہو گیا تھا، بھلا اب وہ کیسے باز رہ سکتا تھا اپنی محبت کے عملی اظہار سے۔

”اماں! میں آپ کے پاس رہوں گی۔“ رانیہ نے فوراً کہا۔  
”آج نہیں۔۔۔ آج رات تمہیں مامون کے ساتھ رہنا ہے اپنے شوہر کے پاس جاؤ

بیٹا۔۔۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی ضرور لگوانا۔۔۔ اسے ابھی اپنے ساتھ لے جاؤ بازار سے مٹھائی وغیرہ خرید لینا، پیسے رانیہ دے دے گی۔“ رضیہ بیگم نے خوشی ہدایات دیں۔

”خالہ جان! پیسے ہیں میرے پاس، آپ بس اپنا خیال رکھیں میں دو ڈھائی کھنٹے میں سارا انتظام کر لوں گا اور نرس یہاں آپ کے پاس آؤں ڈیوٹی ہوگی، کسی چیز کی ضرورت ہو، کوئی مسئلہ ہو تو فوراً نرس کو بتا دیجئے گا۔ چلیں رانیہ۔“ مامون نے رضیہ بیگم کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا اور جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ رانیہ نے رضیہ بیگم کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنی چادر اوڑھ کر آنسو صاف کرتی ہوئی اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر اس کی گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ اس وقت صرف اپنی اماں کی آخری خواہش اور آخری وصیت پر سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی سے اس قدر مایوس لگ رہی تھیں، وہ پھر سے رو پڑی۔

”رانیہ! سنبھالو خود کو۔“ مامون نے گاڑی چلاتے ہوئے اسے فکر مندی سے دیکھ کر کہا تو وہ روتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے اماں کو، وہ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہیں، آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں ہیں؟“

”جس لڑکی کے سر پر باپ بھائی موجود نہ ہوں اس کی بیمار ماں کو اس کی فکر تو ہوتی ہی ہے ناں۔ انشاء اللہ تندرست ہو جائیں گی۔“ مامون نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اسے اصل بات بتا کر مزید ہلکان اور پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر اسی شام عصر کے بعد رانیہ اور مامون کا نکاح ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم میں ہو گیا جس میں مجید مامون، ان کا بیٹا حمید اور مامون کے دو قریبی دوست یاسر اور سلمان بطور گواہان شریک ہوئے۔ رضیہ بیگم نے خوشی سے رانیہ اور مامون کا ہاتھ چوم لیا۔ مہمانوں کو مٹھائی اور چائے پیش کی گئی۔ سبھی انہیں مبارکباد دینے کے بعد چلے گئے۔ مامون سفید شرٹ اور براؤن رنگ کے پینٹ کوٹ میں لمبوس تھا اور رانیہ میروں کا مدار شلوار قمیض دوپٹے میں میچنگ چوڑیاں اور مہندی سے سجے ہاتھوں میں گجرے پہنے بے حد دلنشین لگ رہی تھی۔ مامون نے اس کی اور اپنی کئی تصاویر کھینچ لی تھیں۔ رانیہ قدرت کے اس کھیل پر حیران و پریشان بیٹھی تھی کہ جس شخص سے وہ نفرت کرتی تھی، جس کی محبت کو روزِ اوّل سے ٹکراتی آئی تھی، آج تقدیر نے، حالات کی بھیجی اور مجبوری نے اسی شخص کو اس کی زندگی کا ساتھی، جملہ حقوق کا مالک بنا دیا تھا۔ وہ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد خالی دل اور خالی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی تھی اور مامون اسے بہت پیار سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے یقین

ہوئے گنگناہا۔

”پیار ہے یہی تو پیار ہے۔“

”لیکن مجھے کوئی پیار نہیں ہے آپ سے۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولی۔

”تو ہو جائے گا میری جان! تمہارا یہ دل جو نفرت سے بھرا ہے ناں ایک دن مامون فیاہ

کی محبت اور چاہت سے اس کے پیار سے بھرا ہوگا اور تم اس کے ساتھ، اس کے قرب کی تمنا میں بے قرار ہونے لگو گی۔“ وہ اس کے کانوں میں پیار بھری باتیں کس لہجے سے کہہ رہا تھا اس نے حیرت سے اس کا وجہ چہرہ دیکھا۔

”تم کو آتا ہے پیار پہ غصہ، مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“ مامون نے مسکراتے ہوئے اسے بیڈ کے کنارے پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اپنے کوٹ کی جیب میں سے سونے کے دو ٹکٹن نکال کر اس کے دائیں ہاتھ میں پہنا دیئے۔

”یہ تمہاری روحانی کا تحفہ ہے۔ تم اصلی دہلی کی طرح تیار تو نہیں ہو کیں لیکن تمہارا یہ سادہ سا روپ بھی بہت دلنشین ہے۔ میرے نام کی مہندی کا رنگ کتنا گہرا اور سرخ ہے ناں رانیہ۔ جو میرے پیار کی سچائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آئی لو یو رانیہ آئی ریلی لو یو۔“ مامون بے خودی کے عالم میں کہتا ہوا اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں کو سونگھ رہا تھا۔

”آپ جائیں یہاں سے۔“ رانیہ کھڑی ہو کر بولی۔

”آج کی رات تو میں کہیں نہیں جانے والا، اوپر میرے کمرے میں میرے شلوار سوٹ ہوں گے وارڈ روب میں ایک ٹکال کر لا دو، میں کپڑے جینج کر کے یہیں سوؤں گا۔“ وہ اس کی بے حسی پر بھی مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”خود ہی جا کر لے آئیں میں اتنی رات کو اندر میرے میں اوپر نہیں جاؤں گی۔“ رانیہ نے فوراً جواب دیا تو وہ ہنس پڑا۔

”ابھی تو تم مجھے یہاں سے جانے کا کہہ رہی تھیں اور اب خود اپنے گھر کے حصے میں جاتے ہوئے ڈر رہی ہو۔“

”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ وہ جھلا کر بولی۔

”مجھے تکلیف یہ ہے کہ تم اتنی حسین رات ضائع کر رہی ہو، کتنے خواب دیکھے تھے میں نے اس رات کے دیکھو باہر چاند نکلا ہوا ہے ساری دنیا کے لئے اور اندر یہ چاند صرف تمہارے لئے نکلا ہے تمہیں اپنی چاندنی میں نہلانا چاہتا ہے اور تم۔“

شبابش۔“ رضیہ بیگم کا لہجہ اور جملہ معنی خیز تھا وہ ہلش ہو گئی۔ مامون مسکراتے ہوئے شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مگر اماں.....“

”رانی! اپنی اماں کی بات ماننے کا وعدہ کیا تھا تو نے اتنی جلدی بھول گئی۔“ رضیہ بیگم نے یاد دلایا۔

”ٹھیک ہے اماں جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”خوش رہ میری بچی سدا سہا گن رہ۔“ رضیہ بیگم نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی اور وہ مامون کے ساتھ باہر نکل آئی۔

مامون بہت خوش تھا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُسے اُس کی محبت مل گئی ہے اس کے برابر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ براجمان ہے، اس نے راستے میں ہوٹل سے کھانا پیک کروایا اور ”اچھا ہاؤس“ آگے دوٹوں۔ رانیہ کو اس وقت بھائی اور باپ بے طرح یاد آ رہے تھے۔ وہ قدرت کی ستم ظریفی پر اٹک بھار رہی تھی۔ اس کی شادی کیسے حالات میں ہوئی تھی اور وہ بھی اس شخص کے ساتھ جسے وہ انکار کر چکی تھی۔ وہ جتنی ناخوش تھی مامون اتنا ہی خوش تھا۔

”آپ رات یہیں رہیں گے کیا؟“ رانیہ نے اپنے ساتھ آتے دیکھ کر پوچھا۔

”ظاہر ہے یہ ہماری شادی کی پہلی رات ہے، جو شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ گزارنی چاہئے۔ خالہ جان نے کچھ سوچ کر ہی تمہیں میرے ساتھ بھیجا ہے ناں۔ یقین جانو رانیہ آج میں بہت خوش ہوں، میری محبت مجھے مل گئی ہے۔“ وہ شوخ و شریل لہجے میں جواب دیتا اس کے قریب آ گیا۔

”لیکن میں خوش نہیں ہو۔“ وہ بے رحمی سے بولی۔

”تم نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی ہے۔“

”میں آپ کی مرضی اور محبت ہو سکتی ہوں لیکن آپ میری مرضی اور محبت نہیں ہیں۔ آپ صرف میری ماں کی وصیت اور خواہش ہیں بس۔“ رانیہ نے سنگدلی سے اس کے جذبات کا خون کرتے ہوئے کہا۔

”ادھر آؤ..... ذرا دیکھو تو سبھی تمہارے سینے میں دل کی جگہ کہیں پتھر تو نہیں جڑا ہوا۔“ مامون نے اسے بازو سے پکڑ کر قریب کرتے ہوئے کہا اور اس کے دل پر ہاتھ رکھ دیا وہ تو بری طرح شیشا مٹی۔

”کیا ہے؟“ وہ اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش میں بچوں کی طرح چڑ کر بولی تو وہ مسکراتے



بیٹھ دیا اور زبردستی لوالہ بنا کر اس کے منہ میں دے دیا۔ وہ جانے کیوں رونے لگی۔ مامون نے اس کے آٹھلے سے اس کے آنسو صاف کئے۔

”یہ آنسو بہت قیمتی ہیں رانی! انہیں بچا کر رکھو، ابھی انہیں بہانے کا وقت نہیں آیا۔“  
 ”کیا مطلب؟“ آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے بتائیں ناں، اماں کو کیا ہوا ہے؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بولی۔

”آرام سے ناشتہ کرو پھر ہسپتال اماں کا ناشتہ لے کر بھی جانا ہے اور تم کیا ساری رات جاگتی رہی ہو؟“ مامون نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بچھے سرخ لکیروں کے جال کو بخور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی!“

”مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوا نا تمہارے جاگنے کا۔“ مامون کا معنی خیز جملہ اسے حیا آمیز کوفت میں جتا کر گیا۔

”میں خالہ جان سے تمہاری شکایت کروں گا کہ آپ نے اپنی بیٹی کو میرے ساتھ رخصت کر دیا تھا لیکن آپ کی بیٹی تو مجھے اپنے قریب بھی نہیں بھٹکنے دیتی۔“ وہ شریر لہجے میں بولا۔  
 ”یہ بات آپ اماں سے کہیں گے؟“ رانی نے شرم سے پانی پانی ہو کر کہا۔  
 ”بالکل!“ اس نے پراٹھے اور اٹھنے سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔  
 ”شرم کریں۔“

”میں بھی اگر تمہاری طرح شرم ہی کرتا رہا ناں تو بے اولاد رہ جاؤں گا میرا خاندان میری نسل کیسے آگے بڑھے گی؟“ وہ مزید شریر ہوا تھا۔

”فضول باتیں کرنے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے آپ کو۔“ وہ غصے اور شرم سے کھڑی ہو گئی اور تیز لہجے میں بولی۔

”آتا ہے بہت کچھ آتا ہے تم اگر پاس آنے کی اجازت دو تو میں عملی ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔“ مامون نے اس کے غصے اور حیا سے لال ہوتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ غصے سے جواب دیتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مامون کا شوخ و شریر قبضہ اسے مزید تپا گیا تھا۔

وہ دونوں ہسپتال پہنچے تو رضیہ بیگم ان کی ہنسنے لگی تھیں۔ انہیں دیکھ کر خوشی سے مسکرا دیں، رانی نے بے اختیار نگاہ اٹھا کر مامون کو دیکھا اور پھر نگاہ جھکالی۔ مامون نے اس کی خاموشی دیکھ کر انہیں

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا اور حسرت و یاس سے اس کے چہرے کو بھٹکنے لگا۔ وہ شہناز گئی اور نظریں چراگے کمرے سے باہر نکل آئی۔ وہ جو کھانا لایا تھا رانیہ نے برتنوں میں نکال کر ٹرے میں سجایا اور اپنے کمرے میں لے گئی جہاں مامون براجمان تھا۔ رانیہ نے ٹرے میز پر رکھ دی۔  
 ”کھانا کھا لیجئے۔“

”تم بھی میرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”کھانے کی بھوک بھی نہیں ہے۔“ مامون کا جملہ اور لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

”رانیہ..... ایسا مت کرو ورنہ میرے ساتھ تم خود کو بھی اذیت میں مبتلا کئے رکھو گی۔“ مامون نے ایسے کہا جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہوا اور پھر بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔ رانیہ، رضیہ بیگم کے کمرے میں سونے کے لئے آگئی تھی مگر اسے ایک پل کو بھی نیند نہیں آئی تھی۔ وہ اسجد کے لئے، اماں اور ابا کے لئے روتی رہی تھی۔ مامون کی محبت کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے بدگمانیوں اور نفرتوں کے جالے اپنے ارد گرد بن لئے تھے جہاں مامون کی بے لوث و بے ریا محبت میں پھنس کر الجھ کر رہ گئی تھی۔

فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر بچن میں آگئی۔ رضیہ بیگم کے لئے ولیہ اور چائے بنا کر فلاسک میں ڈالی۔ خود حسب معمول دودھ کا ایک گلاس نیم گرم کر کے پیا اور مامون کے لئے اس کا مرغوب ناشتہ پراٹھا اور فرانی اٹھنے سے بنا کر چائے کے ساتھ ٹرے میں رکھ کر اس کے کمرے میں لے آئی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا۔ رانیہ ٹرے میز پر رکھ کر جانے لگی تو مامون نے کہا۔

”تم نے ناشتہ کر لیا رانیہ۔“

”جی میں نے دودھ کا گلاس پیا لیا ہے۔“

”دودھ کے ایک گلاس سے بھوک نہیں مٹے گی، آؤ بیٹھ کر ناشتہ کرو تم نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اپنی صحت خراب کر کے تم اماں کا خیال کیسے رکھ پاؤ گی؟“

”مجھے جب بھوک ہوگی میں کھالوں گی آپ میری فکر نہ کریں۔“

”تمہاری فکر اب مجھی کو کرنی ہے بیٹھو شاباش بسم اللہ کرو۔ کھانے پینے کے معاملے میں تمہاری کوئی مرضی نہیں سنوں گا، لومہ کھولو۔“ مامون نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ کے کنارے پر

جواب دیا۔

”خالہ جان! یہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے۔“

”کیا؟“ رضیہ بیگم کے ساتھ رانیہ نے بھی بوکھلا کر اسے دیکھا۔

”جی ہاں! یہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ خوش ہے۔“ مامون نے بڑی خوبصورتی سے بات بنائی تو رانیہ کی جان میں جان آئی۔ رضیہ بیگم بھی خوش ہوئیں۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے اب میں سکون سے مر سکوں گی، اللہ تم دونوں کو ہمیشہ شاد آباد رکھے تندرست رکھے۔“ رضیہ بیگم نے دل سے انہیں دُعا دی۔ مامون نے اس بار بھی دل سے آمین کہا تھا۔

”تم نے اپنی اماں کی وصیت اور خواہش پر مجھ سے یہ پیچہ میرج کر ہی لی ہے تو چند روز ان کے سامنے اس شادی سے خوش ہونے کی ایکٹنگ تو تمہیں کرنا ہی ہوگی ورنہ انہیں تمہارے محفوظ مستقبل کی فکر پریشان کئے رکھے گی۔“ مامون نے کمرے سے باہر آ کر رانیہ سے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا اور رضیہ بیگم کے کسی کام سے چلا گیا۔

”چند روز.....“ رانیہ اس کے اس لفظ پر اٹک کر رہ گئی تھی۔ رضیہ بیگم کی طبیعت سنبھل نہیں رہی تھی وہ تو بس رانیہ کی شادی کی خوشی میں خود کو سنبھالے ہوئے تھیں۔

رضیہ بیگم نے وکیل کے ذریعے اپنی وصیت لکھوائی تھی، امجد ہاؤس رضیہ بیگم کے نام تھا جو انہوں نے قانونی طور پر رانیہ کے نام کر دیا تھا اور امجد علی مرحوم کا جزل اسٹور بیچ کر اس کی رقم رانیہ کے نام بینک میں جمع کرانے کی قانونی طور پر وصیت کر دی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ رانیہ اپنے سسرال خالی ہاتھ جائے، سات مرلے کا دو منزلہ مکان اور جزل اسٹور کی قیمت بہت تھی۔ مامون جیسے امیر گھر کے داماد کے لئے۔ مامون کو رانیہ کی جائیداد سے کوئی غرض نہیں تھی۔ رضیہ بیگم کی بیٹی ہونے کے ناطے وہ ان کی قانونی وارث تھی اس لئے یہ پر اپنی رانیہ کو ہی ملنا تھی۔ امجد کی نافرمانی اور۔ بے زنجی کی بدولت اسے جائیداد میں سے کچھ نہیں دیا گیا۔ ویسے بھی وہ بہت دولت مند بن گیا تھا۔ اس نے تو ماں باپ اور بہن سے ہر تعلق اور رابطہ تک توڑ لیا تھا۔ اس لئے رضیہ بیگم نے اسے اس مختصر جائیداد میں سے حصہ دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

مجید مامون اور جید نے اگلے دن رخسانہ مجید کو رانیہ اور مامون کی نکاح کی اطلاع دی تھی۔ جسے سن کر پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا اور جب دونوں نے رانیہ کے نکاح میں بطور گواہ شریک ہونے کا بتایا تو وہ آگ بگولہ ہو گئیں۔ کیونکہ اب وہ رانیہ کو اپنی بہو بنا کر گھر اور جزل اسٹور اپنے نام کرانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ ہل پل نئی نئی سازشیں ان کے دماغ میں پٹی چبھتی رہتی

تھیں۔ اپنی اس سازش کی ناکامی پر وہ تمللا رہی تھیں سیدھی ہسپتال جا پہنچیں۔

”تمہیں کچھ خبر بھی ہے مامون کے گھر والوں نے تمہیں تمہارے گھر اور دکان کی وجہ سے قبول کرنے کی حامی بھری تھی۔ وہ تمہارے ذریعے تمہارا گھر مامون کے نام کر کے تمہیں چلتا کریں گے۔“ رخسانہ مجید نے رانیہ کو باہر لان میں لے جا کر راز داری سے بتایا۔

”لیکن ان کے پاس کس چیز کی کمی ہے جو وہ میری جائیداد لیں گے؟“

”ہوس، لالچ، میری بچی، لالچ یہ دولت مندوں کو ہر جائز ناجائز ذریعے سے مال بنانے پر اکسائے رکھتی ہے۔ میرا نام مت لینا کہ میں نے اندر کی بات تمہیں بتا دی ہے اور ظاہر ہے تم خود سوچو کہ تم جس الزام اور تہمت کے تحت محفلے، خاندان اور شہر بھر میں بدنام ہو چکی ہو اس کے بعد بھلا مامون کے ماں باپ تمہیں اپنی بہو کیوں بنانے لگے۔ وہ تو تمہاری جائیداد کا لالچ ہے انہیں وہ ہتھیار کر وہ لوگ تمہیں دودھ میں سے کبھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ ہائے میری یتیم رانیہ، میرے بس میں ہو تو میں تجھے ہر دُکھ سے بچا لوں۔“ رخسانہ مجید نے سنجیدگی سے کہا آخر میں باقاعدہ آنسو لا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ رانیہ کے وجود میں نفرت کی چند گاریاں پھر سے بھڑک اٹھی تھیں۔

”رانیہ! جلدی آؤ خالہ جان کی حالت بگڑ رہی ہے۔“ مامون کی آواز پر وہ چونک کر پٹلی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی وارڈ میں داخل ہوئی۔ رضیہ بیگم کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر علی انہیں آکسیجن لگا رہے تھے۔ مامون اور رانیہ ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ مامون کو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

”جی خالہ جان! مامون فوراً قریب آ گیا۔ رضیہ بیگم نے نجانے کونسی سانسوں کے بیچ اس سے کیا کہا تھا کہ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر رانیہ کا ہاتھ تمام کر ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ رضیہ بیگم نے مسکرا کر ان دونوں کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے آنکھیں موند لیں۔ وہ ابدی نیند سو گئی تھیں لیکن ان کے ہونٹوں پر ایک آسودہ مسکراہٹ تھی جو کسی یقین اور اطمینان کے بعد ہی انسان کو میسر آتی ہے۔

”اماں..... اماں.....“ رانیہ نے تڑپ کر انہیں پکارا اور صدمے سے بے ہوش ہو کر مامون کی ہانپوں میں جمبول گئی۔

☆☆☆

رضیہ بیگم بھی اپنی اکلوتی بیٹی کو روتا، تڑپتا، بلکتا چھوڑ کر ملک عدم سدھار گئیں اور وہ لاکھ روٹے تڑپنے اور چاہنے کے باوجود بھی روک نہیں سکی تھی۔ رخسانہ مجید نے ایسے میں رانیہ کو بہت

بات کاٹتے ہوئے کہا اور ریسورٹ پر رخصانہ مجید ان کی گفتگو سن چکی تھیں اور دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں کہ ان کا کام آسان ہو رہا ہے۔

”رانیہ بیٹی اب میں چلتی ہوں مگر میں سو کام ہیں کرنے والے۔“ رخصانہ مجید نے کمرے میں آکر پیار سے کہا۔

”ٹھیک ہے ممانی! آپ جائیں، آپ بھی کب تک میری وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کے یہاں بیٹھی رہیں گی۔“ رانیہ نے مدہم آواز میں کہا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ اب تو تم مامون کی بیوی ہو۔ یہ پابندی نہ ہوتی تو میں تمہیں اپنے گھر لے جاتی، اب تو مامون ہی تمہارا ذمہ دار اور سرپرست ہے اسے چاہئے کہ تمہیں رخصت کرا کے لے جائے، یوں بھی تمہارا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ لوگ الگ الٹی سیدھی باتیں بناتے ہیں۔ اچھا اپنا خیال رکھنا میں پھر آؤں گی۔ خدا حافظ۔“ رخصانہ مجید اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ملاحت سے بولیں اور وہاں سے چلی گئیں۔ رانیہ وہیں کم صم سی بیٹھی سلیٹی بیگم کی باتوں پر کڑھ رہی تھی۔

”رانیہ.....!“ مامون کی آواز پر اس نے چونکت کر سر اٹھا کے دیکھا۔

”دروازہ کیوں کھلا تھا؟“

”ممانی ابھی واپس گئی ہیں اپنے گھر۔“ رانیہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا

”تو ان کے جانے کے بعد تمہیں دروازہ بند کر دینا چاہیے تھا۔“

”ہاں! مجھے دروازہ بند کر دینا چاہیے اب۔“ وہ معنی خیز جملہ بولی۔

”کیا بات ہے کوئی نیا شاک پہنچا ہے، بہت دکھی لگ رہی ہو۔“ مامون اس کے چہرے

سے اس کی کیفیت و حالت کو محسوس کرتے ہوئے بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے نہایت بے مروتی سے جواب دیا۔

”آپ میرے دکھوں کی فکر مت کیجئے فرمائیے کیسے آتا ہوا؟“

”تم مجھ سے اجنبی کی طرح کیوں بات کر رہی ہو اس قدر غیریت کیوں ہے تمہارے

لہجے میں؟“ وہ بے قرار ہو کر سوال کر رہا تھا۔

”اپنائیت کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ ہمارے بیچ بنا ہی کب تھا؟“

”میری طرف سے تو شروع دن سے یہ رشتہ تھا تمہیں محسوس نہیں ہوا تو اب ہو جائے گا تم

میری بیوی ہو، شوہر ہوں، میں تمہارا۔“ مامون نے اس کے صاف ستھرے مگر افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سنجبالا تھا۔ ان کی تینوں بیٹیاں بھی اس کی دلجوئی کر رہی تھیں۔ مامون تو اس کی حالت دیکھ دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔ محلے اور خاندان والوں نے رانیہ کو ہی اس کے ماں باپ کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ سب اس کے خراب کردار کے انکشاف پر اس کی منگنی ٹوٹنے سے امجد علی اور رضیہ بیگم کی صدماتی موت کو تعبیر کر رہے تھے اور وہ لوگوں کی زہریلی باتیں سن کر مزید ہلکان ہو رہی تھی۔ وقت رکتا نہیں ہے صدمہ کتنا ہی بڑا درد و غم کتنا ہی گہرا اور کڑا کیوں نہ ہو گزرتے وقت کی حکمرانی اسے دھیرے دھیرے کم کرتی جاتی ہے۔ غم دل میں ٹھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ غم ختم ہو گیا۔ رانیہ نے بھی خود کو ایک بار پھر سے سنبھال لیا تھا۔ اب وہ اکیلے میں روتی تھی سب کے سامنے خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے رکھتی تھی۔ مجید مامون کی بیٹیاں اس کے پاس آکر رہ جاتیں دو بیٹے رضیہ بیگم کو رخصت ہوئے بھی گزر گئے تھے۔

”فرن، فرن.....“ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو رانیہ نے اٹھ کر ریسورٹ اٹھالیا۔

”ہیلو!“

”رانیہ.....“

”جی!“

”میں مامون کی ممی بات کر رہی ہوں۔“ دوسری جانب سلیٹی بیگم بول رہی تھیں۔

”السلام علیکم آئی!“

”وعلیکم السلام! کیسی ہو؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“

”مامون تمہاری طرف تو نہیں آیا ہوا؟“

”جی نہیں۔“

”ہوں، یہ بتاؤ اب تمہارے ارادے کیا ہیں؟“

”میں سمجھی نہیں آئی۔“

”تو میں تمہیں سمجھا دیتی ہوں، سنو لڑکی میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو اسے تمہارے سوا کچھ

سوچتا ہی نہیں ہے، میں تم جیسی لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتی۔ ایک عزت ہی تو ہوتی ہے لڑکی کے پاس

تمہارے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے زمانے بھر میں بدنام ہونے والی لڑکی کو

اپنے گھر کی زینت بنانے کا۔ میرے بیٹے کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر تم کیا سمجھتی ہو۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتی، اپنے بیٹے کو سنبھال کر رکھیں اپنے پاس۔“ رانیہ نے غصے سے ان کی



”یہ مجبوری کا رشتہ ہے اور مجبوری کے رشتے بہت ناپائیدار ہوتے ہیں مسٹر مامون۔“  
رانیہ نے کھڑے ہو کر کہا اس کا یہ جملہ، یہ لہجہ، ہر انداز مامون کو دکھ سے دو چار کر رہا تھا مگر وہ ضبط پر  
ضبط کئے جا رہا تھا۔

”میں تمہیں اس رشتے کی پائیداری ثابت کر کے دکھاؤں گا انشاء اللہ یہ رکھو شاید کبھی  
تمہارے کام آسکیں۔“ مامون نے سنجیدہ مگر پر یقین لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک خاکی  
لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔  
”کیا ہے اس میں؟“

”ہماری تقریب نکاح کی تصاویر اور نکاح نامے کی چند فوٹو کاپیاں ہیں۔ اصل نکاح نامہ  
میرے پاس ہے۔ یہ کیونکہ تم سے تو کچھ بھی بعید نہیں ہے غصے میں آکر نکاح نامہ ہی پھاڑ ڈالا تو میں تو  
بے موت مارا جاؤں گا نا، تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا ثبوت بھی اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔“ مامون  
نے مسکراتے ہوئے کہا تو رانیہ نے نفرت سے لفافہ بیڈ پر پھینک دیا۔ مامون کو بہت دکھ پہنچا تھا اس  
کی حرکت سے۔

”یہ تمہاری امانت تھی میرے پاس اسے سنبھال کر رکھنا۔“ مامون نے ایک نیلے رنگ کی  
فائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔  
”اب یہ کیا ہے؟“ وہ فائل لے کر بدتمیزی سے پوچھ رہی تھی۔

”اس گھر کے کاغذات ہیں جو خالہ جان نے تمہارے نام کر دیا تھا۔ خالہ جان کی وصیت  
کی کاپی بھی اس میں موجود ہے اور جنرل اسٹور میں نے ان کی وصیت کے مطابق فروخت کر دیا ہے  
اور اس کی تمام رقم تمہارے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے۔ تم چاہو تو بینک جا کر تصدیق کر سکتی  
ہو اس میں رجسٹری اور رسیدیں بھی موجود ہیں دیکھ لو۔“

”آپ نے یہ پراپرٹی اپنے نام کیوں نہیں کروائی؟“ وہ شک بھرے لہجے میں بولی۔  
”میں بے ایمانی کیوں کرتا بھی، میرا تمہاری پراپرٹی پر کوئی حق نہیں ہے۔ میرا حق  
صرف تم پر ہے رانیہ۔“ مامون نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے جو اس نے  
نفرت سے جھٹک دیئے۔

”مجھ پر نا آپ کا کوئی حق نہیں ہے اگر آپ کو یہ پراپرٹی چاہئے تو لے لیں اور جان  
تہوڑ دیں میری۔“

”کیسے چھوڑ دوں تمہاری جان! تم تو میری جان ہو۔ بیوی ہو میری، ذمے دار ہوں

میں اب تمہارا۔“ وہ اب بھی پیار سے سمجھا رہا تھا۔

”تم صرف میری ذلت و رسوائی اور جگ ہنسائی کے ذمے دار ہو، تم میرے اماں ابا کی  
موت کے ذمے دار ہو۔ تم قاتل ہو میرے ماں باپ کے تم نے میری بے رخی اور انکار کا بدلہ لیا ہے  
نا، مجھے اس طرح سے رُسوا اور اکیلا کر کے۔ بہت گھٹیا انسان ہو تم، نفرت ہے مجھے تم سے شہید  
نفرت..... کوئی چیز نہیں ہے میرے دل میں تمہارے لئے سنا تم نے۔“ وہ نفرت اور غصے سے چیخ کر  
بول رہی تھی اور مامون کی دجیاں کبھی رہی تھی۔ اس نے بمشکل دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے  
بچایا تھا۔ کتنی دیر تک تو وہ صدمے اور دکھ کے باعث کچھ بول ہی نہ سکا پھر بولا تو لہجہ نہایت نرم تھا۔

”تم ہمیشہ سے مجھ سے نالاں رہی ہو کیوں؟ میں نہیں جانتا لیکن رانیہ علی تم سے اتنا  
ضرور کہوں گا کہ تم بدگمانی کے کوہ ہمالیہ پر کھڑی ہو جہاں سے تمہیں میری ذات بہت چھوٹی اور حقیر  
دکھائی دے رہی ہے۔ ٹھیک ہے تم مجھ سے نفرت کرو، نہ رہو میرے ساتھ، لیکن تمہاری ماں نے  
مرتے وقت مجھ سے منت کی تھی کہ ”مامون بیٹا رانیہ بہت جذباتی اور نادان لڑکی ہے اس کی کسی  
نادانی کی وجہ سے نکاح کا یہ بندھن کبھی مت توڑنا۔“ یہ ان کی وصیت اور میری محبت کا تقاضا ہے  
رانیہ مامون خیاں کہ میں تمہیں اس رشتے سے جوڑے رکھوں، میں تمہیں اس بندھن سے کبھی آزاد  
نہیں کروں گا۔ ہاں اگر تمہیں آزادی چاہئے تو پھر میری موت کی دُعا مانگنا کیونکہ میری موت ہی  
اب اس بندھن سے تمہیں رہائی دلا سکتی ہے۔“ مامون نے اپنی بات مکمل کی اور بہت تیزی سے  
”امجد ہاؤس“ کی دہلیز عبور کر گیا۔

مامون کو رانیہ کے رویے، جیلے اور لہجے نے اس کی نفرت نے اندر سے چکناچور کر دیا تھا  
وہ بہت رویا تھا گھر جا کر رب سے اپنی محبت کی بھیک مانگی تھی۔ درد اتنا تھا کہ وہ ہفتہ بھر بیمار پڑا رہا۔  
آفس میں اس کی ذہانت، صلاحیت اور قابلیت کے سبب جاب پکی ہو چکی تھی اس لئے اسے بیماری  
کی حالت میں چھٹی بھی باسانی مل سکتی تھی مگر وہ آدمے دن کے لئے آفس جاتا رہا۔ رانیہ کی طرف  
جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی پھر جب بخارا تر گیا طبیعت سنبھل گئی تو وہ نفرت میں ڈوبے لنگھوں کی  
مار کھانے کے لئے پھر سے ”امجد ہاؤس“ کی طرف چل دیا، لیکن وہاں پہنچ کر اسے ایک اور صدمے  
سے دو چار ہونا پڑا، رانیہ ”امجد ہاؤس“ دو سال کے لئے کرائے پر دے کر شہر چھوڑ کر جا چکی تھی۔  
کہاں یہ کسی کو معلوم نہیں تھا حتیٰ کہ کرائے داروں کو بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ دو سال کی پیشگی رقم کی  
ادائیگی انہوں نے کسی وکیل کے ذریعے معاہدے کے تحت کر دی تھی۔ مامون گرتا پڑتا مجید مامون  
کے گھر پہنچا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ خود بھی رانیہ کے اس طرح اچانک بن بتائے گھر

اور شہر چھوڑ کر چلے جانے پر خامسے پریشان تھے۔

☆☆☆

”میں برس کی لڑکی پہ اس کے اپنے ہی گھر میں زمین بھگ کر دی گئی تھی۔ وہ بے چاری کیوں نہ یہاں سے جاتی اور مامون بیٹا تم نے بھی اُسے اکیلا چھوڑ دیا یہاں تمہارا اپنا گھر ہے تم اُسے وہاں لے جاتے، ہر کوئی اُسے الزام دے رہا تھا۔ اب تمہاری ماں نے بھی کم باتیں تو نہیں سنا کیں تھیں اسے، مجھے لگتا ہے کہ رانیہ انہی کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر یہاں سے چلی گئی ہے۔“

رخسانہ مجید نے ہمدردانہ اور تاسف زدہ لہجے میں کہا تو مامون نے حیرت اور بے چینی سے پوچھا۔

”مئی نے رانیہ سے کیا کہا تھا۔“

”بیٹا! میں نے اپنے کانوں سے ان کا فون سنا تھا، مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، چھوڑ بیٹا ناحق میری سچی بات سے تمہارے گھر میں بد مزگی ہوگی اور ہمارے تعلقات بھی خراب ہوں گے۔“

رخسانہ مجید نے چالاکی سے بات گول کر دی تاکہ وہ اصرار کر کے پوچھے۔

”آئی! آپ کا نام نہیں لوں گا میں کسی سے، پلیز مجھے بتائیے مئی نے رانیہ سے کیا کہا تھا؟“ وہ بے چینی سے پوچھ رہا تھا۔

”بیٹا، سلی بیگم نے تو حد کر دی تھی کہہ رہی تھی کہ میرے بیٹے کا بچھا چھوڑ دو، میں تم جیسی بدنام اور بدکردار لڑکی کو کبھی اپنی بیوی نہیں بنائوں گی۔ تم نے مامون کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا دیا ہے اسے آزاد کر دو، اس کی زندگی سے دور چلی جاؤ ورنہ بچھتاؤ گی۔“ رخسانہ مجید نے کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی لگا کر اسے بتادی تھیں۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مئی اس قدر فضول باتیں بھی کہہ سکتی ہیں۔“ مامون نے دوہرے صدمے سے دوچار ہوتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! کیا تم نے انہیں اپنے اور رانیہ کے نکاح کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟“ مجید نے مامون نے پوچھا۔

”میں نے ڈیڑی کو نکاح سے پہلے اعتماد میں لے لیا تھا، انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا میرے رانیہ سے نکاح پر وہ تو میری خوشی میں خوش تھے۔ انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں مئی کوئی الحال اس نکاح کے متعلق نہ بتاؤں وہ خود ہی انہیں موقع دیکھ کر بتا دیں گے۔ پتہ نہیں انہوں نے مئی کو اب تک بتایا ہے کہ نہیں۔ رانیہ مئی کی اپہ سے گھر چھوڑ گئی ہے مائی گاڑ۔“ مامون نے دکھ سے کہتے ہوئے اپنا

سر پکڑ لیا۔

”کیا خبر بیٹا! وہ واقعی کسی اور میں انٹرنلڈ ہو جی جی تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ گئی، ورنہ اتنی بدنامی کے بعد بھی اسے ایک معزز اور شریف شخص کی بیوی بننے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہئے تھا اور تمہارے ساتھ بخوشی رہنا چاہئے تھا۔“ رخسانہ مجید نے سنجیدگی سے کہا تو شبانہ نے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

”اور ای! رانیہ کے ہمسائے بتا رہے تھے کہ وہ کسی نوجوان کے ساتھ لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر گئی ہے، پتہ نہیں وہ کون تھا، اب تو محلے والے رانیہ کو اور زیادہ برا کہہ رہے ہیں کہ ماں باپ کے مرتے ہی اُسے اپنی آوارگیوں کے لئے عیاشیوں کے لئے آزادی مل گئی تھی جی تو اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی گئی تو بے توبہ.....“

”میں چلتا ہوں۔“ مامون سے مزید برداشت نہ ہوا تو اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ان کے لاکھ روکے سے بھی نہیں رکا۔

تین دن بعد مامون کو ایک لفافہ ڈاک کے ذریعے موصول ہوا اس نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں رانیہ کی تین چار تصویریں بھی موجود تھیں اس کے ساتھ نجانے کون لڑکے تھے۔ بہت ہی بے ہودہ پوز میں کھینچی گئی تھیں یہ تصاویر، مامون کا پورا بدن آگ کی طرح سلگنے لگا تھا۔ وہ بہت غور سے چاروں تصویریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک چونک گیا اور پھر ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھنے بعد اُسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ رخسانہ مجید نے رانیہ کی کالج کے فنیسی ڈریس شو میں دلہن کا روپ دھانے والی جو تصویر بیگم صغیر کو دکھائی تھی وہی تصویر مامون رانیہ کے کمرے میں اس کی البم میں بھی دیکھ چکا تھا اور تصویر کے پیچھے لکھی تحریر بھی اس نے پڑھی تھی وہی تصویر ان تصویروں میں بھی موجود تھی۔ جس سے مامون کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ضرور کسی کی شرارت ہے اور باقی تصویریں بھی جعلی ہیں، اس نے وہ تصویریں جو لمبے پر رکھ کر جلا دیں۔

”رانیہ کہاں چلی گئی، تو تم میری محبت سازشوں کی زد میں ہے کون کر رہا ہے یہ میرے ساتھ..... مجھے تم سے بدگمان کرنے کی پلاننگ کس کی ہو سکتی ہے؟ کیا مئی؟ وہ تو یہ سب نہیں کر رہیں؟“ وہ بے چین و بے قراری سے خود سے سوال کر رہا تھا۔

”رخسانہ آئی، نہیں، پھر کون ہو سکتا ہے؟ مجھے مئی سے بات کرنی چاہئے۔“ وہ سوچ رہا تھا کہ سلی بیگم کا فون آ گیا۔

”السلام علیکم مئی!“ مامون نے اپنا موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”وعلیکم السلام! کہاں ہو تم؟“

”گھر پر ہی ہوں۔“

”رانیہ کے گھر پر۔“ سلی بیگم کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

”جی نہیں اپنے گھر پر ہوں۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے می؟“

”ٹھیک ہے میری طبیعت اور یہ تم نے کیا حرکت کی ہے چوری چھپے رانیہ سے نکاح کر لیا

اور مجھے اب تمہارے ڈیڑی نے بتایا ہے۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”کیونکہ اس وقت ہمیں معلوم تھا کہ آپ انکار کر دیں گی نہیں مانیں گی۔“ وہ افسردگی سے

بولتا تو انہوں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”مانوں گی تو میں اب بھی نہیں، میں اس آوارہ لڑکی کو اپنے گھر میں قدم بھی نہیں رکھنے

دوں گی۔ سنا تم نے فوراً سے پہلے اُسے طلاق دے دو۔“

”سوری می میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا اور آپ نے رانیہ کو فون کیا تھا نامی۔“

”اُس نے شکایت کی ہوگی۔“ سلی بیگم نے کہا۔

”اُس نے تو کچھ بھی نہیں کہا اور اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر نجانے کہاں چلی گئی ہے۔ آپ

خوش ہو جائیے می رانیہ مجھے چھوڑ گئی ہے یہی چاہتی تھیں ناں آپ۔“ مامون نے دھکی لہجے میں کہا۔

”وہ ایسے کیسے جاسکتی ہے؟“ سلی بیگم نے سکون کا سانس لے کر پوچھا۔

”وہ چلی گئی ہے اور کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں گئی ہے؟“

”تو اب تم اسی بات سے اعزاز لگا لگو کہ وہ کس کردار کی مالک ہے، اس کا ضرور کسی سے

معاشقہ چل رہا ہوگا ماں باپ کے مرتے ہی اُسے کھلی آزادی مل گئی اور وہ بھاگ گئی اپنے آشنا کے

ساتھ۔ اُسے تو یہ بھی خیال نہیں آیا ہوگا کہ اس کا نکاح ہو چکا ہے اور وہ اب کسی کی امانت ہے۔ تم تو

اس کی محبت میں اندھے ہو گئے ہو سارا شہر جو کہہ رہا ہے وہ کیا پاگل ہے۔ اگر رانیہ کو تم سے محبت

ہوتی، اسے رشتے کی قدر پاس لحاظ ہوتا تو وہ یوں تم سے چوری چھپے گھر اور شہر چھوڑ کر کبھی نہیں جاتی،

صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتی تھی تم سے جموٹی محبت کا کھیل کھیلا تھا اس نے۔“ سلی بیگم نے

سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اس نے مجھ سے محبت کا کوئی کھیل نہیں کھیلا بلکہ وہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے می۔“

”نفرت؟“

”جی ہاں می! رانیہ آپ کے اس شاعر اور ڈھنگ بیٹے سے شدید نفرت کرتی تھی۔“ وہ

کاٹتی آواز میں بولا۔

”اور تم پھر بھی اس کے لئے مرے جا رہے ہو۔“

”ہاں میں رانیہ کے لئے مر سکتا ہوں لیکن کسی اور لڑکی کے لئے ہاں کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ

بد کردار نہیں ہے می وہ بہت با کردار اور باحیا لڑکی ہے، بس میرے متعلق غلط فہمی اور بدگمانی میں جلا

ہے۔“ مامون نے دکھ اور بے بسی سے بھینکتی آواز میں کہا۔

”رانیہ تم سے نفرت کرتی ہے اس کا مطلب کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے تم سے

چھٹکارا چاہتی ہے اور تم۔“

”پلیز می، بس کیجئے۔“ وہ تڑپ کر بولا اپنی محبت کی نفرت اس کی روح تک کو گھائل کر

رہی تھی۔

”مومن میرے چاند بیٹا، بھول جاؤ اسے تمہارے لئے ایک سے ایک اچھی لڑکی مل جائے

گی۔“ سلی بیگم نے قدرے نرمی اور محبت سے کہا۔

”مگر مجھے تو صرف ایک ہی اچھی لڑکی چاہئے اور وہ ہے رانیہ۔“

”وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔“ سلی بیگم نے کہا لہجہ غصیلے اور تیز تھا۔ مامون نے تڑپ کر

موبائل آف کر دیا۔

”کیا یہ سب لوگ صحیح کہہ رہے ہیں؟ کیا رانیہ واقعی بُری لڑکی ہے، کیا وہ کسی اور کو چاہتی

ہے اور اُسی کے ساتھ گئی ہے، مجھ سے نکاح کے باوجود کسی اور کے ساتھ چلی گئی۔“

..... نہیں۔ میری محبت اتنی بُری نہیں ہو سکتی، نہیں ہے وہ بد کردار۔“ نہیں۔“

مامون خود سے سوال جواب کرتا بچوں کی طرف پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

وقت کا پینچمی اپنے پروں میں تین سال سمیٹ کر لے گیا تھا۔ مامون ضیاء کی زندگی کے

قیقی تین برس رانیہ کی یادوں سے آباد گزر رہے تھے۔ ایک لمحہ بھی اس دوران ایسا نہیں آیا کہ وہ رانیہ کو

اس کی معصوم اور من موئی صورت کو بھول پایا ہو۔ سب گھر والے اسے شادی کے لئے آمادہ کرنے کی

کوشش کر کر کے تھک گئے تھے مگر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ ”شادی تو میری رانیہ سے ہو چکی ہے۔“

اکثر راتوں کو تنہائی کے گھپ اندھیرے میں رانیہ کی جدائی کا درد بڑھ جاتا تو وہ بے

اختیار اٹھکبار ہو جاتا، دُعاؤں میں رب سے اُس کی واپسی کی اس کے ملن کی، اُس کے پیار و اعتبار

بھرے ساتھ کی فریاد اور درخواست کیا کرتا تھا اور..... رانیہ!!

رانیہ شہر چھوڑ کر اپنی کالج کی پرنسپل فرحت نسیم کی بہن مدحت نسیم کے پاس اسلام آباد آگئی



مامون کی پیار بھری شریر اور شوخ جساتیں اسے یاد آئیں تو جانے کیوں اس کے اندر اُداسیوں کے قافلے اترنے لگتے۔

”کیوں..... مامون ضیاء کیوں یاد آتے ہو مجھے؟“ رانیہ خود سے الجھتی اور اسے ایسے مخاطب کر کے کہتی جیسے وہ سامنے کھڑا سن رہا ہے۔

مدحت نسیم اسے بارہا مامون سے رابطے کے لئے کہہ چکی تھیں۔ اُسے سمجھا چکی تھیں کہ مامون اس سے سچی محبت کرتا ہے مگر وہ اسے خود چھوڑ کر آئی تھی اب خود سے رابطہ کرنا اسے گوارہ نہ تھا اور وہ اس کو مجرم سمجھتی تھی اپنی سیرت و کردار کا، وہ بھلا اسے کیسے معاف کر دیتی۔ وہ تیس برس کی ہوئی تھی اور پوری عمر تنہا کانٹا اکیلی لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی۔ مدحت نسیم اُسے سمجھاتی تھیں جب سے وہ فلیٹ میں شفٹ ہوئی تھی تب سے ان کی نصیحتیں زور پکڑتی جا رہی تھیں، انہیں رانیہ کے اکیلے رہنے کی وجہ سے ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی تھی۔ ایک دن رانیہ اسکول کے لئے فلیٹ سے باہر نکلی تو ایک آوارہ مزاج لڑکے نے اس کا راستہ روک لیا۔

”یہ صبح سویرے تم بن ٹھن کر کہاں جاتی ہو؟“ لڑکے نے خباثت سے پوچھا۔

”تم سے مطلب!“ رانیہ نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر سختی سے کہا۔

”مطلب پورا کرو تو ابھی بتا دوں سنا ہے اکیلی رہتی ہو..... تنہا ہو..... کہو تو میں آجایا کروں رات کو تمہاری تنہائی دور ہو جائے گی اور میری بے قراری بولبو منظور ہے۔“ اس لڑکے نے کمینگی سے کہا اس کی آنکھوں میں شیطانیٹ فک رہی تھی۔ رانیہ کو پہلی بار ایسی صورت حال سے واسطہ پڑا تھا اس کے تو رو ٹکٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

”اپنے لئے اپنے جیسی آوارہ اور بے حیا لڑکی تلاش کرو، ہٹو میرے راستے سے۔“ وہ غصے سے بولتی اسے دھکا دے کر تیزی سے آگے بڑھ گئی وہ لڑکا کمینگی سے قہقہہ لگا کر نرس پڑا۔

رانیہ کو اس وقت رونا آرہا تھا مگر ضبط کرتی ہوئی جیسے تیسے اسکول پہنچ گئی۔ مدحت نسیم نے اسے وائس پر نکل بنا دیا تھا۔ وہ سیدھی مدحت نسیم کے آفس میں گئی تھی۔ مدحت نسیم ابھی اپنی چٹنی تھیں۔ اس کی حواس باختہ صورت دیکھ کر فکر مندی سے اس کی طرف بڑھیں۔

”کیا ہوا رانیہ؟“ رانیہ نے روتے ہوئے ساری بات بتا دی۔ انہیں بہت افسوس ہوا تھا

سن کر۔

”کتنی بار سمجھا چکی ہوں تمہیں کہ عورت کو اس معاشرے میں مرد کے بغیر کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے اکیلی لڑکی یا عورت کا جینا حرام کر دیتے ہیں لوگ تم انکیسی میں رہ رہی تھیں میرے ساتھ

تھی۔ وہیں وہ ان کی انکیسی میں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنے لگی اور ساتھ ہی ان کے سکول میں جاب بھی شروع کر دی تھی۔ فرحت نسیم نے مدحت نسیم کو رانیہ کی دکھ بھری کہانی سنا دی تھی، اس لئے انہیں رانیہ سے دلی ہمدردی تھی وہ اُسے چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ رانیہ نے زندگی کے دکھوں اور غموں کو بھلانے کے لئے اپنی تعلیم بھی ساتھ ساتھ جاری رکھتے ہوئے بی ایڈ اور ایم اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اس کی تنخواہ میں اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ دو ماہ پہلے اسے مدحت نسیم کی انکیسی سے فلیٹ میں شفٹ ہونا پڑا تھا۔ کیونکہ مدحت نسیم کے دیور اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ وہاں رہنے کے لئے آگئے تھے۔ فلیٹ کا چھ ماہ کا کرایہ رانیہ نے ایڈوائس دے دیا تھا۔ ”مجھ ہاؤس“ کا کرایہ بھی وہ اب فلیٹ کے کرائے میں دینے کے لئے استعمال کر رہی تھی ورنہ اب تک وہ رقم بینک اکاؤنٹ میں جمع تھی۔ آس پاس کے فلیٹوں میں رہنے والوں سے رانیہ کی بس سکول آتے جاتے ہی راستے میں سلام دُعا ہوتی تھی۔ اسی لئے اسے ان لوگوں کے مزاج علم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ لوگ کیسے ہیں؟ البتہ ان لوگوں کو ضرور تجسس رہتا تھا کہ یہ حسین و جمیل لڑکی کون ہے اور یہاں اکیلی کیوں رہتی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کیوں آئی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

رانیہ نے خود کو لاکھ مصروف کر لیا تھا لیکن مامون ضیاء اسے بھی بھولا نہیں تھا۔ جس طرح مامون کو اس کے ساتھ بیٹا ہر لمحہ یاد تھا اسی طرح وہ بھی ان لمحوں کو فراموش نہیں کر پاتی تھی۔ رات کو جب بھی سونے کے لئے لیٹی مامون آنکھوں میں نیند کی جگہ آہستہ اور اسے حیرت ہوتی تھی اپنے آپ پر کہ اب اسے مامون سے پہلے کی طرح نفرت بھی محسوس نہیں ہوتی تھی شاید گزرے وقت نے اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی کہ نجانے اس کے وہاں سے چلے آنے کے بعد مامون نے کیا سوچا ہوگا اس کے بارے میں؟ اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟ کیا اُس نے اُسے تلاش کیا ہوگا؟ کیا مامون اب تک اس کی محبت میں تنہائی کا عذاب جھیل رہا ہوگا یا اس نے اپنا گھر بسالیا ہوگا۔

مامون نے اسے نکاح کی جو تصاویر دی تھیں رانیہ اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی اور تقریباً ہر روز وہ البم دیکھتی اور حیران ہوا کرتی کہ مامون کے مقابلے میں وہ تو کچھ بھی نہیں تھی وہ اس سے زیادہ ڈشنگ، اسارٹ اور گڈ لکنگ تھا پھر اس نے اسی سے محبت کیوں کی؟ مامون نے نکاح کی رات جو کنگن اسے پہنائے تھے وہ آج بھی اس کی کلائی کی شان بڑھا رہے تھے اسے ایک لمحے کو بھی یہ کنگن خود سے الگ کرنے کا خیال نہیں آیا..... وہ جب بھی یہ کنگن اپنی کلائی میں گھماتی اسے سرگوشی سی سنائی دیتی۔

”کاش! میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوگا۔“

باہر آتی جاتی تھیں، اس لئے تمہیں کبھی عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ اب تم اکیلی رہ رہی ہو، اکیلے باہر آتی جاتی ہو تو دیکھ لیا تم نے اس معاشرے کے مردوں کا رویہ..... تم تو ایک ہی جھکے میں ڈھیر ہونے لگیں اور لڑکا بھلا اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑے گا..... اسے پتا ہے کہ تم اکیلی ہو لہذا وہ تمہیں پریشان ضرور کرے گا۔“ مدحت نسیم نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپنی! میں کیا کروں اب؟“

”اپنے شوہر سے رابطہ کرو۔“

”یہ مجھ سے نہیں ہوگا اور وہ تو جیسے ان تین برسوں کی بے رُخی اور لاتعلقی بھلا دیں گے ناں..... وہ بھی مجھے اوروں کی طرح بُرا ہی کہتے اور سمجھتے ہوں گے اور انہوں نے مجھے حاصل کرنے کے لئے جو کچھ کیا“ وہ جھپکتے لہجے میں بولی۔

”اس کے لئے مامون ضیاء کو معاف کر دو، کیونکہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے اوّل تو مجھے نہیں لگتا کہ مامون نے اپنی محبت کو بدنام کیا ہو، تم واپس چلی جاؤ رانیہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔“ مدحت نسیم نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

”آپنی! میں اُس شخص سے تحفظ اور ساتھ کی بھیک نہیں مانگ سکتی۔“ رانیہ یہ کہہ کر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر آفس سے باہر چلی گئی۔

”اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا ورنہ یہ لڑکی سچ سچ اس معاشرے کے ہاتھوں کھلوٹا بن جائے گی۔ تنہا ہو جائے گی ہمیشہ کے لئے۔“ مدحت نسیم نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا اور اپنا پرس کھول کر ڈائری میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔

اگلے روز رانیہ اسکول میں اپنی کلاس کو پڑھائی تھی جب چہڑی نے اسے اطلاع دی کہ پرنسپل صاحبہ اسے آفس میں بلا رہی ہیں۔ بریک ٹائم ہونے والا تھا وہ کلاس کو پڑھنے کی تاکید کر کے پرنسپل مدحت نسیم کے آفس کی طرف چلی آئی وہ اسے آفس کے باہر ہی ٹہلتی مل گئیں

”خیریت آپنی! آپ نے پہلے تو کبھی مجھے اس طرح نہیں بٹوایا؟“ رانیہ نے ان کے قریب پہنچ کر فکر مندی سے استفسار کیا۔

”رانیہ!“ تمہارے مہمان میرے آفس میں بیٹھے ہیں ان سے جا کر مل لو میں ذرا اسکول کا راولڈ لگاؤں اور سنو رانیہ دوبارہ کوئی نادانی مت کرنا میٹ آف لک جاؤ شاہپاش۔“ مدحت نسیم نے نرمی سے کہا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے آفس میں جانے کا اشارہ کیا وہ تاجگی کے عالم میں دیکھتی ہوئی حیران حیران سی آفس میں داخل ہو گئی۔ دائیں جانب مہمانوں کو بٹھانے کا اہتمام

تھا، صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہاں رانیہ نے دیکھا ایک شخص اخبار اپنے سامنے پھیلائے بیٹھا تھا۔ ”کون ہے یہ؟“ رانیہ نے خود سے سوال کیا۔ ”السلام علیکم!“ رانیہ نے آگے بڑھتے ہوئے اسلام کیا تو اس شخص نے فوراً اخبار اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا دیا۔ رانیہ کی نگاہوں کے سامنے جو چاند چہرہ تھا وہ اس کے وجود میں اپنی چاندنی کا ایک پھیلا تا چلا گیا۔

”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!“ وہ خوشگوار لہجے میں جواب دیتا اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”مامون!“ رانیہ کے یا قوتی لب واہوئے۔

”جی مسز مامون! شہر شہر کی خاک چھانی تھی، آج کل یہاں بسیرا تھا۔ فضا میں تمہاری سانسوں کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی اور بالآخر ایک مہربان کے وسیلے سے میں تم تک پہنچ ہی گیا نا۔ ڈھونڈ لیا ناں میں نے تمہیں۔“ مامون ضیاء مجسم آنکھ بنا اسے دیکھتے ہوئے بہت نرم اور مسرور لہجے میں کہہ رہا تھا۔ رانیہ کی آنکھوں میں حیرت تھی زبان گنگ تھی، وہ بس اسے دیکھے جا رہی تھی جو آج بھی یوسف ثانی تھا، ہاں البتہ پہلے سے کچھ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا لہجہ آج بھی نرم اور محبت سے پُر تھا جبکہ رانیہ سوچ رہی تھی کہ مامون ضیاء کو تین سال کی جدائی پر غصہ ہونا چاہئے تھا اور وہ اس کے خاموشی سے چھوڑ کر چلے آنے پر اتنے پیار سے مخاطب کر رہا تھا۔ یکا یک مامون کا ہاتھ اٹھا اور رانیہ سمجھی کہ وہ اسے تھپہ مارنے لگا ہے، اس نے خوف سے آنکھیں میچ لیں اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مامون کا ہاتھ اس کے دائیں رخسار پر نرمی سے آکر ٹھہر گیا۔ رانیہ نے ایک عجیب سی تازگی اپنے اندر اترتی محسوس کی اور آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کو دیکھا وہ محبت بھری شکایت کر رہا تھا۔

”کیوں کیا تم نے مجھ پر یہ ظلم؟“

ہم تو مجبور وفا ہیں مگر اے جان جہاں

اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے؟“

رانیہ کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا حتیٰ کہ وہ شدید نفرت اور بدگمانی جس کے سبب وہ اسے خاموشی سے چھوڑ آئی تھی وہ بھی کہیں نہیں تھی۔ وہ جانے کے لئے مڑی تو مامون نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“

”میں اپنی کلاس لینے جا رہی ہوں۔“ مری مری سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔

ورٹنگ کارڈ رانیہ کے پرس میں دیکھا تھا اور جانے کس خیال کے تحت انہوں نے مامون کے موبائل نمبرز، ای میل ایڈریس اور گھر و دفتر کے فون نمبرز اپنی ڈائری میں نوٹ کر لئے تھے اور انہوں نے ہی مامون سے فون پر رابطہ کر کے اسے رانیہ کے متعلق بتایا تھا۔ مامون جو بھرتے بھر سے اسلام آباد میں ہی تھا۔ کمپنی آفس سیٹ کرنے اور رانیہ کو تلاش کرنے کا خیال لے کر ہی وہ یہاں آیا تھا اور اسے ہر راستے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ مدحت نسیم کی فون کال نے اسے زیت افروز خبر سنا کر پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کی لگن کچی تھی شاید اسی لئے اب قدرت کو اس کی حالت پر رحم آ گیا تھا اور اس نے مدحت نسیم کو رانیہ سے مامون کی ملاقات کا وسیلہ بنا دیا تھا۔

رات کے سوا نو بج رہے تھے۔ رانیہ کھانا مدحت نسیم اور ان کی کی فیملی کے ساتھ کھانے کے بعد اب گھر واپس جانا چاہ رہی تھی۔

”رانیہ بیٹا! رات یہیں رک جاتیں صبح تو چھٹی ہے نا۔“ مدحت نسیم کے شوہر ذاکر صدیقی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”جی بھائی، لیکن چھٹی والے دن مجھے گھر کے کام پھانا ہوتے ہیں اس لئے رک نہیں سکتی آپ پلیز مجھے گھر تک ڈراپ کریں۔“

”ہاں ذاکر آپ رانیہ کو چھوڑ آئیں اکیلی کیسے جائے گی یہ۔“

”ٹھیک ہے چلو بیٹا۔“ ذاکر صدیقی گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولے اور رانیہ ان کے ساتھ چلی آئی جس وقت ذاکر صدیقی رانیہ کو فلیٹس کے احاطے میں ڈراپ کر کے جا رہے تھے، وہاں وہی آوارہ لڑکا کھڑا تھا اپنے جیسے ہی ایک اور لڑکے کے ساتھ وہ رانیہ کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر پیچھے چلا آیا اور خباثت سے بولا۔

”یہ سواری باڈ بھاری کہاں سے آرہی ہے حسینو! شام کو بھی یہاں ایک بندہ تمہارا پوچھ رہا تھا، بڑا انتظار کیا ہے چارے نے تمہارے گھر کے باہر ٹہل ٹہل کر..... اور تم اسے ٹائم دے کر اس گاڑی والے کے ساتھ ٹائم گزارنے چلی گئیں۔“

”بکواس بند کرو وہ بھائی ہیں میرے۔“ رانیہ غصے سے بولی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”او کیسا بھائی ہے یہ جو اپنی حوروں جیسی بہن کو تنہا رہنے کے لئے قلیٹ میں چھوڑ گیا ہے۔ بھائی کے گھر میں بہن کے لئے ایک کمرہ ایک بستر تک نہیں ہے..... ہا ہا ہا..... کیوں بے وقوف بناتی ہو۔ ایک رات ہمیں بھی دے دو۔“

”گھنیا آدمی، ہنومیرے راستے سے۔“ رانیہ شرم اور غصے سے انکارہ ہوتے ہوئے بولی تو

”حالانکہ کلاس تو مجھے تمہاری لگتی چاہئے۔“ مامون کا معنی خیز جملہ اسے شرمندہ سا کر گیا وہ روبرو ہو کر سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے، تو لیس میری کلاس۔“

جواب میں مامون نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے کر اس کی پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی۔

”مامون!“ وہ تڑپ کر بولی اور اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر ہٹایا۔ وہ اس کی محبتوں پر حیران تھی جو اس کی شدید نفرت اور تین سال کی بے رخی اور لائقیت کے باوجود اس پر یوں اپنی محبت کے پھول پھلا کر رہا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ تین برس بچ میں آئے ہی نہ ہوں اور وہ رانیہ کی نفرت سے آگاہ ہی نہ ہو۔ یہ کیسی محبت تھی اسے رانیہ سے؟

”میں تو تمہاری زبان سے اپنا نام سننے کو ترس گیا تھا۔ آج تم نے میرا نام لیا ہے تو مجھے احساس ہوا ہے میں ابھی زندہ ہوں۔“ مامون نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ہونٹوں کو نرمی سے چھوا۔

”پلیز آپ جاییے یہاں سے یہ اسکول ہے آپ کا بیڈروم نہیں ہے۔“ وہ شپٹا کر بولی تو اس نے اس کیفیت و حالت سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے پھر میں تم سے بیڈروم میں ہی ملوں گا شام چار بجے تم سے تمہارے گھر پہ ملاقات ہوگی۔“

”گھر پہ.....“

”ہاں تمہارا گھر میں دیکھ چکا ہوں، ٹھیک چار بجے آؤں گا اوکے بائے۔“ مامون نے اس کی حیرانگی دور کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اس کا گال تھپتھا کر وہاں سے چلا گیا اور وہ اپنا دل تمام کروہیں صوفے پر ڈھسے سی گئی۔ اس کا رواں رواں مامون کے محبت بھرے لمس کی حدت و حرارت سے جل رہا تھا۔ دل کی کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہنے سننے کی حالت میں نہیں تھی سوا اس سے بچنے کے لئے اسکول کے بعد پہلے اپنی کوئیگ اور دوست فرخندہ کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تاکہ ہفتے بھر کی سبزی بیکری کا سامان اور دیگر اشیاء خرید سکے وہ گھر آ کر کچن میں رکھنے کے بعد نہا کر تیار ہوئی نماز ادا کی اور تین بجے وہ نمائش دیکھنے چلی گئی۔ وہاں سے فارغ ہوئی تو مدحت نسیم کے گھر آ گئی، وہ مامون سے فرار اختیار کرنے کے لئے گھر جانے سے کترار ہی تھی، لیکن اس کے دل و دماغ میں مامون ہی گھوم رہا تھا۔ مدحت نسیم نے ہی بہت پہلے مامون کا



قلیوں میں رہنے والے ایک بزرگ کی آواز آئی۔

”اے ٹوٹی کے بچے تو نے پھر کینگی شروع کر دی، ہٹ پرے جانے دے بچی کو ورنہ تیرا سر پھاڑ دوں گا۔“

”او بزرگو! اللہ اللہ کیا کرو، ہر آنے جانے والے پر نظر نہ رکھا کرو۔“ ٹوٹی جو رانیہ کو پریشان کر رہا تھا نے بزرگ کو دیکھتے ہوئے چڑ کر کہا اور رانیہ موقع غیبت جانتے ہوئے تیزی سے اپنے قلیٹ کی طرف دوڑی، لاک کھول کر اندر آتے ہی لاک اچھی طرح لگا دیا۔

”یا اللہ! مجھے اس شیطان کے شر سے محفوظ رکھنا۔“

رانیہ نے بے اختیار یہ دُعا مانگی اور چادر اُتار کر وہیں صوفے پر رکھنے کے بعد کچن میں آکر پانی بیا، وضو و محبت نسیم کے گھر پر ہی کر چکی تھی اب عشاء کی نماز ادا کر کے سونا چاہتی تھی کیونکہ آج سارا دن ادھر ادھر مزگشت کرتے کرتے وہ خاصی تھک چکی تھی اور اس وقت تو مامون کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنے بیڈروم میں داخل ہو کر لائٹ آن کی تو کمرہ سفید روشنی سے بھر گیا اور اس کی آنکھیں حیرت سے..... مامون خیاہ اس کے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ آسانی رنگ کے شلوار قمیض میں وہ بہت نکھر نکھر الگ رہا تھا اور لائٹ آن ہوتے ہی اٹھ بیٹھا تھا۔

”تم!“ رانیہ کو پہلے ہی غصہ چڑھا ہوا تھا مزید تپ کر بولی۔

”ہاں میں..... میں نے کہا تھا ناں کہ پھر بیڈروم میں ہی ملوں گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا نظریں اس کے دھلے دھلے میک آپ سے مبرا چہرے پر جمی تھیں۔

”تمہیں جرات کیسے ہوئی میرے بیڈروم میں آنے کی اور میرے بیڈ پر لیٹنے کی؟“ وہ غصے سے بولی تو وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”میں تمہارا شوہر ہوں، میرا حق ہے تمہاری ہر چیز پر اور تم پر۔“ مامون نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کی ٹھوڑی کو چھوا تو اس نے زرخ پھیر لیا۔

”تمہیں تو شام کو آنا تھا۔“ رانیہ نے کہا۔

”شام کو ہی آیا تھا لیکن تم جان بوجھ کر گر کر لاک لگا کر غائب ہو گئیں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے محنت آپنی کو فون کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا وہاں چائے وغیرہ پینے کے بعد میں ان سے تمہارے قلیٹ کی ڈوپٹی کیٹ چابی لے کر یہاں آ گیا۔ ویسے گھر اچھا سجایا ہے تم نے اپنا اصل گھر یقیناً تم اس سے زیادہ خوبصورت سجاؤ گی ہے ناں۔“ مامون نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا وہ کچھ نہیں بولی چند لمحوں کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی کہنے لگا۔

”تم تو کھانا کھا کر آئی ہو، میں نے بھی تمہارے کچن سے فریج سے ڈبل روٹی اٹھائے اور کباب نکال کر اپنی بھوک مٹائی تھی اب اگر تم اپنے ہاتھ کی بنی چائے پلا دو تو مزا آجائے۔“

”زہر نہ پلا دو۔“ وہ غصے سے بولی۔

”جدا کی کا زہر کیا کم تھا مجھے مارنے کے لئے ہوں۔“ مامون نے سنجیدگی سے کہا تو وہ نظریں چڑا کر جانے لگی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”دوسرے بیڈروم میں سونے جا رہی ہوں بہت تھک گئی ہوں میں۔“

”تو میں ہوں نا تمہاری تھکن دور کرنے کے لئے یہاں آؤ۔“ مامون نے شوخ و شریر لہجے میں کہتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ اس کے سینے سے آکر لڑائی۔

”مومن پلیز!“ وہ بے ساختہ بولی اور اس کے دل کے تار ہلا گئی۔

مامون کی نگاہ اس کی کلائی میں موجود اپنے اس پیار بھرے تجھے پر پڑی جو اس نے نکاح کے بعد رونمائی کے طور پر اسے نکتن کی شکل میں پہنائے تھے۔ مامون کے دل و روح میں خوشی اور اطمینان کے پھول کھلنے لگے۔ رانیہ کے دل میں اگر اس کے لئے گنجائش نہ ہوتی تو وہ اس کے اس تجھے کو اب تک اپنی کلائی سے کیوں لگائے رکھتی؟

”کب ختم ہوگی تمہاری یہ نفرت؟“ مامون نے نرمی سے پوچھا۔

”کبھی نہیں۔“

”نمذی بات ایسے نہیں کہتے۔“ مامون نے بہت محبت سے کہتے ہوئے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

”چھوڑ دیجھے۔“

”اول ہوں، تین برس کی نشی مٹانی ہے۔ کیسے چھوڑ دوں تمہیں، ہوں۔“ وہ بہت بے خودی کے عالم میں بولتا اسے اپنی محبت کے حصار میں یوں لیتا چلا گیا اور اپنا حق استعمال کرتا چلا گیا کہ وہ ذرا سی بھی مزاحمت نہ کر سکی اور رانیہ جواب تک اس رشتے کو ہی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی، مامون نے اسے اس رشتے کا حق استعمال کر کے اس سے ازدواجی تعلق استوار کر کے اسے بہت کچھ جتا دیا تھا، سمجھا دیا تھا، یاد کر دیا تھا۔

”ناشتہ ملے گا.....“ صبح وہ کچن میں معروف تھی کہ مامون سرور سا آکر کہنے لگا۔

”نہیں!“ رانیہ نے اس کی طرف دیکھے بنا کھانگی سے جواب دیا۔

کھایا، تمہارے ہاتھ کا ذائقہ نہیں بھلانا چاہتا تھا میں اس لئے کسی اور کے ہاتھ کا بنا پراٹھا بھی نہیں کھایا آج اپنے ہاتھوں سے وہی ناشتہ بنا کر کھلاؤ نا۔“ مامون نے پیار بھرا ہنسنے سے کہا کوئی اور موقع ہوتا تو رانیہ اپنی خوش بختی پر رشک کرتی لیکن وہ مامون کو اپنی رسوائی کا ماں باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھی، اس لئے اس کی پیار بھری باتیں اسے سچی اور حقیقی خوشی نہیں دے سکتی تھیں۔

”اچھا! تو آپ انڈہ پراٹھا نہ کھانے کے سبب مسلم ہوئے ہیں میں سمجھتی تھی شاید.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر فرنگ میں سے آتا جو اس نے گوندھ کر رکھا تھا نکالنے لگی۔

”شاید نہیں..... یقیناً تمہاری جدائی کے غم میں گھل کر یہ حال ہوا ہے میرا، خیر اب تو تم مل گئی ہو نا میں تو خوشی سے ہی بھول جاؤں گا۔“

”ناشتہ بخشد اہور ہا ہے۔“ رانیہ نے توجہ دلائی۔

”آؤ میرے ساتھ ناشتہ کرو۔“

”میں نے کر لیا ہے۔“

”ہمیشہ کی طرح دودھ کا ایک گلاس ہی پیا ہوگا۔“ مامون نے کہا تو اس نے حیرت سے

اسے دیکھا جو تین سال کی جدائی کے باوجود اس کی عادت سے واقف تھا۔ اس کی حیرت کو مامون نے بھی محسوس کر لیا تھا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہاری ہر عادت، ادا پسند ناپسند مجھے آج بھی ازبر ہے لیکن کبھی کبھار روٹین سے ہٹ کر بھرپور ناشتہ کر لینا چاہئے اس سے کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو جاتی ہے۔“

”آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”تین سال میں سب بھول گئیں کہ میں کیا چاہتا ہوں رانیہ! تم اپنی مرضی سے مجھے چھوڑ کر مئی تھیں نا تم کیا جانو محبت کی جدائی کیسے جاں گسل اور قیامت خیز ہوتی ہے، کیسا کرب جھیلا ہے میں نے تمہارے غم میں، کتنا ترپتا، سسکتا اور بلکتا رہا ہوں میں تمہاری اس نفرت انگیز لافعلی اور دوری کے سبب، محبت تو میں نے کی تھی نا تم سے، اس لئے سزا بھی مجھ کو ہی ملی ہے تم نے مجھ سے کب محبت کی تھی، کرتیں تو یوں جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر تمہارے دل میں میرے لئے کوئی سوٹ کار نہ نہیں تھا تو میرے نام پر ساری زندگی گزارنے کے لئے کیوں غائب ہو گئی تھیں تم؟ مجھ سے وہ نکاح کا بندھن توڑ کیوں نہ لیا تم نے تاکہ کسی اور شخص سے شادی کر کے اپنا گھر بسا سکو یولو؟“ مامون نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ناشتہ ختم کر لیا تھا اُس نے۔

”خفا کیوں ہو؟“ مامون نے پاس آ کر اس کے گیلے بالوں کو چھوا۔

”زیادہ معصوم اور انجان بننے کی ضرورت نہیں ہے اچھا۔“ رانیہ نے اسی لہجے میں کہتے ہوئے فرنگ میں سبزی کا شاپر نکالا وہ ہنس پڑا اور پھر پیار سے اسے سمجھانے لگا۔

”پنگی! اس میں خفا ہونے کی نہیں، خوش ہونے کی ضرورت ہے کہ تمہارا شوہر تم سے کتنی شدید محبت کرتا ہے۔ تمہاری تین برس کی بے رخی اور جدائی کے باوجود تمہیں اپنے دل کے قریب محسوس کرتا ہے، تم پر جان چھڑکتا ہے۔“

”آپ جائیں یہاں سے۔“ وہ چولہا جلاتے ہوئے بولی۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا، رانیہ کا دل مان رہا تھا مگر دماغ الجھ رہا تھا۔

”میں اگر اب چلا گیا نا تو واپس کبھی نہیں آؤں گا، سوچ لو رانیہ، تم اگر ساری زندگی میرے نام سے جڑ کر رہنا چاہتی ہو تو دور کیوں رہو، میرے ساتھ میرے پاس، میرے قریب بھی رہ سکتی ہو نا..... کبھی اپنی آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا تمہیں میں یہاں اس دل میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوں گا۔“

مامون نے پیار سے کہتے ہوئے اس کے دل پر ہاتھ رکھا تو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، دل جیسے پورے بدن میں دھک دھک کر رہا تھا۔

رانیہ نے پراٹھے کے لئے تو اچھو لے پر رکھ دیا۔

”آپ نہیں بدل سکتے۔“ رانیہ نے کہا۔

”تمہارے ساتھ تو میں واقعی کبھی نہیں بدل سکتا، ہمیشہ ایسا ہی رہوں گا پیار کا بادل بن کر۔“ مامون نے اس کے شانے پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر کہا۔

”کیا کر رہے ہیں خود بھی جلیں گے اور مجھے بھی جلائیں گے۔“ رانیہ نے بری طرح بوکھلا مٹی چیخ کر بولی۔

”تم بھی تو تین سال سے یہی کر رہی ہو، خود بھی جل رہی ہوں اور مجھے بھی جلا رہی ہو۔“ مامون نے معنی خیز بات کہی وہ سلگ گئی۔

”ناشتہ کرنا ہے تو لاؤنچ میں جا کر بیٹھیں اور اگر نہیں کرنا تو بھی جائیں مجھے بہت کام کرنا ہے ابھی۔“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”تین سال بعد شوہر۔۔۔ ملی ہو، شوہر گھر آیا ہے اور تم یہ کام پھیلا کر یہاں مصروف ہو گئیں۔۔۔ بڑے انفسوس کی بات ہے اور جانتی ہو تین سال سے میں نے انڈہ پراٹھا ناشتے میں نہیں

دیکھ کر بیٹیاں بجا گئیں۔

”وہ بیرو تو چلا گیا ہے کہو تو ہم آجائیں دل بہلانے کو۔“ ٹوٹی نے بے حیائی سے کہا تو وہ اس پر نفرت بھری نگاہ ڈال کر واپس اپنے قلیٹ میں آگئی اور دروازہ لاک کر لیا۔

”یہ کیسے تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں، میں کیا کروں کہاں جاؤں؟“ وہ پریشانی سے باواز بول رہی تھی۔

”اپنے حقیقی شوہر کے پاس جاؤ وہی تمہارا اصل محافظ اور حقیقی پناہ گاہ ہے۔ عورت مرد کے بغیر اس معاشرے میں اکیلی نہیں جی سکتی۔ ٹوٹی اور خالد جیسے مرد اکیلی عورت کا جینا حرام کر دیتے ہیں اور اکیلی عورت اور لڑکی تو کئی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتی ہے جسے ہر کوئی لوٹنے کو دوڑتا ہے۔ تم کب تک ان آوارہ لڑکوں سے بچ سکوں گی اگر کسی رات تمہارے گھر میں انہوں نے نقب لگائی تو جو عزت تم ابھی تک بچاتی آئی ہو وہ بھی لٹا بیٹھو گی، پھر تو تمہارے جینے کا بھی کوئی جواز، کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔ کب تک دوسروں کے رویوں کے سبب اپنی زندگی کو ذلت و رسوائی کے حوالے کرتی رہو گی؟“ رانیہ کے دماغ نے اسے سمجھایا، ضمیر نے حقیقت کا رنگ دکھایا تو وہ پریشان ہو گئی۔

”یا اللہ! میں کیا کروں، میری مدد اور رہنمائی فرما، مجھے سیدھا اور صحیح راستہ دکھا۔“ رانیہ نے روتے ہوئے دعا مانگی۔

اگلے دن پہلا روزہ تھا، رانیہ نے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز روزے اور عبادت کا اہتمام کیا اور اپنے لئے اپنے بہتر اور خوشگوار مستقبل کے لئے دعائیں مانگیں۔ رمضان کی وجہ سے اسکول میں ساڑھے بارہ بجے ہی چھٹی ہو جاتی تھی اسے مدحت نسیم ہی اسکول پک اور ڈراپ کرتی تھیں۔ کئی روزے ٹوٹی اور خالد بھی اسے کہیں نظر نہیں آئے تھے تو اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔

”شکر ہے کہ رمضان میں شیطان باعہد دیئے جاتے ہیں۔“

پندرہ روزے خیریت سے گزر گئے۔ رانیہ کو محلے کے ان بزرگ صوفی صاحب سے معلوم ہوا کہ ٹوٹی اور خالد کا ون ویٹنگ کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ اب تک ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ رانیہ نے یہ سن کر خدا سے ان کی ہدایت کی دعا کی تھی۔

”آج بیسواں روزہ تھا۔ رانیہ اور مدحت نسیم عید کی شاپنگ کرنے نکلی تھیں، مدحت نسیم تو کپڑے، جوتے وغیرہ سب گھر والوں کے لئے خرید چکی تھیں صرف جیولری وغیرہ خریدنے کا ارادہ تھا ان کا اصل مقصد تو رانیہ کو عید کی شاپنگ کے لئے لانا تھا جس نے ابھی تک کچھ نہیں خریدا تھا۔ نجانے کیوں اس کا دل بچھا بچھا سا تھا۔ اسے مامون رہ رہ کر یاد آ رہا تھا اور وہ یہ ماننے سے انکاری تھی کہ

”میری زندگی میں ایک مرد نے کیا کم آفتیں اور مصیبتیں نازل کی ہیں جو میں کسی دوسرے مرد کو اپنی زندگی کا اختیار سوچنے کی حماقت کروں گی۔“

”آفتیں اور مصیبتیں نہیں چاہئیں اور محبتیں کہو۔“ مامون نے مسکراتے ہوئے پیار سے کہا۔

”آپ جائیں یہاں سے۔“ وہ جھلا کر بولی۔

”اب چلا گیا تو واپس کبھی نہیں آؤں گا۔“

”کیا مصیبت ہے؟“ رانیہ نے الجھن آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی آئی چادر اتار کر وارڈ روب میں رکھی اور خود کمرے میں بیٹھ گئی۔

”رانیہ..... تم غلط کر رہی ہو مامون کو دل سے اپنا لو اس لئے کہ تم ہمیشہ سے اس کی خنجر رہی ہو، جانے انجانے اس کا خیال تمہیں بے چین کرتا رہا ہے دل نے ہمیشہ اسے اپنے پاس دیکھنے کی خواہش کی ہے۔“ غصہ اور غم، بدگمانی کا طوفان تھم گیا تو مامون اتنا بے ضرر، مصوم اور قلعہ شکن لگتا کہ اس پر پیار آنے لگے۔ ”ہاں میں نے ہمیشہ اس حقیقت کو، اس احساس اور جذبے کی موجودگی کو جس کو میں کوئی نام نہیں دے سکتی اسے ہمیشہ جھٹلایا ہے، نظریں چرائی ہیں مگر نظروں میں بی مامون کی صورت کو میں اپنی تمام تر نفرت کے باوجود کبھی مٹا نہ سکی۔ شاید اس کی محبت کی شدت نے میری نفرت کی حدت کو ختم کر دیا ہے۔ تو کیا مجھے مامون کے ساتھ چلے جانا چاہئے مگر مامون کی کمی وہ مجھے کبھی قبول نہیں کریں گی اور اس کی وجہ بھی تو خود مامون ہی ہے جس کی وجہ سے میں محلے، خانہ ان اور شہر بھر میں آوارہ اور بدکردار کہلائی گئی، بدنام اور رسوا ہوئی، میں اپنی عزت کے اعتبار اور کردار کے قائل کو کیسے معاف کر دوں؟ کیسے قبول کر لوں اسے؟ کیسے اپنی ساری زندگی اسے سوپ دوں؟ نہیں میں اسے معاف نہیں کروں گی۔“ رانیہ خود سے سوال جواب کرتے ہوئے بولی اور پھر مامون کو کھری کھری سناتے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلی تو وہ جاچکا تھا۔

”چلا گیا ناراض ہو کر گیا ہے شاید میں نے کتنا دھکا مارا ہے، ذلیل کیا ہے، اس کے محبت بھرے ہاتھوں کو نفرت سے جھٹکا ہے، تین سال بعد وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا آیا تو میں نے اب بھی اسے اپنا بے رخی اور بے حسی سے ہرٹ کیا ہے یہاں سے چلے جانے کے لئے کہا ہے۔ اتنی ناقدری اور تذلیل کے بعد یقیناً اب وہ یہاں میرے پاس آنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے گا، لیکن میرا دل کیوں رو رہا ہے؟“

وہ سوچتی الجھتی بالکونی کی طرف آئی، نیچے دیکھا مامون کہیں نظر نہیں آیا پھر دروازہ کھول کر باہر نکلی تو بیڑھیوں میں ٹوٹی اور اس کے دوست خالد کو کھڑا دیکھ کر رک گئی۔ ان دونوں نے اسے



اسے مامون سے محبت ہو گئی۔ بے قراری سی تھی۔ اسے آج کل یہ احساس شدت سے بے چمن کے رکھتا تھا کہ اس نے مامون ضیاء کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اسے بہت ہرٹ کیا ہے، اس کی بہت چٹک کی ہے اور ناحق کی ہے، غلط کیا ہے اس کے ساتھ۔“

”رائیہ یہ تم ہی ہوتا۔“ رائیہ اپنے لئے جوتے پسند کر رہی تھی جب ایک مانوس سی آواز اس کے کان میں پڑی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ رومانہ تھی اس کی کزن، دوست اور کلاس فیلو، رخسانہ مجید کی چھوٹی بیٹی۔

”رومانہ تم!“ رانیہ خوشی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کر اس سے گلے لگ گئی۔  
 ”کہاں چلی گئی تھیں تم، مامون بھائی تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے، کتنے دھکی اور آزرہ  
 ہو گئے تھے وہ تمہارے یوں چلے جانے سے۔“ رومانہ نے بھیگتی آواز میں کہا تو وہ اس سے الگ ہو  
 کر بنجیدگی سے بولی۔

”مامون نے میرے وہاں رہنے کے لئے جھوڑا ہی کیا تھا؟“

”میرا خیال ہے کہ ہم سامنے اس پارک میں بیٹھ کر بات کریں تو زیادہ مناسب ہے۔“

محنت حسین نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو دونوں نے ان کی بات کی تائید کی اور ان کے ساتھ چلتی ہوئی پارک میں آ گئیں۔

”رانیہ، تم بہت بڑی سازش اور غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں اور مجھے بہت شرمندگی اور افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے تم نے اپنی زندگی کے تین قیمتی اور خوبصورت برس ضائع کر دیئے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا تو کیا میں مامون کو دل سے قبول کر لیتی جو میری عزت کا قاتل اور میرے ماں باپ کی موت کا ذمے دار ہے؟“ رانیہ نے رومانہ کی بات سن کر سختی سے کہا مگر دل میں دہائی گج گئی تھی وہ تو اب مامون کو مجرم ماننے کو تیار ہی نہ تھا۔

”رانیہ! تمہارا محرم مامون ضیا نہیں ہے بلکہ تمہاری ممانی اور میری ماں ہے۔“  
 ”کیا؟“ رانیہ کا سر چکرا گیا۔

”ہاں رانیہ یہ سب امی نے تمہارے ساتھ کیا تھا۔ مامون بھائی بہت معصوم ہیں، بے گناہ ہیں، وہ تو بہت مخلص تھے تمہارے ساتھ امی نے.....“

رومانہ اسے دھیرے دھیرے الف سے ی تک ساری حقیقت بتاتی چلی گئی۔ جسے سننے کے بعد رانیہ اپنا دل تمام کر شیخ پر ڈھمکی اور روتے ہوئے بولی۔

”او میرے خدایا! یہ میں نے کیا کیا، ایک مخلص انسان کو ہرٹ کیا، دکھی، پریشان اور

”میں تو پہلے ہی مامون کو انکار کو چکی تھی ممانی نے کیوں کیا ایسا۔ کیا شبانہ آپ کی کو انور صغیر سے اچھا رشتہ نہ مل پاتا۔ ویسے ہی وہ کہتیں تو میں انکار کر دیتی اس رشتے سے بھی..... مجھے بدنام تو نہ کیا ہوتا۔“ رانیہ نے روتے ہوئے بولی۔

”رانیہ پلزی اے کو معاف کر دو۔“ رومانہ نے روتے ہوئے کہا، مدحت نسیم شیخ پر بیٹھی ساری باتیں سن رہی تھیں۔ انہیں دکھ بھی ہو رہا تھا کہ رانیہ کی سگی ممانی نے اس کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیا تھا لیکن خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ رانیہ کو کاموں کے متعلق جو بدگمانیاں تھیں وہ اب دور ہو چکی تھیں۔

”میں انہیں صرف اسی صورت میں معاف کر سکوں گی جب وہ اپنی اس گھٹیا حرکت کا اعتراف پورے خاندان کے سامنے کریں گی۔ جن جن لوگوں میں انہوں نے مجھے زسوا کیا تھا انہیں وہ یقین دلائیں کہ رانیہ یا کردار اور بے قصور تھی۔ تب میں انہیں معاف کروں گی۔“ رانیہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”رانیہ! خاندان اور محلے والوں کو حقیقت معلوم ہو چکی ہے وہ سب بھی امی کو بہت کوسے ہیں، بُرا بھلا کہتے ہیں۔ سب اپنے رقیوں پر نادم ہیں، پلیز ہم سب کو معاف کرو اور واپس چلو۔“  
رومانہ نے اس کا ہاتھ تمام کر منت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں تو تم سب کو معاف کر دوں گی، ٹھیک ہے میں نے معاف کیا تم سب کو معاف کیا..... لیکن کیا میرا شوہر مامون ضیاء مجھے معاف کر سکے گا، میں نے اس کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں تو اس سے نظر ملا کربات کرنے کے قابل بھی نہیں رہی..... ہمیشہ اپنی ہی سناتی رہی، کبھی اس کی سنی ہی نہیں۔“ رانیہ! اب احساسِ عداوت اور احساسِ جرم سے پُور ہو چکی تھی۔ دکھ سے بھینکتی آواز میں بولی تو رومانہ نے کہا۔

”وہ پیار کرتے ہیں تم سے، تمہیں ضرور معاف کر دیں گے۔“

”میں گے تو معاف کریں گے ناں۔“ رانیہ روتی ہوئی بولی اور مدحت نسیم کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

”یہ میرا فون نمبر اور ایڈریس رانیہ کو دیجئے گا۔“

رومانہ نے اپنے سسرال کا پتہ وغیرہ ایک چٹ پر لکھ کر مدحت نسیم کو دے دیا۔ انہوں نے بھی پرس میں سے اپنا کارڈ نکال کر اسے تمنا دیا اور دونوں اپنی اپنی راہ کو چل دیں۔

مدحت نسیم اس وقت رانیہ کو اکیلے میں سوچتے سمجھنے کا موقع دینا چاہتی تھیں اس لئے اس کی ابتر ہوتی حالت کے باوجود اسے اس کے فلیٹ پر چھوڑ کر چلی گئیں۔ رانیہ اپنے بیڈروم میں آکر اس بری طرح روئی کہ درود یوار ابل گئے۔ اُسے محبت کے کھو جانے کا غم مارے ڈال رہا تھا۔ دل سے بدگمانی کے بادل چھٹے تو مامون کی صورت پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکے لگی، روح بے کل و بے قرار تھی۔ اسے آج اپنے اندر موجود مامون کی محبت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے پہنائے ہوئے ننگن ہونٹوں سے لگا کر رو رہی تھی۔ اس کو قدم قدم پر ٹھکرایا تھا اس نے، اس کے محبت سے اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں کو نفرت سے جھٹکا تھا۔ اس کے حقوق تک ادا نہیں کئے تھے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گواہ بنا کر جو رشہ اس سے جوڑا تھا اسے دل سے قبول کرنے سے انکار کرتی رہی تھی۔ وہ تو اپنی محبت اور اس کی ماں کی وصیت آج تک بھرا رہا تھا۔ اس نے اللہ کو بھی ناراض کیا تھا شوہر کے حقوق پورے نہ کر کے، اس کی ماں نے تو اسے رخصت کیا تھا مامون کے ساتھ اور وہ شوہر کو نظر انداز کر کے گناہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ لعنت ملامت اپنے حصے میں لکھوائی تھی فرشتوں کی..... رانیہ کو اپنا ہر رویہ اور مامون کا ہر عمل یاد آ رہا تھا اور اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔

شرم محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اتنی سنگدل، بے رحم اور بری کیسے بن گئی تھی کہ اسنے نفیس اور تخلص انسان کی محبت کو اس کے جذبے کی سچائی تک کو نہ پہچان سکی۔ رانیہ کو جہاں اپنے رویے اور سلوک کی بد صورتی پر ملال تھا وہاں یہ فخر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک عظیم محبت اور عزت کرنے والے شخص کی محبت ہے، اس کی شریک حیات ہے، دنیا میں مامون جیسا شاید ہی کوئی مرد ہوگا جو اپنی محبت پر اپنی جیون ساتھی پر اس قدر اندھا دگر اعتبار اور یقین کرتا ہوگا۔ رانیہ کو یہ احساس خوشی سے ہلکا کر رہا تھا اور مامون کا دل دکھانے کا گناہ شرمندگی سے دو چار کر رہا تھا

”مامون پلیز مجھے معاف کر دیں۔ پلیز لوٹ آئیں میرے پاس، میرے دل میں آپ کے سوا کبھی کوئی نہیں رہا، جیسی تو میں نے آپ کا نام اپنے نام سے جڑا رہنے دیا۔ میں نہیں مانتی تھی لیکن آج مان رہی ہوں میں آپ سے محبت کرتی ہوں شدید محبت۔ بس ایک بار آ جائیں پھر میں معافی مانگ لوں گی۔ پلیز..... میں بہت بُری ہوں.....“ رانیہ نے روتے ہوئے کہا اور نجانے کب تک روتے روتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلے دو دن تک وہ بخار میں سلگتی رہی، احساسِ جرم اور احساسِ عداوت اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ مدحت نسیم اور ان کے شوہر ذاکر صمدانی ڈاکٹر کو لے کر آئے اس کا چیک آپ کرایا دوائیں لا کر دیں۔ مدحت نسیم کو اس کی بیماری کا سبب معلوم تھا اپنے شوہر کو بھی وہ ساری بات بتا چکی تھیں۔ انہوں نے مامون سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ مامون اب اسلام آباد میں ہی کمپنی آفس سیٹ کرنے کے بعد نئے گھر میں شفٹ ہو گیا تھا جو اسے کمپنی کی طرف سے ہی دیا گیا۔ مدحت نسیم چاہتی تھیں کہ اب رانیہ خود مامون سے رابطہ کرے، اُسے بتائے، اُسے منائے اور اس کے ساتھ ہنسی خوشی اپنے گھر چلی جائے..... اسکول عید کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ رانیہ نے گھر کو صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ عید کی تیاریوں میں اس بار تو اس کا دل بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ روزے رکھ رہی تھی اور نماز میں رورور کر اللہ سے مامون کے ساتھ روار کھے گئے اپنے سلوک پر معافی مانگتی۔ اس کے ساتھ کی، اس کے پیار، اعتبار کی دعائیں مانگتی۔ آج اسیرواں روزہ تھا۔ مدحت نسیم اور ذاکر صمدانی دو پہر اسے گھر آ کر اپنا سامان پیک کرنے کا کہہ گئے تھے۔ چاند نظر آنے کی صورت میں وہ اسے اپنے گھر عید منانے کے لئے جانا چاہتے تھے۔ ان تین برسوں میں جتنی بھی عیدیں آئی تھیں رانیہ نے ان کی فیملی کے سنگ ہی منائی تھیں اور آج رانیہ سوچ رہی تھی کہ اگر مدحت نسیم نہ ہوتیں تو وہ کس کے پاس اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر آتی، وہ اتنی شفیق اور مہربان نہ ہوتیں تو یہ تین برس وہ کیسے اتنے سکون سے گزار سکتی تھی۔ انہوں نے اسے سگی بہن کی طرح رکھا تھا۔ اسے گھر کا

تحفظ، بہن کا پیار، دوست کی محبت اور رازداری کے قابل بنایا تھا۔ وہ جب تک ان کے ساتھ رہ رہی تھی اسے کوئی فکر نہیں تھی وہ فلیٹ میں اکیلی آکر رہنے لگی تو جب اسے عدم تحفظ اور اکیلے پن کا، عزت کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ وہ مدحت نسیم، ذاکر صدیقی اور فرحت نسیم کی بے حد ممنون اور احسان مند تھی کہ جن کی صحبتوں، عنایتوں اور شفقتوں کے پیش آج اس کی جان اور آن سلامت تھی ان سب کے لئے رانیہ کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں..... رانیہ نے اپنا ضروری سامان ایک سوٹ کیس میں پیک کرنے کے بعد شیر خورہ اور چکن قورمہ تیار کر لیا، شامی کباب فریزر میں موجود تھے، وہ خالی ہاتھ مدحت نسیم کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس لئے اپنے ہاتھ سے عید کے پکوان پکا کر لے جا رہی تھی۔ روزہ کھانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ نہا کر تیار ہو گئی، سفید شلوار اور لیسن کمر کی میٹھ دوپٹے جس پر سفید لیس دھماگے اور موتیوں کا نقش کام کیا ہوا تھا میں وہ بغیر میک اپ کے بے حد جاذب نظر اور دلنشین دکھائی دے رہی تھی۔ کیلے بالوں کو ہمبر بینڈ میں بیک کومب کر کے کھلا چھوڑنے کے بعد وہ چاند دیکھنے کے خیال سے بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔ اس کی نگاہ آسمان پر تھی۔ اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہو گئی اور روزہ کھانے کا سائرن بجنا شروع ہوا تو وہ پلٹنے لگی اور نگاہ نیچے سڑک پر کھڑے ٹوٹی اور خالد پر پڑ گئی۔ وہ دونوں شیطان بھی اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظر پڑتے ہی ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا تھا۔

”یہ تو واقعی شیطان ہیں جو رمضان کا بابرکت مہینہ ختم ہوتے ہی پھر سے کھل گئے ہیں۔ ہسپتال میں بچوں میں جکڑے پڑے تھے عین عید پر رسیاں تڑوا کر آگئے ہیں..... خیر مجھے کیا میں نے کونسا یہاں عید منانی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک ذاکر بھائی مجھے آکر لے جائیں گے۔“ رانیہ نے اندر آتے آتے سوچا اور روزہ افطار کر کے مغرب کی نماز ادا کی، مامون کی واپسی کی دل میں دعا مانگی۔ نماز سے فارغ ہو کر پکچن کا سامان سمیٹ دیا۔ اسی وقت ڈور بیل بج گئی۔

”ذاکر بھائی اور مدحت آپنی ہوں گے۔“ رانیہ نے یہی سوچ کر بنا پوچھے دروازہ کھول دیا مگر نگاہوں کے سامنے برابر والے فلیٹ کی مسز اسلم، سامنے والے فلیٹ کی مسز طفیل اور ان کے پیچھے ان کے شوہر اور ٹوٹی اور خالد بڑے سازشی انداز میں مسکرا رہے تھے۔

”جی فرمائیے!“ رانیہ نے حیرانگی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا پہلے تو وہ کبھی نہیں آئے تھے۔ اس کے فلیٹ میں اسے دیکھ کر آپس میں کھسک پھر ضرور کرتے تھے یہ لوگ لیکن رانیہ نظر انداز کر جایا کرتی تھی۔

”عید کا چاند نظر آ گیا ہے لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ ہم تمہیں عید کے چاند کی مبارک باد دینے

کے لئے آئے ہیں۔“ مسز اسلم نے تکبر سے کہا اور اسے پرے ہٹاتے ہوئے اندر داخل ہو گئیں۔ باقی سب نے بھی ان کی پیروی کی۔

”تم دونوں میرے گھر میں قدم رکھنے کے لائق نہیں ہو باہر نکلو یہاں سے۔“ رانیہ نے ٹوٹی اور خالد کو دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”پہلے انہیں تو باہر نکالو جنہیں اندر چھپا رکھا ہے عید پر یہاں کون سا کھیل کھیلنے کا ارادہ ہے کس کس کو چاند رات میں بٹا رکھا ہے۔“ ٹوٹی نے کمینگی سے مسکراتے ہوئے کہا تو رانیہ کا خون کھول اٹھا۔

”تم جیسے خود گھٹیا اور کمینے ہو ویسی ہی تمہاری سوچ ہے اور ویسا ہی تم دوسروں کو بھی سمجھتے ہو، یہاں میں اکیلی رہتی ہوں، یہ بات پوری بلڈنگ کو معلوم ہے۔“ رانیہ نے غصے سے کہا۔

”لڑکی ہماری بلڈنگ شریفوں کی بلڈنگ ہے، یہاں کوئی جوان لڑکی اکیلی کسی فلیٹ میں نہیں رہتی اور اس سے آئے دن مرد بھی ملنے نہیں آتے، ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیسے جوان مرد یہاں آتے ہیں، ایک تو مجھے اچھی طرح یاد ہے مہینہ بھر پہلے یہاں رات گزار کے گیا تھا بلکہ دن بھر یہیں تھا۔ وہ تو کئی بار یہاں نظر آیا ہے۔“ مسز طفیل نے عامیانہ لہجے میں کہا تو رانیہ سمجھ گئی کہ ان کا اشارہ مامون کی طرف ہے۔ وہ ان لوگوں کی سوچ پر تانک جھانک پر حیران تھی کہ کس طرح وہ اسے اور اس کے گھر کو نگاہوں میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کی سوچ پر رڈیے پر شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ آج اس لمحے اسے پوری شدت سے اپنے لڑکی اور وہ بھی اکیلی لڑکی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

”ہم نے بھی دیکھا ہے نت نئے جوان آتے ہیں تمہارے فلیٹ پر تمہارا کردار مشکوک ہے لڑکی۔“ مسز طفیل نے کہا۔

”ہاں اور ہم اکیلی لڑکی کو اپنی بلڈنگ میں یہ کھل کھلانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“ مسز اسلم نے بھی زبان کھولی۔

”ہمیں تو غصے اور نفرت سے دھتکارتی ہے نیک پارسا بن کر دکھاتی ہے اور.....“ ٹوٹی نے کہا۔

”کچھ اس بند کرو۔“ رانیہ غصے سے چلائی اسے تین سال پہلے والی مٹکنی کی شام یاد آ رہی تھی تب بھی وہ بے قصور ہوتے ہوئے مجرم قرار دے دی گئی تھی، رسوا اور بدنام کر دی گئی تھی اور اب بھی وہ بے گناہ، بے قصور تھی اور اس کے کردار پر کچھڑا چھالی جا رہی تھی۔





”ہمیں معاف کر دیں۔“ دونوں نے ڈر کر ایک ساتھ کہا۔

”دفعہ ہو جاؤ یہاں سے تمہارے ماں باپ کے پاس پولیس موجود ہے ان کے سامنے جا کر اپنی حرکتوں سے توبہ کرنے کا عہد کرو ورنہ.....“ مامون کی بات پوری نہیں ہوئی تھی وہ دونوں ”ٹھیک ہے“ کہہ کر تیزی سے وہاں سے بھاگ نکلے۔ مامون نے رانیہ کی طرف دیکھا جو اسی حالت میں کھڑی تھی جو تین سال پہلے مامون کی ہو گئی تھی۔ مامون کو اپنی جانب دیکھتا پا کر مارے شرمندگی کے وہ رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ مامون نے گہرا سانس لیوں سے خارج کیا اور دروازہ لاک کر دیا۔

”رانیہ!“ مامون نے اس کے قریب آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مدھم مدھم آواز میں پکارا اور پھر اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا۔ رانیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ بے قرار ہو گیا۔ رانیہ نے انک بھاتی آنکھوں سے اپنے خلوص، بے ریا اور محبوب شوہر کا چہرہ دیکھا اور پھر اپنا ضبط ہار گئی اور اس کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا کر ہلکے ہلکے کر رونے لگی۔ مامون تو اس کی اس حرکت پر حیران ہوا تھا بھلا وہ کب اسے اپنے قرب کے قابل سمجھتی تھی اور اب خود ہی اس کی پناہوں میں آ گئی تھی۔ اس نے بھی اسے اپنی پناہوں کے حلقے میں لے کر اپنی محبت اور حفاظت کا احساس دلایا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی جیسے تین برس کے آنسو اس نے بچا کے رکھے ہوں اور آج انہیں اس کے دامن میں سمونے کی ضمانتی ہو۔

”بس رانیہ کچھ نہیں ہوگا تمہیں، میں ہوں ناں۔ خدا کے بعد تمہارا محافظ، تمہارا حصار..... ہوں..... بس شاباش حوصلہ کرو..... یہ سب بزدل اور چھوٹے لوگ تھے تم ان سے ڈر گئیں، تم تو بہت بہادر ہو بڑی ہمت والی ہو۔ بگلی، میرے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی بال بچا نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بے خبر تھوڑی تھا، ان لوگوں کے متعلق انفارمیشن اکٹھی کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ میری محبت کے آس پاس کس قسم کے لوگ رہتے ہیں..... اب میں تمہیں یہاں رہنے نہیں دوں گا۔ لگتا ہے تین سال سے میرے انتظار میں تم نے یہ آنسو سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ چلو آج کھل کر رو لو لیکن دھیان رہے ان آنسوؤں میں تمہارا مامون نہ بہہ جائے۔“ مامون نے اس کے سر پر بوسہ دیا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مامون!“

”کہو میری جان۔“ اس نے پیار سے اس کے آنچل سے اس کے آنسو صاف کرتے

ہوئے کہا تو وہ بھیسکتی آواز میں عداوت سے بولی۔

”مامون! مجھے معاف کر دیجئے۔“

”رانیہ!“ مامون حیرت سے اس کی صورت دیکھنے لگا، اس نے کب چاہا تھا کہ رانیہ اس سے معافی مانگے، وہ تو اس کی زبان سے اپنے لئے محبت کا اقرار سننے کا متمنی تھا، وہ اسے جھکا نا نہیں چاہتا تھا۔

”میں تو کچھ اور سننے کے لئے بے تاب ہوں معافی نہیں رانیہ۔“

”پلیز.....“ رانیہ نے اس کی محبت کی شدت سے مزید شرمندہ ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے گویا مامون کی روح کو ہلا کر رکھ دیا۔

”یہ کیا کر رہی ہو رانیہ! ایسا تو کبھی نہیں چاہا میں نے کیوں مجھے گناہ گار کرتی ہو، ایسا کیا کیا ہے تم نے جو یوں معافی مانگ رہی ہو؟“

مامون نے اس کے ہاتھ علیحدہ کر کے باری باری چوم کر بے قراری سے کہا۔

”میں نے آج تک آپ کو بہت دکھی، آزرہ اور پریشان کیا ہے نا..... ہمیشہ آپ کو بُرا کہا..... بُرا سمجھا، آپ کو اپنا قصور وار سمجھتی رہی..... مگر میں غلط تھی، مجھے تو رخسانہ معافی نے بدنام کیا تھا۔“ رانیہ نے روتے ہوئے انک انک کر اپنا جرم قبول کرتے ہوئے کہا تو مامون نے نرم لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں مدحت آپنی سے دوپہر میری بات ہوئی تھی، انہوں نے مجھے ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے، رانیہ! تم اگر میری بات سن لیتیں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچتیں تو جان لیتیں کہ مامون ضیاء اتنا گھٹیا شخص نہیں ہے کہ اپنی محبت کو سُسا کرے، اسے دکھوں اور آنسوؤں کے حوالے کر دے، اسے اپنے سامنے جھکانے، نیچا دکھانے یا اپنے روکنے جانے پر بدنام کر دے۔ نہیں رانیہ جان! میں مامون ضیاء تمہارے متعلق ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا، تم اپنی منگنی سے خوش تھیں تو میں بھی تمہاری خوشی میں خوش تھا۔ جسے دل میں بہت بلند مقام دے دیا جائے اسے محفل میں ہستی میں نہیں گرایا جاتا، تم آج بھی میرے دل میں بہت بلند مقام رکھتی ہو، آئی لو پورانیہ آئی لو پوری بچ۔“

”پلیز اپنی محبت کو معاف کر دیں۔“ وہ پھر سے رو پڑی۔

”جس سے محبت ہو اس سے معافی کا تقاضا کرنا یا اس کی خواہش رکھنا کم از کم میں تو جائز نہیں سمجھتا۔ تمہاری میرے متعلق بدگمانیاں ختم ہو گئیں مجھے اور کیا چاہئے؟“ وہ خوشی سے بھیسکتی آواز میں بولا۔

”میرا پیار.....“

ایک دوسرے کو ایک ساتھ مبارک باد دی۔

”چاند رات مبارک ہو۔“

اور چند منٹ بعد رانیہ مامون کے ساتھ اس کی گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی اس کے گھر جا رہی تھی جہاں محبتوں بھری چاند رات اور چاہتوں میں نکھر اعیاد کا دن اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں بہت زیادہ خوش تھے۔ مامون نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی میں سیٹ شیپ ریکارڈر آن کر دیا اور ایک خوبصورت نغمہ گاڑی میں گونجنے لگا۔

”تم کیا طے زندگی ملی

چاند رات کو چاندنی ملی

مجھ کو ساری زندگی کا پیار مل گیا۔“

نغمے کے بول سن کر رانیہ اور مامون نے ایک دوسرے کو پیار سے دیکھا اور دونوں خوش دلی سے ہنس پڑے، افق پر عید کا چاند بھی ان دونوں کے پیار بھرے سنگم پر مسکرا رہا تھا۔



وہ اپنے آنسو صاف کر کے بولی۔

”دوگی.....“

مامون کی روح تک اس کی بات پر ٹھوم اٹھی تھی۔

”ہوں!“ وہ شرمائی۔

”لاؤ دو.....“ وہ شرارت اور مسرت سے بولا۔

”ابھی.....“

”کیوں ابھی کیوں نہیں؟“

”آج تو چاند رات ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے ذومعنی بات کہہ گئی۔

”ارے واقعی آج تو چاند رات ہے مومن ٹائٹ ہے آج میری رات ہے، کل عید کا دن

اور عید کی شب۔“

وہ ہنس پڑی مامون نے پہلی بار اسے ہنسنے دیکھا تھا وہ تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

”او گاؤ! پہلی بار تمہیں ہنسنے دیکھا ہے ظالم لڑکی اتنی پیاری ہنسی مجھ سے چھپائے رکھی۔“

اس نے اس کی کٹکن والی نکلائی تمام کر پیار بھرا شکوہ کیا۔

”اب نہیں چھپاؤں گی۔“

”اب تو مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپا پاؤ گی۔“ وہ شریر اور معنی خیز لہجہ میں بولا۔

”ایک اچھی خبر سن لو، تمہارے امجد بھائی ایک سال پہلے پاکستان آئے تھے، سارے

حالات جاننے کے بعد بہت شرمسار ہو رہے تھے اپنے رویے پر، تمہارے لئے فکر مند تھے، میں نے

انہیں تسلی دے دی تھی کہ میں اپنی رانیہ کو تلاش کر لوں گا۔ وہ واپس دینی چلے گئے تھے، میرا ان سے

فون پر رابطہ رہتا ہے۔ کل میں ان سے تمہاری بات کراؤں گا اور می ڈیڈی بھی تمہارے شدت سے

منتظر ہیں۔ ہم کل عید..... کہ شام کی فلائٹ سے کراچی ان کے ساتھ عید منانے جائیں گے بولو منظور

ہے۔“ مامون نے نرمی سے انکشاف کرنے کے بعد اس کی رائے چاہی۔

”جی.....“ وہ پرسکون ہو کر.....

”جھینکس رانیہ! تم نے مجھے اپنی.....“

مامون کی آنکھیں چھلک پڑیں رانیہ اس کی محبت پر فخر کر رہی تھی اور اس کے ہمیشہ ابدی محبت بھرے

ساتھ کی دعا مانگ رہی تھی۔

اسی وقت مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے عید کی نماز کا اعلان ہونے لگا تو رانیہ اور مامون نے



برش میز پر رکھ کر شرارت آمیز لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”کوئی شرارت نہیں کرتا۔“ میڈم عذرا نے اسے سنبھیرے کی۔

”میڈم میں کہاں کرتی ہوں شرارت..... وہ تو بس خود ہی ہو جاتی ہے۔“ اُجالا نے

معصومیت سے کہا تو میڈم عذرا سمیت سب لڑکیوں کو ہنسی آگئی۔

”اچھا تم جاؤ جا کر آفس میں بیٹھو میں آتی ہوں۔“ میڈم عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ

”جی اچھا!“ کہہ کر ان کے آفس میں آگئی۔ آفس میں دیوار کے سامنے وسط میں ایک بڑی سی میز

رکھی تھی جس پر کرم لکری چٹائی بچھی ہوئی تھی اور چند فائلیں، اخبار، پیپر ویٹ اور ایک ٹیلی فون سیٹ

موجود تھا۔ میز کے چاروں جانب چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُجالا نے کرسیوں کا بغور جائزہ لیا اور

شریر مسکراہٹ کے ساتھ اخبار پر نظریں جمالیں۔

”ہم آسکتے ہیں؟“ اخباری رپورٹر ساجد نے اپنے دوست ہارون کے ساتھ آفس میں

داخل ہوتے ہوئے پوچھا تو اُجالا نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور اخبار کی تہہ لگاتے ہوئے بولی

”آپ آچکے ہیں۔“

”اوہ سوری!“ ساجد شرمندہ سا ہو کر بولا۔

”اٹس آل رائٹ..... آئیے تعریف رکھئے۔“ اُجالا نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”شکریہ..... آ.....“ ساجد کرسی پر بیٹھتے ہی کرسی سمیت زمین بوس ہو گیا۔ آفس میں اُجالا

کی شوخ و شریر کھلکھلائی ہنسی کے جلتربگ بج اٹھے۔ ہارون نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے حیرت

سے اس کی اُجالوں جیسی صاف شفاف صورت کو دیکھا۔

”یار اٹھانا!“ ساجد نے ہارون کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا تو ہارون نے چوہکتے ہوئے

اُجالا کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹائیں۔ ساجد اچھا خاصا موٹا تھا۔ اس لئے بے چارہ خود ہی شرمندہ

ہو رہا تھا۔ وہ ہارون کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟“ اُجالا نے اپنی ہنسی روک کر پوچھا۔

”جی..... جی نہیں!“ ساجد نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے قہقہہ ہوا کر کہا۔

”آپ کو چوٹ نہیں لگی مگر کرسی کو بہت شدید چوٹ آئی ہے۔ دیکھیے تو بے چاری ٹوٹ گئی

ہے۔ آپ نے ہماری کرسیوں کا سیٹ خراب کر دیا ہے۔“ اُجالا نے فرش پر پڑی کرسی کی ٹانگوں کو

دیکھنے کے بعد نہایت سنجیدگی سے کہا تو ساجد مزید نادم ہوا۔

”معاف کیجئے گا محترمہ یہ کرسی ہی بہت نازک تھی۔“ ہارون پہلی بار بولے تھے۔

## محبت یوں بھی ہوتی مگر.....!

”لڑکیو! سب اپنے اپنے کمروں کی صفائی اچھی طرح کرلو، اخبار والے آتے ہوں۔“

دارالامان کی نگران میڈم عذرا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے لڑکیوں کو مخاطب کیا۔

”میڈم صفائی تو ہم نے کر لی ہے اور ہم تیار بھی ہو گئی ہیں۔“ اُجالا نے اپنے سیاہ رنگی

بالوں کو شانوں پر سیٹ کرتے ہوئے بتایا۔

”شاباش! بس ذرا دھیان سے بات کرتا۔“ میڈم عذرا نے کہا۔ ”اور اخبار والوں کو اپنے

مسائل ٹھیک ٹھیک بتانا۔ جیسے میں نے تم لوگوں کو سمجھا دیا ہے۔ وہی کچھ بتانا، سمجھ گئی تم سب؟“

”جی میڈم!“ سب لڑکیوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔

”میڈم کیا اخبار والے ہماری تصویریں بھی کھینچیں گے؟“ چوبیس سالہ بلقیس نے پوچھا۔

”انہیں اپنا اخبار تھوڑی بند کرانا ہے جو وہ تمہاری تصویریں کھینچیں گے۔“ اُجالا نے

شرارت سے کہا۔

”میڈم دیکھیں اُجالا میرا مذاق اڑا رہی ہے۔“ بلقیس نے منہ بناتے ہوئے میڈم سے

شکایت کی۔

”اُجالا تم میرے آفس میں جاؤ..... میں سب جگہ کا راؤنڈ لے کر وہاں پہنچتی ہوں۔ اگر

ساجد اور ہارون صاحب آجائیں تو انہیں عزت سے بٹھانا۔ کوئی ایسی دیسی بات مت کہہ دینا، تم ہو تو

بہت شرارتی۔“ میڈم عذرا نے اُجالا کے کھمرے کھمرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میڈم آپ مطمئن ہو کر راؤنڈ پر جائیے۔ میں دیکھ لوں گی ان اخبار والوں کو اور انہیں

اتنی عزت سے بٹھاؤں گی کہ وہ دوبارہ یہاں بیٹھنے کے لئے ہرگز نہیں آئیں گے۔“ اُجالا نے ہنیر

”ظاہر ہے اس ادارے میں صنف نازک رہتی ہے تو کرسی بھی مونٹ ہے۔ نازک تو ہوئی“ اُجالا نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ دونوں حیران نظروں سے اسے اور پھر ایک برے کو دیکھ کر رہ گئے۔ البتہ ہارون نے دل میں اس کی حاضر دماغی پر اسے بے اختیار داد دے رکھی تھی۔

”خیر چھوڑیے..... آپ تشریف رکھئے باقی کرسیاں صحت مند ہیں آپ کی طرح۔“ اُجالا نے ”صحت مند“ پر زور دے کر کہتے ہوئے ساجد کی طرف دیکھا تو ہارون نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ ساجد کھینا ہوا کر ڈرتے ڈرتے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہارون بھی دوسری کرسی کھسکا کر اس کے رہ بیٹھ گیا۔

”اب فرمائیے! آپ کی مزید کیا توضیح کی جائے؟“ اُجالا نے میڈم عذرا کی کرسی کے کھڑے ہو کر پوچھا تو ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور جب اس کی جانب میں اٹھائیں تو وہ فوراً بولی ”فرمائیے صاحبان تکلف مت کیجئے۔“

”آپ میڈم عذرا ہیں؟“ ہارون نے بے یقین لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا؟“ وہ زور سے بولی ”میں آپ کو میڈم دکھائی دے رہی ہوں۔“

”جی نہیں، آپ تو مٹی ہیں۔“ ساجد نے فوراً بات کو سنبھالا۔

”خیر اب میں اتنی مٹی نہیں ہوں۔ ابھی پرسوں میں نے اپنی بیویوں سالگرہ منائی۔“

”رو کر۔“ اُجالا کا لہجہ یک دم اُداسی میں ڈوب گیا۔

”رو کر کیوں؟“ ساجد نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یہ میرا بہت ہی پرسنل معاملہ ہے، آپ اپنی بات کیجئے۔“ وہ فوراً ہی سابقہ لہجے میں نہ لگی۔ ہارون تو بس حیرت سے اسے دیکھنے اور سننے جا رہے تھے۔

”یقین مائیے میرے دوست ہارون نے بھی پرسوں ہی اٹھائیسویں سالگرہ منائی ہے۔ کیا

اتفاق ہے آپ بھی پرسوں پیدا ہوئیں اور یہ موصوف بھی۔“ ساجد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور تین دن میں ہم اتنے بڑے بھی ہو گئے۔ یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اور حسین

ہے۔“ اُجالا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

”میں نے تو اپنی سالگرہ بہت ہنسی خوشی منائی تھی۔ آپ نے روتے ہوئے کیوں منائی؟“

نے بہت دھیمے اور دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

”آپ جو نہیں سنئے۔“ اُجالا کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”مم..... میرا مطلب ہے کہ

آپ جو نہیں چاہتے کبھی کبھی وہ بھی ہو جاتا ہے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے یہ.....“ اُجالا اپنے جملے کی شوخی کا فوراً ہی احساس ہوا تو بات بناتے ہوئے بولی اور ہارون اس کی حاضر دماغی پر مسکرا دیئے۔

”میں ساجد ہوں اور یہ میرے دوست ہارون ہیں۔“ ساجد نے اپنا اور ہارون کا تعارف

کرایا۔

”یہ اخبار نویس تو نہیں لگتے، کیا کوئی بزنس مین ہیں؟“ اُجالا نے براؤن تحری پڑ سوٹ میں ملبوس وجیہ ہارون ملک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو ہارون اس کے اندازے پر حیرا رہ گئے۔

”جی یہ بزنس مین ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ کرتے ہیں۔“ ساجد نے بتایا۔

”کس کی؟“ اُجالا نے بے ساختہ پوچھا تو دونوں ہنس دیئے۔

”میرا خیال ہے کہ انٹرویو ہم نے کرنا تھا۔“ ساجد نے یاد دلایا۔

”کیوں کیا انٹرویو صرف اخبار نویس ہی کر سکتے ہیں، کوئی اور نہیں کر سکتا؟“ اُجالا نے کہا۔

”بالکل کر سکتے ہیں مگر آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھے نا پلیز!“ ساجد نے کہا۔

”شکریہ! یہ میڈم کی کرسی ہے اور اس کرسی پر وہی بیٹھی ہوئی اچھی لگتی ہیں اور ویسے

میں کسی کی جگہ نہیں لیتی..... بلکہ اپنی جگہ خود بناتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”مس آپ کی تعریف؟“ ساجد اس کا نام جاننا چاہ رہا تھا۔

”میری تعریف..... وہ بہت دلنشین انداز میں مسکرائی اور ہارون کو یوں لگا جیسے موتی چمک

اٹھے ہوں۔ ان کے دل وروح کے تمام درخورد بخود ہونگے اور وہ ان کے اندر اترتی چلی گئی۔

”اب میں اپنے منہ سے اپنی کیا تعریف کروں؟ آپ ہی کرو دیجئے میری تعریف۔“ اُجالا

نے مسکراتے ہوئے معصومیت سے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

”آپ بہت حسین ہیں۔“ ساجد نے ایما عذری سے اس کے حسن کو سراہا۔

”اور آپ بہت موٹے ہیں، میرا مطلب ہے آپ کی چوڑائی کچھ زیادہ ہے۔ تھوڑی سی

کر لیجئے۔ پھر آپ بھی بہت حسین ہو جائیں گے۔“ اُجالا نے نہایت خلوص اور سنجیدگی سے اس

مفت مشورہ دیا تو وہ محض مسکرا کر رہ گیا۔

”سنئے مس.....“ ہارون نے اسے مخاطب کیا۔

اُجالا نے اپنا نام بتایا

”اُجالا! میرا نام اُجالا فراز ہے۔“ ”آپ کا نام اُجالا ہی ہونا چاہیے تھا۔“ ہارون نے اس کے اُجلے اُجلے، چاندنی نکھیرتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ قدرے نرم ہو گئی۔ اتنی تیز خوش و شریر لڑکی کو اس طرح نرم ہوتا دیکھ کر ہارون مسکرا دیئے۔

”مس اُجالا آپ میڈم عذرا کو بلائیں۔ ہمیں بہت جلدی ہے۔“ ساجد نے رسٹ وارج نظر ڈال کر کہا۔

”آپ کو اگر اتنی ہی جلدی تھی تو آپ آئے ہی کیوں ہیں؟“ اُجالا نے فوراً پوچھا۔

”جی وہ ہم!“ ساجد اس کے سوالوں سے بوکھلا گیا حالانکہ صفائی تھا بڑے بڑوں کو بوکھلا

بتا تھا۔

عین اسی وقت میڈم عذرا اپنی نائب میڈم خالدہ کے ساتھ آفس میں داخل ہوئیں۔

”ارے آپ لوگ آگئے؟“ میڈم عذرا نے قدرے خجالت سے ان دونوں کو دیکھا۔

”میڈم ہم کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ ساجد نے بیٹھتے ہی کہا۔

”میں بہت معذرت چاہتی ہوں آپ سے..... دراصل اتنے بڑے ادارے کا انتظام

یکنا اور چلانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ میں راولپنڈی پر بھی اور میں نے ادارے کے تمام مسائل اس کاغذ

پس درج کر دیئے ہیں تاکہ آپ کو زیادہ وقت نہ لگانا پڑے۔ یہ لیجئے کاغذ۔“ میڈم عذرا نے اپنی

کرسی پر بیٹھتے ہی اپنے پرس میں سے دو رجسٹرز کاغذ نکال کر ساجد کی طرف بڑھا دیئے۔

”آپ لوگ خود بھی اس ادارے کی سبکیوں سے بات کر سکتے ہیں۔“ میڈم عذرا نے کہا۔

”وہ تو ہم کریں گے ہی۔“ ساجد نے کاغذ دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں لڑکیوں سے بات کرنے کا تو بہانہ چاہئے ہوتا ہے مردوں کو۔“ اُجالا نے بہت

ستہ سے کہا مگر سب نے بخوبی سنا اور مسکرا دیئے۔

”اُجالا!“ میڈم عذرا نے اسے گھورا۔

”تم نے انہیں چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔“

”میڈم چائے کے لئے پتی کا ہونا ضروری ہے اور باورچی بتا رہا تھا کہ آج پتی کا اختتام

لیا ہے اور پانی تو یہ لوگ پی کر آئے ہوں گے۔ کیوں سر؟“ اُجالا نے کہنے کے بعد آخر میں ہارون

کی طرف دیکھا تو نجانے کیسا ظلم تھا اُن کی سیاہ چمکدار آنکھوں میں کہ وہ شیشا کر نظریں پڑا گئی۔

دن مسکرا رہے تھے۔

”اُجالا یہ کرسی!“ میڈم عذرا کی نظر زمین پر کرسی کے ٹوٹے ٹکڑوں پر پڑی تو سوالیہ

نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میڈم میں نے نہیں توڑی، ساجد صاحب نے توڑی ہے۔“ اُجالا نے فوراً صفائی پیش

کی۔

”اُجالا بہت بُری بات ہے۔“ میڈم عذرا اس کی شرارت سمجھ گئی تھیں۔ سنجیدہ لہجے میں

بولی۔

”جی میڈم یقیناً بہت بُری بات ہے۔ اب دیکھئے تا مہمان کو میزبان کے گھر اور آفس کی

چیزوں کا کچھ تو خیال ہونا چاہئے۔“ اُجالا نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

ہارون اور ساجد اس کی شرارت اور معصومیت سے محفوظ ہو کر مسکرا رہے تھے۔

”یہ کرسی تو ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے سنو روم میں رکھوا دی تھی پھر یہاں کیسے آگئی؟“

”پتہ نہیں میڈم کیسے آگئی، بس آگئی۔ اس کا بھی دل چاہ رہا ہوگا اپنی آبائی جگہ یعنی آپ

کے آفس کی سیر کرنے کو تو یہ آگئی یہاں۔“ اُجالا نے اپنی شرارت کے پکڑے جانے پر ڈرتے،

مسکراتے شریر لہجے میں کہا تو میڈم عذرا کو ہنسی آگئی۔

”معاف کیجئے گا ساجد صاحب! یہ اُجالا ہے۔ ہمارے ادارے کی سب سے زیادہ ذہین

مگر بہت شریر لڑکی ہے یہ۔“ میڈم عذرا نے ساجد سے معذرت کے ساتھ ہی اس کا تعارف کروایا۔

”وہ تو یہ لگ ہی رہی ہیں۔ بلکہ ہمیں اس کا اعزازہ اور تجربہ بھی ہو چکا ہے۔“ ہارون نے

مسکراتے ہوئے کہا۔ جانے کیوں اُجالا کو ہارون کی نظریں اپنے چہرے پر جمی محسوس ہو رہی تھیں۔

”شکر ہے میڈم کہ کرسی پہلے سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ ورنہ یہ تو مجھ سے اس کرسی کا بل بھی

نکلوا لیتیں۔“ ساجد نے ہنس کر کہا۔

”میں معذرت خواہ ہوں آپ کو تکلیف تو ہوئی ہوگی۔“ میڈم عذرا نے کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں نے اس تکلیف کو خاصا انجوائے کیا ہے۔“ ساجد نے مسکرا کہا، وہ

ہنس پڑیں۔

”میڈم میرے یہ دوست ہارون آپ کے ادارے کے لئے کچھ ڈونٹ کرنا چاہتے

ہیں۔“ ساجد نے سنجیدگی سے بتایا اور ہارون کی طرف دیکھا۔

”ماشاء اللہ یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔ آپ جیسے مختصر حضرات کی مدد سے، تعاون سے ہی

یہ ادارہ چل رہا ہے ورنہ ہمارے لئے تو ادارے کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کبھی بجلی کا

بل جمع نہیں ہو پاتا تو کبھی گیس کٹ جاتی ہے۔“ میڈم عذرا نے تفصیل سے بتایا۔



”اور پانی کا مسئلہ کیسے حل ہوتا ہے؟“ ساجد نے پوچھا تو اُجالا نے جواب دیا۔  
”پانی کے معاملے میں ہمارا ادارہ بہت خود کفیل ہے۔ پوچھئے کیسے؟“  
”کیسے؟“ ساجد نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”وہ ایسے کہ یہاں تقریباً کبھی لڑکیاں پانی برساتی ہیں۔ تمام لڑکیوں کی آنکھوں سے وقت بے وقت پانی برستا ہے لیکن وہ پانی نمکین ہوتا ہے۔ اگر اسے خشک کر لیا جائے تو اس سے منوں کے حساب سے نمک حاصل کیا جاسکتا ہے۔“ اُجالا نے بے حد سنجیدگی سے کہا مگر ان دونوں کو کبھی آگئی۔

”اُجالا بہت بولتی ہو تم..... جاؤ جا کر ان کے لئے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ میڈم عذرا نے کہا۔

”اوکے میڈم!“ وہ منہ بسور کر بولی تو ساجد نے فوراً کہا۔

”مس اُجالا اگر آپ کا کوئی مسئلہ ہو تو بتائیے، ہم اخبار میں شائع کر دیں گے۔“

”ہاں ہے ایک مسئلہ..... اگر آپ اسے حل کر دیں تو میری نظر میں آپ دنیا کے ذہین ترین صحافی ہوں گے۔“ اُجالا نے سوچے ہوئے کہا۔

”کیا مسئلہ ہے آپ کا بتائیے پلیز؟“ ساجد نے تجسس ہو کر پوچھا، ہارون بھی اس کی جانب متوجہ تھے کہ جانے اب یہ شریر لڑکی کون سا مسئلہ بیان کرنے والی ہے۔

”مسئلہ یہ ہے کہ ساجد صاحب کہ موسم گرما میں مجھے بلکہ یہاں کی سب لڑکیوں کو شدید گرمی لگتی ہے اور سردیوں میں ہمیں شدید سردی لگتی ہے۔ کیا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا؟“

”اُجالا!“ میڈم عذرا نے اسے ٹوک کر گھورا۔

”جی میڈم! مسئلہ تو حل کرانے دیں۔“ اس نے سادگی سے کہا تو انہوں نے سنجیدگی سے

کہا۔

”تمہارے سارے مسئلے ایسے ہی شریر ہوتے ہیں۔ جاؤ ان کے لئے چائے لاؤ۔“

”جی اچھا!“ وہ منہ بتاتی آفس سے باہر نکل گئی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ ہارون کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اُجالا ان کا

دل اپنے ساتھ ہی لے گئی ہے اور خود ان کی روح میں برا جہان ہو گئی ہے۔

”کیا ہوا؟“ ساجد نے ان کی طرف دیکھا۔

”بہت کچھ ہو گیا یار۔“ ہارون نے معنی خیز لہجے میں بے بسی سے جواب دیا۔

”ہارون صاحب! آپ کیا عطیہ کرنا چاہتے ہیں اس ادارے کے لئے؟“ میڈم عذرا کے متوجہ کرنے پر وہ دونوں ان کی طرف دیکھنے لگے۔

”جی میں اسے سی، بیٹرز اور گیزر گرم پانی کے لئے دینا چاہتا ہوں تاکہ سردیوں میں آپ کے لئے کچھ آسانی ہو جائے۔“ ہارون نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے میں ادارے کا معائنہ کر لوں۔“ ساجد نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

”جی ضرور..... جیسے آپ مناسب سمجھیں چلیے۔“ میڈم عذرا بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہارون صاحب آپ چائے نوش فرمائیں۔ ہم ابھی آتے ہیں، میڈم عذرا نے ان سے

کہا۔

”جی بہتر!“ ہارون احتراماً کھڑے ہو کر بولے، وہ ساجد کے ساتھ چلی گئیں۔

”یہ آپ بار بار کھڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟“ اُجالا نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔

”خواتین کے احترام میں کھڑے ہونا مہذب مردوں کا شیوہ ہوتا ہے۔“

”اوہ..... تو آپ مہذب مرد ہیں۔“ اُجالا نے میز کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے مصنوعی

حیرت سے کہا۔

”آپ کو کوئی شک ہے۔“ ہارون نے اس کی شرتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں!“ اُجالا نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”چائے

پیجئے..... آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو یہاں چائے پینے کو مل رہی ہے۔ ورنہ یہاں تو پانی بھی

بیشکل میسر آتا ہے۔ مہمان بے چارے سوکھا حلق لئے رخصت ہو جاتے ہیں۔“

”تو کیا وجہ ہے اس رویے کی؟“ ہارون نے چائے کا کپ لے کر پوچھا۔

”سیدھی اور آسان سی وجہ ہے۔“ اس نے نرم لہجے میں بتایا۔ ”میڈم آنے جانے والوں

پر اپنی غربت کا، مجبور یوں کا پنڈورا بکس کھولتی ہیں تو کوئی ترس کھا کر کچھ عطیہ دے جاتا ہے اس

ادارے کے لئے کہ جہاں مہمان کو چائے پانی تک نہیں پلایا جاسکتا وہاں کھانا کیا کھایا جاتا ہوگا؟“

”تو ہمیں چائے پلانے کا مقصد؟“ ہارون نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔

”آپ کی طرف سے میڈم کو ٹھیک ٹھاک ڈونیشن کی توقع ہے۔ اسی لئے آپ کو چائے کا

پوچھ لیا ہے۔“

”ہارون صاحب! ایک بات کہوں آپ سے؟“ اُجالا نے سنجیدہ لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

”جی ضرور کہئے!“ ہارون نے چاہت بھری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ اس ادارے کے لئے اے سی اور گیزر مینٹ دیں کیونکہ وہ میڈم کے گھر چلے جائیں گے۔ ایسی بہت سی چیزیں یہاں آئیں اور میڈم اپنے گھر لے گئیں۔ میڈم عذرانے تو اپنی بیٹیوں کا جہیز بھی اس ادارے کی بے سہارا لڑکیوں کے نام آنے والے عطیات میں سے پورا کیا تھا۔“

”یہ تو بہت غلط بات ہے۔“ ہارون نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر حیرت اور تاسف سے کہا۔

”مگر میں اب یہ غلط بات مزید نہیں ہونے دوں گی۔“ اُجالا نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”آپ کو اگر دو ٹیٹ کرنا ہے تو کپڑوں، کتابوں اور بیڈ فیش کی صورت میں ڈونٹ کریں اور خود اپنے سامنے اس ادارے کی لڑکیوں میں تقسیم کرائیں۔“

”ہوں.....“ ہارون نے اس کے حسین اور معصوم چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔ آپ یہ بتائیے کہ اس ادارے میں کتنی بے سہارا لڑکیاں ہیں۔“

”یہاں تو کبھی بے سہارا ہیں سر.....“ وہ اُداسی سے ہنس پڑی۔ جانے کیا ڈکھ تھا اس کی ہنسی میں کہ ہارون بہت تاسف زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

”ہارون صاحب! جن لڑکیوں کو اُن کے گھروں میں امان نہیں ملتی، انہیں دارالامان میں کیسے امان مل سکتی ہے۔ یہاں ستاون (57) لڑکیاں ہیں جن میں سے بیشتر اپنوں کے ظلم و زیادتی سے تنگ کر آکر اور مزید ظلم سے بچنے کی خاطر اس ادارے میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ ہر لڑکی آپ کو ظلم، جبر اور نا انصافی کی ایک الگ ہی کہانی سنائے گی۔ ڈکھ، اُداسی، آنسو، سسکیاں اور آہیں اس ادارے کی لڑکیوں کا مقدر بن چکے ہیں۔“ اُجالا بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

ہارون نے نرم لہجے میں کہا: ”لیکن آپ تو بہت زعہ دل اور بہادر دکھائی دیتی ہیں۔“

”دکھائی دینے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے ہارون صاحب!“ اُجالا نے بے حد سنجیدگی سے کہا تو وہ ایک لمحے کو اسے دیکھ کر رہ گئے۔ پھر اپنے کوٹ کی جیب میں سے اپنا وزننگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ میرا یہ وزننگ کارڈ رکھ لیجئے۔“

”میں اس کارڈ کا کیا کروں گی؟“

”اگر کبھی آپ کو میری ضرورت محسوس ہو یا کوئی کام ہو یا کسی بھی قسم کا کوئی مسئلہ ہو تو آپ مجھے کال کر سکتی ہیں۔ انشاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔“

”میں مایوس کبھی نہیں ہوتی، اپنی دے تھینک یو۔“ اُجالا نے کارڈ لے کر کہا۔

”ویسے آپ واحد لڑکی ہیں جو اپنے ادارے کی نگران کی خامیاں بیان کر رہی تھیں۔ ان کی حقیقت سے آگاہ کر رہی تھیں حالانکہ آپ خود بھی اس ادارے میں رہتی ہیں۔ یہ ادارہ ایک طرح سے آپ کا گھر ہی ہے نا۔“ ہارون نے مسکرا کر کہا۔

”جی ہاں!“ وہ مسکراتے ہوئی بولی۔ ”وہ محاورہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ..... گھر کا بھیدی لٹکا ڈھائے۔“

”تو آپ لٹکا ڈھانا چاہتی ہیں۔“ ہارون نے محفوظ ہو کر کہا۔

”میں تو صرف اس ادارے کی لڑکیوں کو ان کا حق دلانا چاہتی ہوں۔“ وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

”آپ نے جو کچھ بتایا ہے، اخبار میں اسی طرح رپورٹنگ ہوگی.....“ ہارون نے یقین دلایا۔

”لیکن آپ تو اخبار نویس نہیں ہیں۔“ اُجالا نے کہا۔

”میں ساجد کو بتا دوں گا جو کچھ آپ نے بتایا ہے۔“

”لیکن اس میں میرا.....“

”آپ پریشان مت ہوں۔ آپ کا نام کہیں نہیں آئے گا۔“ ہارون نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی، فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”تھینک یو.....“ اُجالا کے لہجے میں تشکر اور اطمینان تھا۔

”مس اُجالا آپ خوش رہا کیجئے، اُداسی اچھی نہیں لگتی بعض چہروں پر.....“ ہارون نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا اُداس رہنے سے چہرے مڑے کتنے تکتے ہیں؟“

”نہیں..... مڑے تو نہیں لگتے مگر جن چہروں سے ہم پیار کرنے لگتے ہیں ان چہروں کی اُداسی ہمیں تکلیف دیتی ہے۔“

ہارون کی معنی خیز بات پر وہ کچھ گھبرا سی گئی اور فوراً ہی نظریں چمک کر کرسی سے اٹھ گئی اور چائے کے برتن ٹرے میں رکھنے لگی۔

ہارون اپنی آنکھوں میں دنیا جہاں کی محبت سونے اے دیکھے جا رہا تھے۔ اس کا مناسب قد تھا، رنگت ایسی اُبللی کہ دیکھنے والی نظریں خیرہ ہو جائیں۔ چہرہ جیسے دودھ میں دُحلا ہو، شریقی بڑی بڑی گہری آنکھیں، شانوں پر لہراتے سیاہ ریشمی چمکدار بال، ہونٹ ایسے کہ گلاب کی پتیوں کا گمان ہو، اُمدواتے دلکش کہ جیسے خود تراش کر یہ شکل دی گئی ہو۔ کھنی کھنی سیاہ ہلکیس، نرم و نازک ہاتھ، وہ سر سے لے کر پاؤں تک حسن کا منہ بولتا، جیتا جاگتا شاہکار تھی اور ہارون اس شوخ، شریر اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو جانے والی معصوم لڑکی کو..... پہلی نظر، پہلی ملاقات میں ہی اپنے دل میں بسا بیٹھے تھے۔ انہیں لگا کہ جیسے انہیں ان کی منزل مل گئی ہے۔ وہ اس کی مہکتی ریشمی زلفوں کے سائے میں اپنی ہلکن اُتارنے کے خواب دیکھنے لگے۔

ساجد اور میڈم عذرا کی آوازوں نے انہیں خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آنے پر مجبور کر دیا۔

”میڈم یہاں تعلیم کا انتظام تو ہونا چاہئے نا، سب لڑکیوں کو پڑھنے کا شوق ہے مگر وہ نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہیں۔“ ساجد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو اُجالا نے ٹرے اٹھائی اور آفس سے باہر نکل گئی۔

”ہاں! آپ اپنے اخبار میں اس طرف بھی توجہ دلائیں۔“ میڈم عذرا نے سرسری سا کہا۔

”مس اُجالا نے کتنا پڑھا ہے؟“ ہارون نے پوچھا۔

”اُجالا نے گریجویٹیشن کیا ہے۔ ابھی پندرہ بیس دن پہلے ہی اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا ہے۔ ماشاء اللہ فسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی ہے۔ بہت ذہین بچی ہے اُجالا۔“ میڈم عذرا نے دل کھول کر اُجالا کی تعریف کی۔ وہ زمانہ شناس ہی نہیں، مرد شناس بھی تھیں اور ہارون کی اُجالا میں دلچسپی کو ایک ہی گہری نظر میں بھانپ گئی تھیں اور باتوں باتوں میں ساجد سے ہارون کے متعلق پوچھ چکی تھیں۔ ساجد نے انہیں بتایا تھا کہ ہارون نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ امیر تھے اور میڈم عذرا کو دولت آتی دکھائی دے رہی تھی، جیسی اُجالا کی تعریف میں سنجوی نہیں کر رہی تھیں۔

ان کے لئے تو اُجالا سونے کی چڑیا تھی۔ وہ اسے اپنی مرضی کی قیمت مانگ کر کسی کے حوالے کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے لئے وہ بلیک چیک تھی۔ اپنی مرضی کی رقم بھر کر کیش کرنا وہ اپنا سمجھ رہی تھیں۔ اُجالا کا حسن بلاشبہ اسے قیمتی بنانے کے لئے بہت تھا۔

”مس اُجالا کے والدین کیا وفات پا چکے ہیں؟“ ہارون نے اگلا سوال پوچھا۔

”ہاں!“ میڈم عذرا نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ”اُجالا تقریباً دس برس پہلے اس ادارے

میں آئی تھی۔ اُجالا کے والدین ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ وہ لوگ بہت دولت مند تھے۔ فرار صاحب یعنی اُجالا کے والد صاحب نے ہی یہ ادارہ قائم کیا تھا۔“

”اچھا!“ ہارون اور ساجد دونوں نے حیران ہو کر ایک ساتھ کہا۔

”جی ہاں!“ میڈم عذرا نے ان کی دلچسپی دیکھتے ہوئے محسوس کرتے ہوئے مزید تفصیل بتانا شروع کی۔ ”اُجالا کے تایا اور چچا نے اُجالا کے والدین کے مرتے ہی ان کی ساری جائیداد پر قبضہ جما لیا۔ اُجالا کا حق بھی چھین لیا۔ کار، کوٹھی، زمین، فیکٹری سب پر اپنی انہوں نے ہتھیالی اور اُجالا کو یہاں اس ادارے یہ کہہ کر چھوڑ گئے کہ یہ تمہارے باپ کا بنایا ہوا ادارہ ہے۔ جو اس نے بے سہارا لڑکیوں کے لئے بنایا تھا۔ اب تم بھی جیم ہو، بے سہارا ہو اور لاوارث ہو۔ اس لئے اپنے باپ کے اس ادارے میں رہو۔ یہی اب تمہارا گھر ہے۔ ہمارے گھر کی طرف کبھی نمولے سے بھی رخ مت کرنا ورنہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گئی۔“

”اومیرے خدا اتنی بے حسی، اتنی سفاکی۔“ ہارون کا خون کھول اٹھا۔

”میڈم آپ مجھے ان لوگوں کا ایڈریس دیں۔ میں انہیں منظر عام پر لاؤں گا۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے، نا انصافی ہے۔ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی سے اس کے گھر کی سچت چھین کر اسے اس کے باپ کے بتائے ہوئے دارالامان میں چھوڑ دینا کتنی بے حسی ہے۔ بہت افسوس کا مقام ہے۔ اگر یہ ادارہ اُجالا کے والد مرحوم نے نہ بنایا ہوتا تو نجانبے وہ لوگ اُجالا کو کہاں لے جاتے، کیا سلوک کرتے اس کے ساتھ؟“ ساجد نے دُکھ سے کہا۔ اسے سچ کچھ دُکھ پہنچا تھا اُجالا کی کہانی سن کر۔

”ساجد صاحب! اس خبر سے آپ کا اخبار تو بک جائے گا لیکن وہ لوگ اُجالا کی زندگی کے دشمن بن جائیں گے اور اُجالا کو یہاں سے زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے۔“ میڈم عذرا اس سونے کی چڑیا جس کا نام اُجالا تھا، کو کسی قیمت پر مفت میں کھانا نہیں چاہتی تھیں۔ سنجیدگی سے فکر مند لہجے میں بولیں۔

”اُجالا کو وہ لوگ نہیں لے جائیں گے۔ اُجالا کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا۔“

زبردستی نہیں بلکہ عزت اور احترام سے۔ ہاتھ لے جاؤں گا۔ ہارون نے فرما کہا۔

”جی؟“ میڈم عذرا کو ان سے اتنی جلدی اس بات کی بے گناہ تھی۔ حیران ہو کر بولیں۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم..... ہوش میں تو ہو۔“ ساجد نے سرٹوٹی کی۔

”یار، دُش تو اُجالا نے اُڑا دیئے ہیں اور میں اس ہیرا صفت لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل



کر کے رہوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے اپنی ساری دولت ہی کیوں نہ لٹانی پڑ جائے۔“ ہارون نے بہت آہستگی سے ساجد کے کان میں کہا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔

”ہارون صاحب! آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“ میڈم عذرا نے بے چینی سے کہا۔

”جی میڈم! میں مس اُجالا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

ہارون نے صاف صاف دل کی بات کہہ کر پوچھا۔

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ میڈم عذرا نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دے کر نیکی کا کام کریں گے مگر.....“

”مگر کیا پلیز بتائیے؟“ ہارون نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”آپ کو چار لاکھ روپے ہمیں دینا ہوں گے۔“ میڈم عذرا نے کہا۔

”دیکھئے یہ رقم ہم اس ادارے پر ہی خرچ کریں گے۔ آخر ہم نے اُجالا کو دس سال تک

اس ادارے میں رکھا۔ اس کے کھانے پینے، رہائش کی سہولتوں، پڑھنے لکھنے پر، لباس پر ہمارا بھی تو

بہت روپیہ خرچ ہوا ہے۔ ہمیں اُجالا کا رشتہ آپ کو دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ آپ ہمیں

اس کے بدلے میں چار لاکھ روپے کیش دے دیں۔“ میڈم عذرا نے حریص لہجے میں کہا تو ہارون کو

اُجالا کی تمام باتیں یقینی طور پر سچ لگنے لگیں۔ یہ میڈم عذرا واقعی لالچی تھیں۔ ہارون کو اس پر غصہ تو

بہت آیا مگر وہ اس کا اظہار کر کے اپنی منزل کھوٹا نہیں چاہتے تھے۔ لہذا چند لمحے کے توقف کے بعد

بولے۔ ”ٹھیک ہے، منظور ہے آپ اسی جتنے کو نکاح کی تیاری کریں۔“

”اتنی جلدی!“ میڈم عذرا حیرت سے بولیں۔ ”ہمیں تیاری بھی تو کرنا ہوگی۔“

”آپ کو صرف اُجالا کو وِلین بنوانا ہے باقی انتظامات ہم خود کر لیں گے۔“ ہارون نے

کوٹ کی جیب سے چیک بک نکال کر کہا۔

”تو چار لاکھ روپے آپ واقعی دے رہے ہیں۔“ میڈم عذرا خوشی سے بولیں۔

”بہت کم قیمت لگتی ہے آپ نے اس ہیرے جیسی لڑکی کی۔“ ہارون نے دل میں کہا۔

”جی ہاں!“ ہارون بولے۔

”ایکسیکوی میڈم!“ ساجد نے ہارون کا بازو پکڑ کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”یار کیا ہے؟“ ہارون جھلا کر بولے۔

”ہارون کیا ہو گیا ہے مجھے؟“

”پیار ہو گیا ہے مجھے!“ ہارون نے آہستہ سے جواب دیا۔

”اُجالا سے!“ ساجد بولا۔ ہارون نے بڑے جذبے سے کہا۔

”ہاں وہ اُجالا! پیار کا اُجالا بن کر میرے اندر سرایت کر گئی ہے اور ساجد میں اسے کسی

قیمت پر بھی کھوٹا نہیں چاہتا۔“

”لگتا ہے کہ اُجالا کی کہانی سن کر تجھے ہمدردی کا دورہ پڑ گیا ہے۔ تجھے تو ہمدردی میں کچھ

یاد نہیں رہتا۔ اپنا سب کچھ دل و جان سے لٹانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ہر کسی پر.....“ ساجد نے

اس کی انسان دوست عادت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

”یار میں اُجالا پر واقعی دل و جان سے اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہوں۔“ ہارون

نے دل سے کہا۔

”پاگل تو نہیں ہو گیا تو.....“ ساجد کو ان کی ذہنی حالت مشکوک سی محسوس ہونے لگی۔

”تو جو بھی سمجھ میرا دل واقعی پاگل ہوا جا رہا ہے اُجالا کی محبت میں اور میں میڈم عذرا کو

چار لاکھ تو کیا دس لاکھ بھی دے سکتا ہوں اُجالے کے بدلے میں۔“

ہارون نے بے حد سنجیدگی سے کہا تو اس کے کان کے قریب منہ لا کر بولا۔

”او بھائی آہستہ بول..... اس لالچی میڈم کے کان میں اگر یہ بات پڑ گئی تو وہ تجھ سے

تیری ساری جائیداد مانگ لے گی اُجالا کے بدلے میں۔“

”تو مانگ لے..... میں دے دوں گا۔“ ہارون نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو سچ بول پاگل ہو گیا ہے۔ ساجد نے فکر مندی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔“ یار اُجالا

کے متعلق تجھے میڈم عذرا نے جو کچھ بتایا ہے، وہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”مجھے غلط صحیح کی پرواہ نہیں ہے۔“ ہارون بے نیازی سے بولے۔ ”مجھے صرف اُجالا

چاہئے۔“

”تو میرے دوست تیرے عالی شان گھر میں جگہ جگہ تو ٹیوب لائٹس جل رہی ہوتی ہیں

اور کتنا اُجالا چاہئے تجھے۔“ ساجد نے نہ مزاح لہجے میں کہا۔

”ساجد تو مذاق سمجھ رہا ہے مگر میں بے حد سنجیدہ ہوں۔“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تجھے ہوا کیا ہے۔ اُجالا سے پہلے بھی تو سینکڑوں

لڑکیاں تجھے دکھائی دی ہیں۔ اس لڑکی میں کیا خاص بات ہے جو تو پہلی نظر میں ہی گھائل ہو گیا۔“

ساجد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”پیار کا دار اسی طرح ہوا کرتا ہے۔ اچانک، ایک دم..... بے خبری کے عالم میں اور دل

کی دنیا ہی بدل کر رہ جاتی ہے۔“ ہارون اس نئے جذبے میں ڈوبے مدہم لہجے میں بولے۔

”مگر ہارون یہ میڈم عذرا تو سودا کر رہی ہے اُجالا کا، اور تم اس کی بات مان کر اسے مزید ہبہ دے رہے ہو۔ اس طرح تو یہ دوسری لڑکیوں کے بھی دام وصول کر کے بیاہے گی۔“ ساجد نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو تو مجھے بیوقوف سمجھتا ہے۔“ ہارون نے اسے خفگی سے دیکھا۔

”پہلے نہیں سمجھتا تھا مگر اب سمجھنے لگا ہوں۔ پہلی نظر کی محبت سنی تو تھی، آج تمہارے دل و نظر کے پاگل پن کے طفیل دیکھ بھی لی ہے۔ یار نر بے وقوف ہے تو..... ہر کام تو سوچ سمجھ کے کرتا ہے اور شادی جو عمر بھر کا بندھن ہے، اسے تو ایک نظر اور ایک ملاقات میں طے کر رہا ہے۔ یار کچھ تو سوچ..... وہ اُجالا اس میڈم عذرا کی چچی بھی تو ہو سکتی ہے۔ کہیں بعد میں وہ تجھے دفنانہ دے جائے اور یہ سارا چکر تیری دولت کے حصول کے لئے چلایا ہوا نہ نکلے۔“

”شٹ آپ یار.....“ ہارون نے اسے چپ کرادیا۔ وہ اُجالا کے متعلق ایسی باتیں سن ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو انہیں بہت معصوم اور پاکیزہ لڑکی محسوس ہوئی تھی۔

”اُجالا کے بارے میں ایسی فضول باتیں مت کہہ۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ اگر میں نے اُجالا کو اس دلدل سے نہ نکالا تو ساجد یار..... یہ میڈم اس کی شادی کسی لکھ پتی یا کروڑ پتی بڑھے سے کرادے گی۔ ایسا ہوتا چلا آیا ہے یہاں۔ کونسا لڑکیوں کی خبر رکھنے والا کوئی ہے جو میڈم کو کسی کا خوف ہو۔ اسے تو روپیہ پیسہ چاہئے اور میں اُجالا کو پیسے نہیں، اپنے پیار سے خرید کر لے جاؤں گا۔“

”چلو کروڑ پتی بڑھے سے کروڑ پتی جوان بہتر ہے بلکہ بہتر ہے، مگر ایک بات تو میری بھی سن لے۔“ ساجد نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔

”بول!“

”اُج.....“ واقعی اُج لڑکی سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی ہے تو تجھے اس پہلی نظر کی محبت کا واسطہ ہے اور وہ یہ کہ میڈم کو تو اُجالا کے زیادہ ایک پائی بھی نہیں دے گا۔“

”اچھا یار نہیں دوں گا۔“

”چل اب وہ میڈم تجھے کیا سنا رہی ہوگی۔“ ہارون نے آہستگی سے کہا اور اب کی بار وہ ساجد کا بازو پکڑ کر میڈم کے سامنے کرسی پر آ بیٹھے۔

”یہ لیجئے میڈم یہ چار لاکھ روپے کا چیک ہے۔“ ہارون نے چیک بک سے چیک پھاڑ کر میڈم عذرا کو تھما دیا جسے دیکھتے ہی میڈم عذرا کی باچھیں کھل گئیں۔

اور میں مزید ایک لاکھ روپیہ اس ادارے کی بچیوں کے لئے ان کی بنیادی ضروریات کے لئے دوں گا اور شادی کے موقع تمام لڑکیوں کے لئے میں لباس اپنے پیسوں سے خرید کر بھجواؤں گا۔ تمام صفائی کے انتظامات بھی میرے آدمی آکر کر جائیں گے۔“

”پر ہارون.....“ ساجد نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو ہارون نے اشارے سے اسے خاموش کرادیا۔ ”تم چپ رہو مجھے بات کرنے دو۔“

”میڈم میں چاہتا ہوں کہ اُجالا اس ادارے سے اس طرح رخصت ہو جس طرح بیٹی ذہن بن کر اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہے۔ اسے کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہونی چاہئے۔“ ہارون نے دوبارہ میڈم عذرا سے بات شروع کر دی۔

”ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ میڈم عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سارے کاموں سے مفت میں جان نچوٹ رہی تھی۔ وہ تو بہت خوش تھیں، انہیں تو کچھ بھی نہیں دینا تھا۔

”اور ہاں میڈم! یہ چیک اس روز ہی کیش ہوگا، جس روز اُجالا کا مجھ سے نکاح ہو جائے گا۔ تاریخ میں نے جمعے کی ہی لکھی ہے۔“ ہارون نے سنجیدگی سے بتایا۔

”تو گویا آپ کو اعتبار نہیں ہے ہماری بات کا۔“ میڈم نے مسکرا کہا۔

”میڈم میں ایک بزنس مین ہوں۔ نفع نقصان پہلے دیکھتا ہوں اور ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہوں۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا، ساجد نے اسے خوب گھورا۔

”اور میڈم جمعے کو ہاف ڈے ہوتا ہے۔ چیک بینک بند ہونے سے پہلے کیش کرا لیجئے گا۔ پہلے نکاح، پھر چیک کیش کرائیے گا۔ چیک کیش نہ ہونے کی صورت میں آپ چار لاکھ کیش ہارون سے لے لیجئے گا چیک واپس کر کے۔ کیوں میں نے صحیح کہا تھا؟“ ساجد نے جلدی سے کہنے کے بعد ہارون کی طرف دیکھا۔

”ہاں صحیح کہا!“ ہارون ہنس پڑے۔

”چلئے آپ کو مبارک ہو..... جمعے کے دن آپ آجائیے۔ اُجالا آپ کو ذہن کے روپ میں تیار ملے گی۔“ میڈم عذرا نے ہنس کر کہا تو ہارون بولے۔

”ذہن یعنی اُجالا کے لئے لباس اور زیورات بھی میں اپنی ملازمت کے ہاتھ شادی والے دن ہی بھجواؤں گا۔ آپ کسی قسم کا تردد نہ کیجئے گا۔“

”جیسے آپ کی خوشی۔“ میڈم عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انہیں تو زیور اور کپڑے کے

خرچ سے بھی چھٹکارا مل گیا تھا اور چالاک روپے کا چیک، ادارے کے سارے انتظامات، نیا سامان سب کچھ مل رہا تھا۔ وہ تو بہت خوش تھیں اور کیوں نہ ہوں؟ سونے کی چڑیا آخر کام آئی گئی تھی..... ٹھیک مول لگا ہے اُجالا کا۔ میڈم عذرا نے دل میں سوچا۔

☆☆☆

اُجالا اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی تھی اور ہارون کا دیا ہوا وزنگ کارڈ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی کہ بلیس اور اس کی ہم عمر لڑکیاں گردپ کی شکل میں کورس گاتی کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس نے جلدی سے کارڈ اپنے سینے کے نیچے رکھ دیا اور ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”کیا ہوا ہے جو اس طرح گلے پھاڑ پھاڑ کر بے سہری ہوئی جا رہی ہو؟“

”ارے واہ! ہم سے پوچھتی ہے بچی کہ کیا ہوا ہے؟ اری ہم تو تجھ سے پوچھنے آئے ہیں کہ کٹو نے کیا جادو چلایا ہے اُن اخبار والوں پر۔ جو وہ اپنا دل تجھے دے بیٹھے ہیں۔“ بلیس نے بہت عامیانہ انداز میں کہا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں میڈم سے کہہ کر کسی دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر کو بلواتی ہوں۔“ اُجالا نے بیڈ سے اُترتے ہوئے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

”بے وقوف اتنے فلک شکاف قہقہے مت لگاؤ۔ اگر کمروں کی چھتوں میں شکاف پڑ گئے تہ تو بارش میں نہایا کرو گی برساتی میڈیکوں کی طرح۔“ اُجالا نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، وہ پھر ہنس پڑیں۔

”بات نالومت..... سچ بتاؤ تمہیں کیسے لگے وہ؟“ راحیلہ نے شوشی سے پوچھا۔

”وہ کون؟ تم سب کس کی بات کر رہی ہو؟“ اُجالا سچ نہیں سمجھی تھی، اُلجھ کر بولی۔

”لوجی انہیں پتا ہی نہیں ہے ارے اس جیسے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“ انجم نے دھماکہ

کیا۔

”کیا؟“ وہ حیرت سے چیخ اُٹھی۔ ”میری شادی؟“

”ہاں! تمہاری شادی..... وہ جو آئے تھے نا اخبار والے ان سے۔“ بلیس نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

”اس موٹے صحافی سے۔“ اُجالا کی نظروں میں ساجد کا بھاری بھر کم وجود آسمایا۔

”نہیں اس کے۔ اتھ جو ہیرو ٹائپ شخص آیا تھا نا، اس سے ہو رہی ہے تمہاری شادی۔“

”میڈم نے تو ہاں کر دی ہے، اب تم ہاں کرو گی بنورانی.....“ انجم نے اس کی تھوڑی پکڑ

کر چھیڑنے والے انداز میں مزید انکشاف کیا۔

”میری شادی اتنی جلدی اور وہ بھی ہارون صاحب سے۔“

اُجالا حیرت کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھی۔ وہ سب اسے کافی دیر تک چھیڑنے کے بعد کمرے سے چلتی بنیں۔ میڈم عذرا نے اُجالا کو الگ کمرہ دیا ہوا تھا۔ سبب یہ تھا کہ یہ ادارہ اُجالا کے والد نے تعمیر کرایا تھا۔ اب اس کی بد قسمتی اُسے یہاں لے آئی تھی تو انہوں نے اُسے ایک علیحدہ کمرہ دے کر اپنی طرف سے اس پر احسان کر دیا تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے جگہ کم ہو جاتی یا لڑکیوں میں آپس میں ناراضگی ہو جاتی تو میڈم کے کہنے پر اُجالا ایک دولڑکیوں کو بخوشی اپنے کمرے میں ٹھہر لیا کرتی تھی۔ بعد میں میڈم انہیں سمجھا بچھا کر دوسرے کمروں میں یا ان کے سابقہ کمروں میں کھپا دے کرتی تھیں۔

”ہارون صاحب نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کیوں کیا اور اتنی جلدی کیسے کر لیا؟“ اس نے سوچا۔

مگر باواز سوچ تھی جسے میڈم عذرا نے واضح طور پر سنا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس کے قریب چلی آئیں اور بولیں۔ ”تم ہو ہی اتنی حسین و دلنشین کہ دیکھنے والا پہلی ہی نظر میں تمہیں دا دے بیٹھے۔“

”میڈم کیا یہ سچ ہے کہ میری شادی ہارون صاحب سے ہو رہی ہے؟“

”ہاں یہ سچ ہے..... اس جیسے کو تم ہارون صاحب کی دلہن بن جاؤ گی۔“ میڈم عذرا نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مگر یہ سب اچانک کیسے ہو گیا؟“

”اُجالا ڈیر رشتے تو آسمانوں پر بننے ہیں۔ تمہارا رشتہ ہارون صاحب کے ساتھ لکھا ہوا سو وہ یہاں تک پہنچ گئے اور تمہارے قیامت خیز حسن و سیرت کے آگے اپنا دل ہار بیٹھے۔ وہ بہت شریف انسان ہیں۔ تم یقیناً اُن کے ساتھ خوش رہو گی۔ اب تم سو جاؤ اور شادی کے لئے خود کو ڈنڈا طور پر تیار کر لو..... شب بخیر!“

میڈم عذرا کے کمرے سے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا اور اپنے بیڈ پر آکر سینے کے نیچے سے ہارون کا وزنگ کارڈ نکالا اور ہارون کا نام پڑھتے ہی حیا کے دھندلے رنگ آپ ہی آپ اس کے چہرے پر بکھرنے لگے۔

”مس اُجالا آپ خوش رہا کریں۔ اُداسی اچھی نہیں لگتی بعض چہروں پر۔“



تھے، آئی تھیں۔ وہ لوگ ان کی طرف سے بطور گواہ پیش دئے تھے۔ انا اُجالا کو اس کی سہیلیوں نے گھیر رکھا تھا اور ہارون کے حوالے سے اسے خوب تنگ کر رہی تھیں۔ وہ ان کی چھیڑ چھاڑ سے خوب محفوظ ہو رہی تھی۔

”اُجالا اپنے دولہا میاں کو تو دیکھو، سیاہ تھری ٹیس سوٹ میں اصلی فلمی ہیرو لگ رہے ہیں۔ ایمان سے کہہ رہی ہوں تم ان کی نظر اتار لو ورنہ انہیں نظر لگ جائے گی ہماری۔“ بلیٹیس نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

”خبردار! جو میرے دولہا میاں کو کسی نے بُری نظر سے دیکھا ہو۔ آنکھیں نکال دوں گی۔“ اُجالا اپنی عادت سے مجبور تھی۔ خاموش کہاں رہ سکتی تھی، فٹ سے جواب دیا تو وہ سب ہنسنے لگیں۔

”ارے واہ! کیا احساسات ہیں، ابھی سے یہ حال ہے تو یہاں سے وہاں جا کر تو تم ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالو گی۔“ انجمن نے اس کے ہاتھ پر چٹکی بھر کر کہا۔

”تمہیں گھاس کھانے کا شوق ہے تو میں بھجوا دوں گی تمہارے لئے دو تین ٹرک گھاس کے۔“ اُجالا نے بھی فوراً بدلا اُتارتے ہوئے اس کے بازو پر زور سے چٹکی بھر کر کہا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ باقی سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

”اُجالا تمہارا ہاتھ اچھے ہاتھ میں جا رہا ہے۔ بہت مالدار ہیں تمہارے دولہا صاحب۔ پورے چار لاکھ روپے دیئے ہیں انہوں نے تمہارے بدلے میں میڈم کو..... ورنہ تو میڈم عذرا یہ شادی ہونے ہی نہ دیتیں.....“ زبیدہ نے بڑے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ وہ لگائی بجائی اور فساد پڑوانے میں ماہر تھی اور ہر خوشی کے موقع پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ جاتی تھی کہ جس سے دوسرے کی ساری خوشی پر پانی پڑ جاتا تھا۔

”تم سے کس نے کہا؟“ اُجالا نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

”مجھے کس نے کہنا یا بتانا تھا۔“ وہ بڑی ادا سے بولی۔ ”میں خود ہی ہر بات کی خبر رکھتی ہوں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ہے۔ ہارون صاحب کو میڈم عذرا بتا رہی تھیں کہ ان کا دیا ہوا چار لاکھ روپے کا چیک کیش ہو گیا ہے۔ بہت بہت شمریہ! اب آپ اُجالا کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں..... ویسے اچھے ٹیک دل فحش دکھائی دیتے ہیں ہارون صاحب! تمہاری قیمت بھی ادا کر دی ہے اور ہم سب کے لئے کپڑے، جوتے، کمبل، بستروں کی چادریں، کتاہیں وغیرہ بھی بھجوا دی ہیں۔ تم تو خوب عیش کرو گی ان کے گھر میں۔“

”جن چہروں سے ہم پیار کرنے لگتے ہیں ان چہروں کی اُداسی ہمیں تکلیف دیتی ہے۔“

”آپ کا نام اُجالا ہی ہونا چاہئے تھا۔“

ہارون کے یہ معنی خیز جملے اس کے دل میں سماعتوں کی شہنائیاں بجا رہے تھے۔ خوشی کا احساس اُس کے روم روم میں سما گیا تھا۔ کوئی اسے یعنی اُجالا فراز کو بھی چاہ سکتا ہے، اس کی تمنا کر سکتا ہے، اُسے اپنانے کے لئے بے تاب ہو سکتا ہے۔ اتنی جلدی اس کے قرب کا طلبگار بن کر آ سکتا ہے۔ یہ سوچ کر ہی اُسے ہارون پر پیار آ رہا تھا۔ اسے اپنی قسمت کی مہربانی آج پہلی بار محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ اپنی قسمت سے نالاں ہی رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے حصے کی خوشیاں اور محبتیں اپنے والدین کی زندگی میں وصول کر چکی ہے۔ اب زندگی میں کوئی خوشی، کوئی محبت اُس کی منتظر نہیں ہے۔ کوئی اس کے لئے محبت محسوس نہیں کرے گا۔ مگر ہارون کی صورت میں اسے خوشیوں اور محبتوں کا احساس پھر سے مل رہا تھا۔ وہ بہت مسرور ہو رہی تھی۔

”ہارون!“ اُجالا نے کارڈ پر لکھے ہارون کے نام پر اپنے گلاب سے نرم ہونٹ رکھ دیئے اور یہ رات اس نے ہارون کے حوالے سے خواب دیکھتے گزاری۔ خوشی اس کے پورے وجود سے چٹک رہی تھی۔ وہ فطرتاً بہت محبت کرنے والی لڑکی تھی اور اب جب ہارون نے اسے اپنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور میڈم عذرا سے اپنی بات منوا بھی لی تھی، وہ ہارون کو دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگی تھی۔ ایک اتفاقی ملاقات نے اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ ہارون کی محبت نے اس کے دل کا دھڑکنے کو ایک نیا انداز عطا کر دیا تھا۔ خوشی، مسرت و انبساط کے انوکھے رنگوں اور احساس کے لطیف جذبوں سے روشناس کرایا تھا۔ وہ اپنے چاہنے والے کے لئے اپنی زندگی بھی قربان کر دینے کا زہم رکھنے والی لڑکی تھی اور ہارون کو اس نے اپنی تمام تر محبتوں اور چاہتوں کا محور دل سے تسلیم کر لیا تھا۔

☆☆☆

ہارون نے نہ اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ انہوں نے دارالابان کو بہت اچھڑا طرح سجاوا۔ تمام زکیوں کو کپڑے، جوتے اور دیگر ضرورت کی چیزیں جو اُجالا نے ان سے ڈونٹ کر نے کے لئے مانگی تھیں، وہ سب چیزیں انہوں نے لڑکیوں تک پہنچا دی تھیں اور آج شادی کا دن تھا۔ ہارون کا بچا ادا سرخ عروسی ٹوڑا نہیں کر اُجالا کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ جھلملاتے زیورات اور عروسی میک اپ میں مہندی سے سجے ہاتھوں میں سرخ سنہری چوڑیاں پہنے ہارون کے دل پر قیامت ڈھا رہی تھی۔ انہوں نے دل سے دل سے اس کی نظر اتار دی۔ نکاح بخیر و خوبی انجام پایا۔ ہارون کے ساتھ ہارون ان کی جگمگ اور بار بار کے گھریلو ملازمت میں گلو چاچا اور آمنہ بی جی جنہیں ہارون اتانی کہا کرتے

مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اتنی جلدی بھی کسی سے پیار ہوا ہے کبھی۔ اتنی جلدی تو خود پر بھی اعتبار نہیں آتا۔ سال مہینے نکلتے ہیں کسی صورت کو تراشنے میں، جب کہیں جا کے دل کے مندر میں رہنے کے لائق صورت بن کے ابھرتی ہے۔ پر میں نے یہ کیا کیا، مجھے تو پہلی ملاقات ہی نے محبت کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اس میں میری اپنی ہی خطا ہے۔ مجھے ہی اپنے آپ پر، اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ شاید محبت میں اختیار صرف محبت کو حاصل ہوتا ہے۔“

اُجالا اپنی سوچوں میں گم تھی کہ میڈم عذرا نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور وہ بری طرح چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”اٹھو اُجالا رخصتی کا وقت ہو گیا۔“ میڈم عذرا نے بہت نرم اور شیریں لہجے میں کہا۔

”رخصتی کا، دلہن کی رخصتی کا یا جنازے کی رخصتی کا.....“ اُجالا نے سختی سے سوچا۔

ایک دم سے اس کا دل نفرت اور غصے سے بھر گیا۔ اسے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

”اُجالا کے جانے سے ہمارے ادارے میں تو اندھیرا ہو جائے گا ہارون بھائی۔“ بلیٹیس

جو اُجالا کا بازو پکڑے چل رہی تھی، اس کے برابر میں چلتے ہارون کی طرف دیکھ کر بولی تو ہارون نے پیار بھری نگاہ اُجالا کے چہرے پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولے۔

”آپ اُجالا کی یادوں سے اُجالا کر لیجئے گا۔“

”خاصے حاضر دماغ ہیں موصوف۔“ اُجالا نے دل میں کہا۔

”ہارون بھائی! آپ اُجالا کو ہم سے ملوانے تو لاتے رہیں گے ناں؟“ انجم نے پوچھا۔

”جی ہاں بالکل لایا کروں گا۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا اُجالا بیٹی اللہ کے حوالے۔“ میڈم عذرا نے اسے گلے لگا کر کہا۔ ”خدا تمہیں خوش

رکھے۔“

اُجالا کی آنکھوں سے ان جموٹے جذبوں کے اظہار پر ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ البتہ وہ

بلیٹیس، انجم، راحیلہ اور ادارے کی پرانی خادمہ حمیدہ بی بی جو اس کے والد کے زمانے سے اس

ادارے سے وابستہ تھیں، سے ملتے وقت وہ آنسوؤں پر مزید بند نہ باندھ سکی اور آنسوؤں کے سیلاب

کو بہنے دیا۔ قرآن کے سائے میں اسے ہارون کی شاعرانہ ہونکی کار میں پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔

ساجد تو ان کی تصویریں کھینچنے میں مگن تھے۔ ہارون کے پچھلے سیٹ پر اُجالا کے ساتھ بیٹھنے ہی ساجد

نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ان کے برابر اس کی بیوی ثوبیہ بیٹھی تھی۔ وہ دونوں ہی بہت خوش

مزاج میاں بیوی تھے اور دونوں کی جوڑی بہت خوبصورت تھی۔ اُجالا کو اس کی سہیلیوں نے چند

”ہارون نے میری قیمت ادا کی ہے میڈم کو.....“ اُجالا ڈکھی ہو کر بولی۔

”ظاہر ہے تم ہیرا ہو ہیرا..... میڈم تمہیں یونہی تو کسی کے حوالے نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں

نے بالکل صحیح قیمت لگائی ہے تمہارے حسن کی۔ ارے میڈم عذرا اسی لئے تو تمہیں آفس جانے کے

لئے کہتی تھیں تاکہ کوئی مالدار آسانی آئے اور تمہارے حسن اور گفتگو سے متاثر ہو کر تمہارا ہاتھ مانگے

ور میڈم اپنا ہاتھ پھیلا کر تمہارے بدلے منہ مانگی قیمت وصول کر لیں۔ سو آج وہ کامیاب ہو گئی ہیں

اپنے اس منصوبے میں اور بہت خوش ہیں۔ انہیں تو تمہاری شادی پر اپنی طرف سے ایک آنہ بھی خرچ

نہیں کرنا پڑا۔ سب کچھ ہارون صاحب کے پیسوں سے ہوا ہے۔ دولت چیز ہی ایسی ہے، سب کچھ

آخرید لیتی ہے۔“ زبیدہ نے اپنی بات مکمل کی اور اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

”اس نے تو آگ لگائی تھی سوچنا گاریاں چھوڑ گئی ہے۔“ اُجالا تم اس گھنیا لڑکی کی باتوں

پر دھیان مت دینا اور خوشی خوشی ہارون بھائی کے ساتھ جانا۔“ بلیٹیس نے نرمی سے سمجھایا۔

”خوشی..... ہاں..... خوشی.....“ اُجالا بس یونہی بول پائی۔ اس کی ساری خوشی کا نور ہو گئی

تھی۔ زبیدہ کے جملوں نے اس کے دل پر کاری ضرب لگائی تھی۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہو رہی

تھی۔ حیرت، دکھ اور احساسِ ذلت سے اس کا رواں رواں جل رہا تھا۔ اس کا دلکش چہرہ دھواں

دھواں ہو رہا تھا۔ دل ریزہ ریزہ ہو رہا تھا، ڈکھی ہو رہا تھا، رو رہا تھا۔

”تو میں ایک خریدی ہوئی لڑکی کی حیثیت سے ہارون کے ساتھ جاؤں گی۔ ان کی بیوی

کی حیثیت سے نہیں۔ میڈم نے میرا سودا کیا، میری بولی لگائی اور منہ مانگی قیمت وصول بھی کر

لی.....“ اُجالا نے بہت دکھ سے سوچا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری جا رہی تھیں جنہیں وہ بڑی

مشکل سے روک رہی تھی۔

”جہاں میں نے اپنی عمر کے دس برس گزارے، وہاں میری قیمت لگا دی گئی۔ میں اب

یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ میڈم اس حد تک گر سکتی ہیں اور ہارون! وہ تو ایسے دکھائی نہیں دیتے تھے

ور انہوں نے مجھے خرید لیا، اپنی محبت سے نہیں، دولت سے۔ میڈم کو تو میں اپنا سمجھتی تھی، جب انہوں

نے ہی اپنائیت کا بھرم توڑ ڈالا ہے تو..... ہارون تو غیر تھے۔ ان سے کسی لہٹائی یا محبت کی توقع رکھنا

مراسر حقاقت تھی میری۔ جب اپنے ہی پیار نہ دے سکیں تو بھلا غیر کیا محبت دیں گے۔ وہ بھی مجھ جیسی

جیم، بے سہارا اور کچھ لڑکی کو۔ اپنے ہی اپنے نہ بن سکے تو غیر کیسے اپنے بن سکتے ہیں۔ وہ بھی

ایک ملاقات میں۔“

”میں نے ہارون کو اسنے دل میں جکھ دی، یہ میری حقاقت تھی یا شاید محبت تھی مگر انہیں تو

جگہ جگہ گلاب سجے ہوئے تھے۔ سرخ، نارنجی، زرد اور سبز ہر رنگ کے گلاب بیڈ کی سائیز ٹیبل پر ڈرینگ ٹیبل پر میز پر اور کارپٹ پر گلاب ہی گلاب تھے۔ ہر سو اور خوبصورت مچی ہوئی دلہن کی سبز جس پر ٹوبیہ نے اسے بٹھا دیا تھا اور اب وہ اس سے ہارون کی ہی باتیں کر رہی تھیں۔ ٹوبیہ نے ہی اسے بتایا کہ ہارون کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ آمنہ بی نے انہیں اور ان کی بہن کو اپنے بچوں کی طرح پالا ہے۔ تین سال پہلے وہ ماں باپ دونوں کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی بڑی بہن عائشہ اپنے تین بچوں اور شوہر کے ساتھ شارجہ میں مقیم ہیں اور بہت خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہیں اور یہ بھی کہ ہارون کافی عرصے سے شادی پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے مگر جب اُجالا کو دیکھا تو فوراً ہی اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا اور بھی بہت کچھ ٹوبیہ نے اسے ہارون کے متعلق بتایا۔ وہ عجیب طرح کی الجھن اور کشمکش میں مبتلا ہوتی جا رہی تھی۔ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے؟ اس کی شادی اور چار لاکھ والا معاملہ کتنا سچا ہے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی مگر یہ بات اسے اندر ہی اندر ڈس رہی تھی کہ اسے چار لاکھ روپے لے کر ہارون کی دلہن بنایا گیا ہے۔

ٹوبیہ آدھے گھنٹے بعد چلی گئی تو اس کے جاتے ہی اس نے سارے زیورات اُتار دیئے۔ اپنے سوٹ کیس میں سے اپنا سوٹ نکالا اور ڈرینگ روم میں جا کر عروسی جوڑا تار کر وہ سوٹ پہن لیا اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آگئی۔

ہارون کافی دیر بعد ساجد اور ٹوبیہ کو رخصت کر کے بیڈ روم آئے۔ وہ صوفے بیٹھی تھی اور خود کو ان سے لڑنے کے لئے تیار کر چکی تھی۔ ہارون نے اسے یوں سادگی سے آسانی رنگ کے کاشن کے سوٹ میں ملبوس صوفے پر بیٹھے دیکھا تو انہیں بہت حیرت ہوئی۔ وہ اس کے سامنے میز پر بیٹھ گئے۔

”اُجالا ڈیر یہ تو بہت زیادتی ہے۔ میں نے اس رات کے انتظار میں دن گن گن کر گزارے ہیں اور آپ نے اپنا روپ ہی تبدیل کر لیا۔ میں تو آپ کو دلہن کے روپ میں پھولوں کی اسی سبز پر بیٹھا ہوا دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ تھوڑا سا انتظار کر لیا ہوتا کم از کم ہمیں اپنا دلہن والا حسین روپ قریب سے دیکھنے کا شرف تو بخش دیا ہوتا۔ یہ تو بہت ناانصافی ہے اور آپ کو اس ناانصافی کی تلافی کرنا ہوگی۔“ ہارون نے بے حد نرم اور محبت آگئیں لہجے میں کہا۔

”اور جو ناانصافی آپ نے میرے ساتھ کی، اس کی تلافی کرن کرے گا۔“ اُجالا نے نہایت سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ حیران ہو کر بولے۔

”بھئی کون سی ناانصافی کیسی تلافی؟“ اس پہلی ملاقات کے بعد میں اب آپ سے مل رہا ہوں۔ اس عرصے میں ایسا کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے مجھ سے جو آپ اس قدر خفا ہو رہی ہیں؟“

تجائف بھی دیئے تھے اور میڈم عذرا نے اسے ایک خوبصورت کرسٹل کا ڈیکوریشن سیٹ دیا تھا جو کہ انہوں نے رسما ہی دیا تھا۔ چونکہ وہ اس ادارے کی نگران تھیں۔ لہذا انہیں یہ فرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ اس کی سہیلیاں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ افسردہ بھی تھیں اور دل سے اس کی زندگی کے، اس کے نئے سفر کے لئے نیک تمناؤں اور دعاؤں کا اظہار کر رہی تھیں۔

☆☆☆

”ہارون ولا“ میں کارڈ کی تو آمنہ بی بی نے ہی اُجالا کی جانب آکر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ ان سے پہلے ہی ان کے استقبال کے لئے وہاں پہنچ گئی تھیں۔ ہارون نے سادگی سے شادی کا اہتمام کیا تھا جبکہ ویسے پر شاندار دعوت دینے کا ارادہ تھا ان کا۔ اسی وجہ سے اس تقریباً میں گھر کے ملازموں اور ساجد اور اس کی بیوی ٹوبیہ کے علاوہ ان کا کوئی دوست یا عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا۔

آمنہ بی اور ٹوبیہ نے اُجالا کو دائیں بائیں سے پکڑا اور قرآن کے سائے میں اندر لے گئیں۔ وہ جہاں سے بھی گزری، اسے اپنے قدموں تلے سرخ رنگ کا کارپٹ بچھا دکھائی دیا۔ ایک لمحے کو تو وہ خود کو شہزادی تصور کرنے لگی تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہ ایک خریدی ہوئی لڑکی کے خیال سے تڑپ کر رہ گئی۔

”ٹوبی تم ذرا بھابی کو ڈرائنگ روم میں ادھر صوفے پر بٹھاؤ۔ ڈولہا ہارون ملک کے ساتھ ان کے چند خصوصی پوز ہو جائیں۔ میرا کیمرا اس خوبصورت کپل کو خوش آمدید کہنے کے لئے بے چین ہے۔“ ساجد نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی کہا۔

ہارون دھیرے سے ہنس دیئے۔ ٹوبیہ نے اُجالا کو صوفے پر بٹھا دیا۔ ہارون بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ساجد نے ان دونوں کی کئی تصویریں کھینچیں۔ اپنے اور ٹوبی کے ساتھ بھی تصویریں بنوائیں اور گھر کے ملازمین خاص کر آمنہ بی ان تصویروں میں نمایاں تھیں۔

”ساجد اب بس کریں۔ بھابی تھک گئی ہوں گی۔ انہیں ان کے کمرے تک پہنچانے دیں مجھے۔“ ٹوبیہ نے ساجد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اوکے رول بھی ختم ہو گیا ہے۔“ ساجد نے مسکراتے ہوئے کیمرا کو پیش بند کر دیا۔ ٹوبیہ اُجالا کو لے کر ہارون کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو اُجالا کو تازگی کا احساس ہوا۔ گلاب کی خوشبو اس کی سانسوں میں اُتر گئی۔ کمرہ ایئر فریشر اور گلابوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔



”آپ نے مجھے چار لاکھ روپے دے کر خریدا ہے..... ہے نا؟“

”واٹ!“ ہارون کو یکدم دھچکا لگا اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر، لیکن وہ کچھ کچھ بات کو سمجھ رہے تھے۔ انہیں یقین سے بتا دیا تھا کہ زبیدہ نے چار لاکھ والی بات اُجالا کو کس انداز میں بتائی ہے۔ مگر انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُجالا اس بات کو اس قدر سنجیدہ سمجھا لے سکتی ہے۔

”اُجالا تمہیں شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے.....“ ہارون نے ٹائی کی ٹاٹ کھولتے ہوئے کہا۔

مگر وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ غصیلے لہجے میں بولی۔

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ آپ نے میڈم عذرا سے خریدا ہے مجھے۔ انہوں نے میری بولی لگائی اور آپ نے انہیں ان کی منہ مانی قیمت ادا کر دی۔ میرا سودا کیا ہے آپ نے..... یہی ہے آپ کی مراد مگر؟ آپ نے مجھے اتنا گھٹیا، لاوارث اور بے وقعت سمجھا تھا جو مجھے اپنی دولت کے بل پر خریدا لائے۔“

”سٹ آپ!“ ہارون کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ قدرے اونچی آواز میں بولے..... ”میں نے تمہیں خریدا ہوتا تو میں تم سے نکاح ہرگز نہ کرتا۔ یہ اہتمام ہرگز نہ کرتا۔“

”آئی ہیٹ یو مسٹر ہارون..... نفرت ہو گئی ہے مجھے آپ سے۔“ وہ بھیگتی آواز میں بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اس بات کے معلوم ہونے سے پہلے تک تمہیں مجھ سے محبت ہو چکی تھی۔ اُجالا کیا ایسا ہی تھا؟“ ہارون نے اس کے میک آپ سے بے نیاز چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میک آپ کے ڈھلے ڈھلے اثرات سے اس کا چہرہ اور بھی حسین و دلکش لگ رہا تھا۔

”میں جھوٹ نہیں بولتی۔“ اس نے بھیگتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہاں مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی اور میں نے اپنی ساری محبتوں کا حقدار صرف آپ کو سمجھ لیا تھا مگر اب مجھے نفرت ہے آپ سے..... آپ نے مجھے خریدا ہے۔“

”خریدی ہوئی لڑکی کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے؟ جانتی ہو تم؟“ ہارون نے کہا۔ ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ مجھے آپ سے نفرت ہے۔“ وہ بولتے ہوئے رو پڑی۔

”چلو کوئی بات نہیں..... نفرت بھی تو محبت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے اور نفرت کا اظہار بھی انہیں سے کیا جاتا ہے جن سے محبت کا رشتہ ہو۔“ ہارون اس کے اعتراف محبت پر بے حد مسرور تھے مسکراتے ہوئے بولے۔

اُجالا نے روتے ہوئے کہا: ”کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا، یہاں سب دولت سے پیار

کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دولت حاصل کرنے کے لئے خون کے رشتے بھلا بیٹھتے ہیں اور کچھ لوگ اپنی دولت کے بل بوتے پر مجھ جیسے انسانوں کو خرید لیتے ہیں۔ میں سمجھی تھی کہ آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے، اسی لئے آپ مجھے اپنانا چاہتے ہیں۔“

”تم نے بالکل صحیح سمجھا تھا۔“ ہارون نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں نے غلط سمجھا تھا۔ آپ تو بزنس میں ہیں ناں۔ انسانی رشتوں کو بھی دولت کے ترازو میں تولتے ہیں سب..... سب لوگ دولت سے پیار کرتے ہیں۔ میڈم نے دولت کے لئے میرا سودا کر دیا..... اور آپ نے..... آپ نے کیا سوچ کر میری قیمت ادا کی تھی بتائیے؟“

اُجالا نے روتے ہوئے پوچھا۔

”اُجالا پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ مت روؤ..... میں تو تمہاری آنکھوں میں خوشیوں کے ستارے جگمگاتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ ان آنسوؤں سے تمہیں نجات دلانا چاہتا تھا میں نے بہت خلوص سے تمہیں اپنایا ہے۔ سچے دل سے تمہیں چاہا ہے اور یہی بات چار لاکھ روپے کی، تو اگر میں میڈم عذرا کو چار لاکھ ادا نہ کرتا تو انہوں نے کسی اور لکھ پتی یا کروڑ پتی ستر، اسی سالہ بوڑھے یا جوان سے اتنی ہی یا شاید اس سے بھی زیادہ قیمت وصول کر کے تمہیں اس کے ساتھ بیاہ دینا تھا۔ میں نے میں میڈم کے رویے میں لالچ کو محسوس کر لیا تھا۔ جیسی اتنی جلدی کی تا کہ میڈم تمہیں کسی اور کے حوالے نہ کر دے۔ میں محبت کرتا ہوں تم سے اور میں اپنی محبت کے ساتھ نا انصافی ہرگز نہیں کر سکتا۔“

”وہ تو آپ کر چکے ہیں۔“ اُجالا نے بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتنی جلدی بھی کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے؟ آپ نے اپنی دولت سے مجھے خریدا ہے محبت سے نہیں..... میں کوئی بکا و مال تو نہیں تھی جو آپ نے مجھے خریدا لیا۔“

”اُجالا پلیز.....“ ہارون قدرے بلند آواز میں بولے۔ ”تم انسٹ کر رہی ہو میرے سچے اور بے ریا جذبے کی اور میں اپنی انسٹ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”انسٹ تو آپ نے میری کی ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

انہوں نے نرمی سے اُسے یقین دلانا چاہا۔

”میں نے صرف محبت کی ہے تم سے۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔“

”تو تم نے مجھ سے محبت کیوں تھی؟“ ہارون کا لہجہ شوخ ہو گیا۔

”حماقت کی تھی“ اس نے آنسو دوپٹے سے صاف کر لئے۔

جیسے شریف آدمی نہیں ہوتے۔“ ہارون نے قدرے سخت اور تیز لہجے میں کہا تو وہ بری طرح سہم گئی۔

”واقعی وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ یہ غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔“ اُجالا نے سوچا۔

”آ..... آپ میڈم کو اس ادارے سے نکلوا سکتے ہیں؟“ اُجالا نے اپنی حالت پر قابو پا کر

پوچھا۔

”ہاں.....“ انہوں نے یقین سے کہا۔

”میں میڈم عذرا کو چھوڑوں گی نہیں۔“ اس نے پر عزم مگر انتقامی لہجے میں کہا۔

”اور مجھے.....“ ہارون فوراً ہی نرم پڑ گئے۔ شوخی سے بولے۔

”آپ کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔“

”میڈم عذرا پر تو تمہیں غصہ ہے کہ انہوں نے تمہاری قیمت وصول کی ہے۔ انہیں تو تم

اس کی سزا دلوانے کے لئے پکڑو گی اور مجھے اس لئے نہیں چھوڑو گی کہ تم مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہو..... کرتی ہوتا؟“ ہارون نے اس کی شرتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اتنے یقین سے کہا کہ وہ گڑبڑا گئی۔

اس کے پورے بدن میں اک آگ سی دوڑ گئی۔ ان کے قُرب کا احساس اسے ایک دم

سے نروس کر گیا۔ دل ان کی محبت میں دھڑک رہا تھا مگر نظریں چرا کر بولی۔

”جی نہیں..... خوش فہمی ہے آپ کی۔“

”تو کیا تم واپس دارالامان جانا چاہتی ہو؟“ ہارون کا چہرہ یکدم سر جھما گیا۔

”نہیں!“

”میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اپنی خوشی سے یا.....؟“

”نہیں!“ اس نے ان کی ادھوری بات فوراً مکمل کر دی۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں مجبور تو نہیں کروں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہیں بہت جلد

میری محبت کا یقین آجائے گا۔ میری نیت یک قسمی اس لئے مجھے تمہارے اس رویے نے بہت ہرٹ

کیا ہے۔ بھلا یہ رات بھی ایسی فضولیات کی نذر کرنے کی ہوتی ہے؟“ ہارون نے ڈک بھرے لہجے

میں کہا۔ ان کی ساری خوشی اس کے سر دروپیے نے ختم کر کے رکھ دی تھی۔

”چلو میں تمہاری سہمی، تم نے میری بات کا یقین تو کرنا نہیں ہے کیونکہ تم اس وقت غصے

”بے وقوف لڑکی حماقت تو تم اب کر رہی ہو۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے لئے کیا جذبات رکھتا ہوں، یہ تم میرے دل میں جھانک کر دیکھو تو تمہیں

معلوم ہو.....“

”پتا نہیں ای بابا کیوں چلے گئے مجھے اکیلا چھوڑ کر..... مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے

گئے؟“ وہ دکھی لہجے میں بولی تو ہارون نے شوخ لہجے میں کہا۔

”وہ تمہیں اپنے ساتھ اس لئے نہیں لے گئے کیونکہ انہیں میری تنہائی کا خیال تھا۔“

”کاش! میں بھی ان کے ساتھ مر گئی ہوتی۔“ اس نے بہت قوی اور حسرت بھرے لہجے

میں کہا۔

”اُجالا ایسی فضول باتیں مت کہو۔“ ہارون تڑپ کر بولے۔ ”خوش قسمت ہو تم کہ میڈم

نے تمہیں کسی اور کے حوالے نہیں کیا۔ میں میڈم عذرا کے خلاف انکوائری کروا رہا ہوں۔ بہت جلد وہ

اپنے انجام کو پہنچ جائے گی اور تمہارے بابا جان کا بتایا ہوا وہ ادارہ تمہاری سرپرستی میں چلے گا۔ میں

انشاء اللہ وہاں سے ساری کرپشن دور کر کے رہوں گا۔“

”کیوں آپ کو کیا پڑی ہے یہ نیکی کمانے کی؟“ اُجالا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”نیکی کمانا کسے برا لگتا ہے؟“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا، وہ خاموش رہی۔

”اور اُجالا تم صرف حسین ہو، ذہین بالکل نہیں ہو۔ میں نے ہی تمہاری ذہانت کے متعلق

بلند و بانگ اندازے لگائے تھے۔ ارے اگر تم ذرا سی بھی ذہین ہوتی تاں تو شادی سے پہلے مجھ سے

بات کر کے اس معاملے کو کیئر کرالیتیں یا اگر تمہیں مجھ سے اتنی ہی شدید نفرت ہو گئی تھی تو تم نے مجھ

سے شادی ہی نہ کی ہوتی۔ انکار کر دیا ہوتا اس شادی سے۔“

”میں ضرور انکار کر دیتی مگر مجھے نکاح کے بعد یہ سب معلوم ہوا تھا۔“ اس نے سنجیدگی

سے کہا۔

”اور غلط معلوم ہوا تھا۔“

”اُجالا!“ ہارون نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہی تھے کہ اس نے فوراً جھٹک دیئے

”مت ہاتھ لگائیں مجھے۔“

”کیوں نہ لگاؤں؟“ تم میری بیوی ہو اور اگر تم خود کو خریدی ہوئی لڑکی سمجھ رہی ہو تا تو

خریدی ہوئی لڑکی پر تو ہر طرح کا حق رکھتا ہے خریدار۔ میں اگر اتنا گھٹیا اور عیاش شخص ہوتا، تمہیں غلط

نیت سے یہاں لایا ہوتا تو لڑکی اب تک تمہارا سب کچھ لٹ چکا ہوتا۔ بیوپار کرنے والے میرے

میں ہو۔ لہذا اس موضوع پر میں تم سے صبح بات کروں گا۔“ ہارون نے آرام سے کہا۔  
 ”لیکن مجھے اب آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ اُجالا نے بے مروتی کی انتہا کر دی۔  
 ”تو آخر تم کرنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ ہارون کے جذبات کو مسلسل نظر انداز کر رہی تھی۔  
 انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں سونا چاہتی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”اچھی بات ہے، میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔ یہاں سے اٹھو اور بیڈ پر جا کر سو جاؤ۔ شاید تمہارے دماغ میں کوئی اچھی بات آجائے جو میرے پیار کو پہچان سکے۔ اُجالا میں نے تو اس پہلی ملاقات کے بعد تم سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ صرف اس لئے کہ میں نے تمام اظہار آج کے دن کے لئے، اس رات کے لئے سینت سینت کر رکھے تھے۔ میں اپنے جذبات کا اظہار آج اس سہاگ رات میں کرنا چاہتا تھا۔ مگر تم نے مجھے اتنے بڑے الزامات میں الجھا کر رکھ دیا ہے کہ..... خیر تم سو جاؤ..... شب بخیر۔“ ہارون نے کہا اور ڈرینگ روم میں چلے گئے۔

”پتا نہیں میں صحیح کر رہی ہوں یا غلط کر رہی ہوں۔“ وہ پریشانی سے سوچتی ہوئی بیڈ کی طرف آگئی۔ پھولوں کی لڑیوں کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا تو دل بے اختیار تڑپا اور ”ہارون ہارون“ کا ورد کرنے لگا۔ وہ اداس سی بیڈ پر لیٹ گئی۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا جہاں اب ہارون کے لئے کوئی نفرت یا غصہ نہیں تھا۔ ان کا دلکش چہرہ اسے اپنی ہنر آنکھوں کے پیچھے پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ پر، اپنے رویے پر پشیمان ہو رہی تھی۔ ہارون کی باتیں، ان کی نیک نیتی کی گواہ تھیں مگر اب تو وہ انہیں ہرٹ کر چکی تھی۔ ان کے پر خلوص جذبے کی، ان کی محبت کی توہین کر چکی تھی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا، یہ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں اور پھولوں کی جگہ سب کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ہارون نے کتنے شوق اور محبت سے یہ سچ سچائی ہوگی۔ کتنے ارمان ہوں گے ان کے دل میں مگر میں نے کیا کر دیا ان کے ساتھ..... زبیدہ تو اول درجے کی فتنہ پرواز لڑکی ہے اور میڈم عذرا لالچی اور خود غرض تھیں۔ یہ سب تو مجھے معلوم تھا مگر مجھ سے یہ غلطی کیسے کر سزد ہو گئی..... میں نے ہارون کی نیت اور محبت پر شک کیا ہے۔ انہیں کتنی تکلیف پہنچی ہوگی..... اُف خدایا میں کیا کروں؟“

”یہ کمبل اوڑھو اور سو جاؤ.....“ ہارون کی آواز پر وہ چونک گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا تھا کہ آخری الفاظ اس نے باواز کہے تھے۔ وہ اپنے اس باواز پر سوچ انداز پر حیران اور قدرے شرمندہ

سی ہو گئی۔ ہارون کمبل اس کے بیڈ پر رکھ کر خود صوفے پر جا لیٹے تھے۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ سردی ٹھیک ٹھاک پڑ رہی تھی۔ وہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نیند کی حسین وادیوں میں سیر کر رہی تھی۔ اسے نیند کو قابو کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ پریشانی میں بھی سونے کا ارادہ کرتی تھی اور تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد نیند کی حسین دیوی اس پر مہربان ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ جتنی زیادہ ڈسٹرب ہو رہی تھی، اتنی ہی جلدی نیند اس کی آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی۔

جبکہ ہارون صوفے سے اٹھ کر پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ چلتے چلتے ان کی نظر اُجالا کے چہرے پر پڑی تو وہ وہیں ٹھہر گئے۔ آسانی رنگ کے لباس میں اس کا چاند کی مانند چمکتا چہرہ بہت معصومیت لٹا رہا تھا اور ہارون کا دل بے طرح مچلنے لگا اسے بھونے کی تمنا کرنے لگا۔ وہ ان کی بیوی تھیں، انہیں پورا حق تھا۔ اس خیال سے وہ آگے بڑھے بھی لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنے دل میں مچلتے جذبات کو سختی سے دبا لیا اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے واپس صوفے پر آ بیٹھے۔ جب وہ بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے تو ان کا دل خوشی سے بھرا ہوا تھا، لیکن اُجالا کے انداز اور رویے نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ ان کی ساری وارھکیاں، ساری محبتیں جو اس پر شمار ہونے کے لئے بے چین تھیں، اپنے جذبات کا اظہار نہ پا کر تڑپ تڑپ کر مچل رہی تھیں۔ ہارون نے لائٹ آف نہیں کی تھی۔ وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئے۔

”اُجالا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ میں نے تمہیں کس قدر ٹوٹ کر چاہا ہے۔ تم نے یہ حسین رات اپنی غلط فہمی کی نذر کر دی ہے، لیکن میرا پیار سچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل تم خود چل کر میرے پاس آؤ گی اور اپنی محبت کا برملا اظہار کرو گی۔ اس محبت کا جواب بھی تمہیں مجھ سے ہے مگر یہ غلط فہمی تمہیں مجھ سے بدظن کر رہی ہے۔“

ہارون اپنے دل میں اس سے مخاطب تھے۔ اس کا چاندنی بکھیرتا چہرہ انہیں ایک ہل کو بھی چین سے نہیں لینے دے رہا تھا۔ نیند بھی ان سے روٹھ چکی تھی۔ رات کے آخری پہر سوچوں نے تھکا ڈالا تو ان کی آنکھ لگ گئی۔

اُجالا فجر کی اذان ہوتے ہی جاگ گئی۔ اس نے اپنے برابر میں دیکھا، بیڈ خالی تھا۔ وہ گہرا کر اٹھ بیٹھی اور کمبل ایک طرف رکھ کر بیڈ سے اتر آئی۔ ہارون کو صوفے پر بہت مشکل میں اور بغیر کسی گرم چادر، کمبل اور رضائی کے سوتے پایا تو اس کے دل میں ان کی محبت نے جوش مارا..... وہ اتنی سردی میں صوفے پر سو رہے تھے۔ اسے بہت افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے رویے کی وجہ سے ہی وہ بیڈ پر نہیں لیٹے اور سردی کی پرواہ کئے بغیر صوفے پر ہی جیسے تیسے لیٹ گئے۔ نجانے انہیں رات



بھر غینہ بھی آسکی ہوگی کہ نہیں۔

وہ دکھ اور پشیمانی سے سوچ رہی تھی اور پھر چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف نہ جا سکی بلکہ داشِ روم میں گھس گئی۔ وضو کر کے باہر آئی اور جب نماز ادا کرنے کے بعد آخر میں دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تو آنسو خود بخود آنکھوں سے بہنے لگے تھے، لب خاموش تھے اور وہ خدا سے اپنے رویے کی معافی مانگ رہی تھی۔ اس چار لاکھ والی بات پر صحیح بات جاننے کی دعا مانگ رہی تھی اور ہارون کی زندگی کی دعائیں خود بخود اس کے لبوں پر آتی جا رہی تھیں۔ دعا کے بعد وہ تسبیح کر رہی تھی اور ہارون جو چند منٹ پہلے جاگ گئے تھے، آنکھوں پر بازو رکھے، بازو کی اوٹ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ تسبیح سے فارغ ہو کر جائے نماز رکھ کر دوبارہ بیڈ کی طرف آئی تو اس کی نظریں بے اختیار صوفے پر لیٹے ہارون کی طرف اٹھ گئیں۔

اس کا دل خود بخود ان کی جانب کھنچا چلا رہا تھا۔ ان کی شخصیت بھی تو بہت سحر انگیز تھی۔ چہ فٹ لباقہ، سفید رنگت، سیاہ آنکھیں، سیاہ گھنے بال، گھنی مونچھوں تلے سرخی مائل ہونٹ، خوبصورت ناک، نقشہ سمیت وہ فوراً صنف مخالف کی توجہ حاصل کر لیتے تھے۔ مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ تھے وہ اور کوئی بھی لڑکی ان کی ہمسری کی تمنا کر سکتی تھی اور وہ کس قدر خوش نصیب تھی کہ اس شخص نے اس کی یعنی ”اُجالا“ کی تمنا کی تھی۔ اُجالا نے ہارون کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھوں کو مسلتی کبھی اگھویں کو مروڑنے لگتی۔

ہارون اس کی یہ کیفیت دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے اور بظاہر سوتے بنے ہوئے تھے۔

”اُف کیا کروں میں؟“ اُجالا نے غصے اور پریشانی کے عالم میں بالوں میں بندھا میسر بینڈ اتار کر بیڈ پر پھینک دیا، اس کے سیاہ ریشمی بال آزادی ملتے ہی خوشی سے اس کے شانوں پر لہرانے لگے۔

”ہائے کیا قیامت ادا! اے پیاری لڑکی! اب تو میرے قریب چلی آؤ۔“ ہارون نے اسے بازو کی لٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور یقیناً یہ ان کے دل کی بچی پکاری۔ جیسی تو وہ ان کی طرف بیڑہ رہی تھی۔ ہارون کے اندر خوشی کی مست لہر دوڑ گئی۔ اُجالا ان کے قریب پہنچی تو اس نے انہیں جگانے کی غرض سے ان کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور پھر نجانے کیا ہوا فوراً ہی ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ چند لمبے یونہی کھڑی رہی، انہیں سمجھتی رہی۔ پھر اپنے بیڈ کی طرف بیڑہ گئی اور کبیل اٹھا کر لے آئی اور ہارون کو پاؤں سے

لے کر بازوؤں تک کبیل اُڑھا دیا۔ ہارون کا دایاں بازو صوفے سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اُجالا کا رہٹ پر بیٹھ گئی اور آہستہ سے ان کا ہاتھ پکڑا اور صوفے پر ان کے پہلو میں رکھ دیا اور جونہی وہ جانے کے لئے مڑی اس کا نرم ملائم ہاتھ ہارون کے بڑے اور مضبوط ہاتھ میں تھا۔ وہ بری طرح گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی تو انہوں نے اپنا بازو آنکھوں پر سے ہٹا لیا اور اسے دیکھتے ہوئے بہت دھیمے اور شوخ لہجے میں بولے:

”اُجالا مجھے اس کبیل کی حرارت نہیں چاہئے مجھے تو تمہاری محبت کی حرارت چاہئے۔“

”آپ یوں کیوں لیٹے ہیں..... بیڈ پر لیٹ جائیں۔“ اُجالا نے نظریں چرا کر کہا۔

”اُجالا تم کیوں حقیقت سے نظریں پڑا رہی ہو؟“ ہارون نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”میں کوئی نظریں نہیں پڑا رہی۔“

”تو پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا تو

اس نے ان کی آنکھوں میں بمشکل تمام دیکھا اور بولی ”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”کیوں نہیں کرنی؟“ وہ بے قراری سے بولے۔ ”کیا اس غلط فہمی کی سزا تمام عمر دوگی

مجھے؟“

”تمام عمر کے لئے تو آپ نے مجھے قید کر لیا ہے۔“ وہ کانپتی آواز میں بولی۔

”رہائی چاہتی ہو؟“ ہارون سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”نہیں!“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

”اُجالا جب دل کی بات کو زبان نہ دی جائے تو یہ آنسو دل کا حال بتانے لگتے ہیں۔ تم

اپنے دل سے پوچھو کہ وہ کیوں اس وقت تمہیں میری طرف آنے پر مجبور کر رہا تھا۔ تم نے مجھے سردی

میں لینا دیکھ کر اپنا کبیل مجھے کیوں اوڑھ لیا، رات کی شدید نفرت میں یہ خیال کا ادا کیسے جل اٹھا؟

پوچھو تو اپنے دل سے“ ہارون نے اس کے بالوں کو نرمی سے شانوں سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا تو

اس نے ایک آنسو برساتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

اس کا دل چاہا کہ وہ ان کے سینے سے لگ کر خوب روئے، لیکن اتنی جرأت، اتنی بے باکی

اس میں اس مضبوط بندھن کے قائم ہو جانے کے باوجود پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر وہاں

سے اٹھ گئی اور بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

ہارون ایک سرد اور درد بھری آہ بھر کر رہ گئے۔

اُجالا کی سسکیاں انہیں بہت دکھ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں تھم تھم گئیں تو

اس نے اپنے اس ہاتھ کو بغور دیکھا جسے ہارون نے اپنے ہاتھ میں تھاما تھا۔ اسے اپنے ہاتھ پر، اپنی ذات پر شک آنے لگا اور اس نے اپنا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا اور اسے رخسار کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔

☆☆☆

”ہارون بیٹا تمہارا دوست ساجد آیا ہے۔“ آمنہ بی نے آکر اطلاع دی۔

”اچھا انا بی! آپ ایسا کیجئے چائے ڈرائنگ روم میں ہی بیجوا دیجئے۔ میں آتا ہوں

ابھی۔“ ہارون نے نیٹکین سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا بیٹا! آمنہ بی پولیس اور ہارون کمرے سے باہر نکل گئے۔ آمنہ بی کے جانے کے

بعد وہ بھی ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب چلی آئی۔ دراصل وہ سننا چاہتی تھی کہ ہارون چار

لاکھ روپے والے معاملے کا ساجد سے کن الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ کا بھید جاننا چاہتی

تھی۔ دل کو تو ہارون کی بے گناہی کا یقین آ گیا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے کانوں سے سن کر تسلی کرنا چاہتی

تھی تاکہ میڈم عذرا سے صاف صاف بات کر سکے۔

لابی میں کھڑی بظاہر پھولوں کو چھیڑ رہی تھی مگر اس کے کان ہارون اور ساجد کی باتوں کی

طرف گئے تھے۔ اسے ان کی آوازیں واضح سنائی دے رہی تھیں۔

”اور سناؤ پیارے رات کیسی گزری؟“ ساجد نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر شوفی سے

پوچھا۔

”بس یار گزری گئی۔“ ہارون نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

”ہیں کیا مطلب گزری گئی؟“ ساجد نے حیرت سے ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کل تو تم بہت خوش تھے۔ میں نے اپنی اور تمہاری اس دوستی کے چند سالوں میں کبھی تمہیں اتنا

خوش نہیں دیکھا تھا، جتنا تم اُجالا بھابی سے شادی کر کے خوش دکھائی دے رہے تھے اور اس وقت تو

تمہاری صورت دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے تمہاری خوشی جھین لی ہو۔ آخر ہوا کیا ہے؟

کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔“

”چھوڑو یار.....“ ہارون نے اپنے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”ساجد یار وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اُسے میڈم عذرا سے چار لاکھ روپے میں خریدا ہے۔“

ہارون نے دھکی لہجے میں کہا۔

”لاحول ولا قوۃ۔“ ساجد نے فوراً کہا۔

”تو یار تو نے اُجالا بھابی کو بتایا نہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے اور یہ کہ تو ان سے سچ بچ

محبت کرتا ہے۔ چار لاکھ تو تو نے ادارے کے لئے دیئے تھے۔ میڈم عذرا نے اُجالا بھابی کے

بدلے کی بات تو محض اپنے لالچ کے سبب کہی تھی۔ تیرا ارادہ تو چار لاکھ والی بات سے پہلے ہی اُجالا

بھابی سے شادی کا بن گیا تھا اور تو نے میڈم عذرا سے کہہ بھی دیا تھا۔ لڑکی کو خریدنے کا کام تو تو کیا

تیرے فرشتے بھی نہیں کر سکتے۔ کرنا تو بہت دور کی بات ہے وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تو ایسا

بالکل نہیں ہے۔“

”یار میں نے بتایا تھا اے..... مگر وہ نہیں مانتی۔“ ہارون نے افسردگی سے بتایا۔

”اُجالا بھابی کو اپنے رشتے داروں سے بھی تو بہت دکھ ملے ہیں۔ شاید وہ اس وجہ سے تم

سے بھی بدظن ہو گئی ہوں۔ ان کا اعتبار اٹھ گیا ہو محبت پر سے۔“ ساجد نے قیاس لگایا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ہارون دُکھی لہجے میں بولے۔ ”مگر یار اس میں میرا تو

کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے تو دل سے اس کی تمنا کی تھی۔ بڑے خلوص سے اسے اپنایا تھا، میری

محبت میں نہ کوئی کھوٹ تھا نہ غرض نہ ہوں۔ میں نے تو پوری سچائی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ پھر یہ کیا

ہوا کہ وہ مجھ سے بدگمان ہو گئی ہے..... اور تو تو اچھی طرح جانتا ہے ساجد کہ میں نے آج تک کسی

لڑکی میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اُجالا کو دیکھا، اسے چاہا اور شادی کر لی..... تو یہ ناقدری کیوں ہوئی

میرے جذبوں کی۔ یار میں نے تو کبھی کسی پر شک نہیں کیا۔ تو پھر میرے جذبے کی صداقت پر یہ

شک، یہ بے اعتباری کیوں؟“

”ہارون اگر تو کہے تو میں اُجالا بھابی سے بات کروں۔“ ساجد نے انہیں افسردہ دیکھ کر

فکر مند اور دوستانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں یار وہ میرا یقین نہیں کر رہی تو تیرا یقین کیسے کرے گی۔ آخر تو بھی تو میرا ہی

دوست ہے۔“ ہارون نے اداس سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر کہا۔

”اچھا یہ بتا کہ اُجالا بھابی کے تایا، بچا کے خلاف قانونی چارہ جوئی کب تک کرنے کا

ارادہ ہے؟“ ساجد نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”یار پہلے یہ مسئلہ تو حل ہو جائے بعد میں تایا، چاچا کو بھی دیکھ لیں گے۔ میں تو اُجالا کو

اس کا حق دلوانا چاہتا ہوں اور میڈم عذرا کی جگہ کوئی ایماندار خاتون اس ادارے میں تعینات کرانا

چاہتا ہوں بلکہ اگر اُجالا خود اس ادارے کا چارج سنبھالنا چاہے تو بھی میں اس کی پوری مدد کروں گا۔

یہ ادارہ یقیناً اُجالا کے نام ہوگا۔ اُجالا کے بابا نے بنوایا تھا، اُجالا کو اتنا حق تو حاصل ہے اس ادارے

سے متعلق۔“ ہارون نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”تو اب کیا ارادے ہیں؟ ولیمہ بھی کرنا ہے کہ نہیں؟“ ساجد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہ معاملہ سیٹ ہو جائے گا تو ولیمہ بھی ہو جائے گا۔“ ہارون نے چائے کا سپ لے کر کہا۔

”اوکے پھر میں تو چلوں۔ مجھے اخبار کا کچھ کام بھی ہے۔“ ساجد نے کھڑے ہو کر کہا اور

باہر نکل گیا۔

اُجالا بھی وہاں سے سیدھی بیڈ روم میں آگئی اور میڈم عذرا کے تختے میں دیئے ہوئے

کرسٹل کے گلدان پیکٹ میں سے نکال کر دیکھنے لگی۔

”بہت اچھے ہیں یہ گلدان!“ ہارون کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ اُسے گلدانوں کو

دیکھتا پایا تو قریب آ کر بولے تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”آپ انہیں باہر پھینکوا دیں۔ مجھے نہیں رکھنے یہ گلدان۔“ اُجالا نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں نہیں رکھتے، یہ تو میڈم عذرا نے تمہیں تحفے میں دیئے ہیں۔“

”اسی لئے تو نہیں رکھتے۔“ اُجالا نے غصے سے کہا اور گلدان ڈسٹ بن میں ڈال دیئے۔

ہارون نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے۔

”بہت قیمتی تھے یہ گلدان۔“

”آپ مجھے دارالامان چھوڑ آئیں۔“ وہ ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں دوبارہ اس منافق اور لالچی عورت کے زیر سایہ رہنے کے لئے نہیں سمجھوں گا۔“

”نہ ہی تمہیں یہ حماقت کرنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر تم اپنی سہیلیوں سے ملنے کے لئے

اچھا ہتی ہو تو میں بخوشی تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔ مگر آج نہیں۔ تم آرام کرو، کل لے جاؤں گا۔“

ہارون نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا اور خود تیار ہونے کے لئے

ریٹنگ روم میں چلے گئے۔

شرمندگی سے اُجالا کی آنکھیں پھٹک گئیں۔ وہ بیڈ پر آٹیشی اور مٹھولوں کی لڑیوں کو پکڑ کر

دوں کے گرد لیٹنے اور کونے لگی۔ اس کا دل ہارون کی عظمت اور نیک نیتی کا قائل ہو گیا تھا۔ ساجد

ہونے والی ان کی گونگوں نے ساری حقیقت اس پر واضح کر دی تھی۔ وہ بہت نادم تھی۔ وہ اس کا

تذکرہ خیال رکھ رہے تھے اور وہ تھی کہ ان پر شک کرتی رہی تھی۔ اسے بہت افسوس تھا کہ اس نے

جاکو ہرٹ کیا تھا۔

”ہارون آپ بچے ہیں، مجھے یقین تھا، یقین ہے۔ ذرا سی بے وقوفی نے آپ کا دل دکھایا

میں، محبت اور تم

ہے۔ میں کس طرح معافی مانگوں آپ سے؟ آپ نے مجھ جیسی لاوارث لڑکی کو سہارا دیا، اپنا نام

دیا۔ گھر دیا، عزت اور محبت کے قابل سمجھا مجھے اور میں نے آپ کو دیکھی کر دیا۔ میں ایسی احمق تو نہیں

تھی۔ میں کیوں آگئی زبیدہ کی باتوں میں..... جبکہ مجھے زبیدہ اور میڈم کی عادتوں کا بخوبی علم تھا.....

لیکن شاید مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میڈم عذرا میری شادی پیسے وصول کر کے بھی کر سکتی ہیں۔“ اُجالا

نے دل میں کہا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ دارالامان کی ایک لڑکی جسے سب نائلہ باجی کہتے تھے، ان کی شادی

بھی اچانک ہی ہو گئی تھی اور جب نکاح ہو گیا تھا تو ان کے دولہا نے میڈم عذرا کو ایک بھاری سا

سفید لفافہ دیا تھا۔

”وہ لفافہ یقیناً رقم کا تھا۔ تو میڈم عذرا نے باجی نائلہ کو بھی بیچا تھا۔ اولو.....“ اُجالا جوں

جوں سوچتی جا رہی تھی، اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ایک کچی سی اس کے پورے

بدن پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

”باجی نائلہ تو بہت خوبصورت تھیں اور ان کا دولہا ان سے عمر میں 25 برس بڑا تھا۔ ایک

بچیس سالہ خوبصورت لڑکی کی شادی ایک پچاس سالہ بوڑھے سے کر دی تھی میڈم نے اور باجی نائلہ

شادی کے بعد صرف ایک بار دارالامان آئی تھیں اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔ اس کے بعد کسی کو

ان کی خبر نہیں ملی کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، ان کے ساتھ کیا ہوا، اب وہ کسی ہیں؟ میرے

بابا جان نے بے سہارا لڑکیوں کو امان دینے کی خاطر یہ ادارہ بنایا تھا۔ ان کے بعد اس ادارے کا

نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا میڈم عذرا نے۔“ وہ خوف اور صدمے سے غڑغڑا رہی تھی۔

اُجالا بہت دیر تک سوچتی رہی تھی، جب بیدار ہوئی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ اس نے

وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی اور دوبارہ بیڈ پر آٹیشی۔ ہارون جو صوفے پر ہی سو گئے تھے، ان کی بھی

آنکھ کھل گئی۔

”طبیعت کیسی ہے تمہاری؟“ ہارون نے بیڈ کے قریب آ کر نرمی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”کڈ! اب ایسا کرو کہ ڈانٹک روم میں جاؤ، انا بی سے کھانا لگوانے کا بولو۔ اتنی دیر میں

میں بھی فریش ہو کر آتا ہوں۔“

ہارون یہ کہہ کر واش روم میں چلے گئے لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔

”میں ہارون سے معافی کس طرح مانگوں؟“ اُجالا نے پریشانی سے سوچا۔



”میں نے انہیں قریب آنے اور ہاتھ لگانے سے منع کر دیا تھا اور وہ کتنے اچھے ہیں کہ انہوں نے میرے ساتھ زبردستی نہیں کی..... اور حد یہ کہ بیڈ پر نہیں سوئے، صوفے پر جا سوئے۔ کتنا بے آرام اور پریشان کر دیا ہے میں نے انہیں، آف اب میں کیا کروں؟“

”تم ڈانٹتے ہو میں کیوں نہیں گئیں؟“ ہارون واش روم سے باہر نکلے تو اسے اسی جگہ بیٹھا دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ ڈانٹتے ہو کون کہاں ہے؟“ اس نے سادگی اور معصومیت سے جواب دیا۔  
”تم اب اس گھر کی مالکین ہو اور تمہیں اپنے گھر کے بارے میں سب کچھ معلوم ہونا چاہئے۔ چلو آؤ میں تمہیں تمہارا گھر دکھاتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔“ ہارون نے اپنا تھکا ہوا سر ہلکے سے ہلکے میں کیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔  
”مگر مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے اور میں نے دوپہر بھی تمہاری وجہ سے کھانا نہیں کھایا تھا کہ اکٹھے کھائیں گے۔“

”آپ اکیلے ہی کھا لیجئے۔“ اُجالا نے شرمندہ ہو کر کہا۔  
”اُجالا ڈیرا تم نے میری روح کی پیاس نہیں بجھائی، مزید بڑھادی ہے، لیکن کم از کم میرے خالی پیٹ کا تو کچھ خیال کر لو جو بھوک سے احتجاج کر رہا ہے۔ اسے تو بھوکا مت مارو۔ خالی پیٹ رہنے سے سردرد الگ سزا کے طور پر ہو رہا ہے۔“ ہارون نے ہلکے پھلکے شوخ انداز میں کہا۔

”چلیں!“ اُجالا نے شرمندگی سے ان کی طرف دیکھا۔  
”تھیک یو!“ ہارون خوشی سے مسکرا دیئے۔

☆☆☆

صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہارون آفس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھیں کن اکیوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ، سیاہ چٹون میں وہ بے حد اسٹارٹ دکھائی دے رہے تھے۔ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ٹائی کی ٹاٹ باندھ رہے تھے مگر ان کی نظریں اسی پر تھیں جو انہیں چوری چوری پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ٹائی باندھ چکنے کے بعد وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے بھی اس کی نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہے تھے۔ آخر بول ہی پڑے۔

پھر نہ کیجئے گا میری شوخ نگاہی کا گد  
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا ہے مجھے

اور اُجالا تو مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی۔ اسے ہارون کی باریک بین اور گہری نظروں کا قطعاً اندازہ نہ تھا۔ ہارون نے برش رکھ کر کوٹ پہننے ہوئے اس کے قریب آ کر کہا۔ ”میں تمہارا شوہر ہوں، تمہیں مجھ پر پورا حق حاصل ہے۔ تم مجھے براؤ راست بھی دیکھ سکتی ہو۔ بھلا مجھے چور نظروں سے کیوں دیکھنے لگیں تم؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے آپ کو چور نظروں سے دیکھنے کی۔“ وہ شپٹا کر بولی۔  
”محبت ایسی ضرورتیں خود بخود پیدا کر دیتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔  
”آپ مجھے دارالامان چھوڑتے جائیں گے۔ مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنا ہے۔“ اُجالا نے یہ بات کہہ کر ان کی ساری خوشی پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

”ٹھیک ہے چلو.....“ وہ کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بولے تو وہ اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت آمنہ بی دروازے پر دستک دے کر اجازت ملنے پر اندر داخل ہوئیں۔ وہ ناشتے کے برتن لینے آئی تھیں۔

”انا بی ہم باہر جا رہے ہیں۔ اُجالا کو ان کی سہیلیوں سے ملوانا ہے۔“ ہارون نے انہیں بتایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن کیا اس حلیے میں جائے گی دلہن.....“ آمنہ بی نے اُجالا کو سادہ سے گرم سوٹ میں لمبوس دیکھ کر کہا تو وہ حیران ہو کر ہارون کو دیکھنے لگی، وہ مسکرا دیئے۔  
”ارے میاں ایک دو دن کی دلہن ہے اور پہلی بار اپنے میکے جا رہی ہے۔ وہ بھی اس حلیے میں..... لگ ہی نہیں رہا کہ یہ نئی لوبلی دلہن ہے..... اور یہ کیا دلہن نے تو انگوٹھی بھی نہیں پہنی ہوئی.....“ آمنہ کی نظر اُجالا کی خالی انگلیوں پر پڑی تو مزید حیران ہو کر کہا۔ ہارون سر کھاتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ آمنہ بی نے پکارا۔

”بیٹا وہ انگوٹھی کہاں ہے؟“  
”کون سی انگوٹھی؟“ وہ انجان بنے۔

”آئے ہائے بیٹا ہارون کیا ہو گیا ہے تمہیں..... میں اس انگوٹھی کا پوچھ رہی ہوں جو تم نے اُجالا بیٹی کو روٹھائی میں دینے کے لئے بڑے شوق سے خریدی تھی۔“

”انا بی مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ تھکا ہوا آیا تھا آتے ہی کپڑے تبدیل کر کے سو گیا تھا۔“ ہارون نے اُجالا کو شرمندگی سے بچانے کی خاطر فوراً بہانہ بنا دیا اور اُجالا نے انہیں محبت اور تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔

”چلو ابھی پہناؤ اور دلہن چلو تم..... میں تمہیں کپڑے نکال کر دوں۔ بھلا دو دن کی دلہن ایسا لباس پہنا کرتی ہے۔“ اب آمنہ بی اُجالا کی طرف متوجہ تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں اس لباس میں۔“ اُجالا نے مدھم آواز میں کہا۔

”ارے کیا خاک ٹھیک ہو..... چلو ڈریسنگ روم میں۔“ آمنہ بی نے پیار سے ڈانٹ کر کہا تو اس نے مدد طلب نظروں سے ہارون کی طرف دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”چلی جاؤ کیونکہ یہ اپنی ملکیت منوائے بغیر تمہاری جان نہیں چھوڑیں گی۔“

”اور اگلی پہنا دینا دلہن کو..... میں دیکھوں گی آکر۔“ آمنہ بی نے انہیں حکم صادر کیا اور اُجالا کا ہاتھ پکڑ کر اسے ڈریسنگ روم میں لے آئیں اور وارڈروب میں سے اس کے لئے سبز رنگ کا آرگنزا کا کام والا لباس نکالا اور ساتھ ہی ہلکا سا سونے کا جیولری سیٹ بھی نکال دیا اور فوراً پہن لینے کا آرڈر جاری کر کے چلی گئیں۔ کچھ دیر تو وہ وارڈروب میں لٹکے قیمتی اور خوبصورت ملبوسات کو دیکھتی رہی پھر جلدی سے کپڑے تبدیل کئے، جیولری سیٹ پہنا، میچنگ شوپینے، بالوں کو خوبصورت اسٹائل میں سیٹ کیا۔ پرفیوم چھڑکا، مناسب میک اپ کرنے کے بعد آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا تو وہ حیران رہ گئی۔

اتنے لباس، ہلکے میک اپ اور تھوڑی سی تیاری سے وہ کس قدر حسین لگ رہی تھیں۔ وہ کمرے میں آئی تو ہارون جو اس کے انتظار میں کمرے میں ٹہل رہے تھے، اسے دیکھ کر رک گئے اور اس کے بے تحاشا حسین سراپے میں کھوسے گئے۔ وہ، خود بخود حیا سے نظریں جھکا گئی۔ ہارون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس سے اپنے چمچے، لپکتے جذبات کا بے باکانہ اظہار کر سکتے۔ وہ چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔ اُجالا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”یہ اگلی پہن لو ورنہ اتنا بی میری جان بخشی نہیں کریں گی۔“

اُجالا نے جھپکتے ہوئے آہستہ سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ہارون نے اس کا گدا گدا نرم ملائم ہاتھ پکڑا اور بائیں ہاتھ کی غزلی انگلی میں سونے کی ہیرے جڑی نیس اگلی پہنا دی اور اس کے ہنسی سے رچے ہاتھ کو بہت چاہ سے دیکھا اور آہستہ سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے چھوڑ دیا۔ انہیں اُجالا کی طرف سے اپنی محبت کا اعتبار چاہئے تھے۔ اس کے بعد وہ اس سے اپنی بے قرار یوں، بے تابیاں اور وارفتگیوں کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت دونوں ایک دوسرے کے لمس کی حدت اور مہک میں خود کو گم ہوتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ وہ اس وقت بھی خاموش تھے اور

دارالامان کی طرف رواں دواں تھے۔

”میں شام کو واپسی پر تمہیں پک کر لوں گا۔ اگر تم ایک دو دن کے لئے یہاں رہنا چاہو

تو.....“

”نہیں آپ مجھے ایک گھنٹے بعد آکر لے جائے گا۔“ اُجالا نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ تو

ہارون نے بہت حیرت سے اُس کے چہرے کو دیکھا۔ ”ایک گھنٹے بعد“

”جی ایک گھنٹے بعد.....“ وہ کہہ کر گاڑی سے باہر اتر گئی اور جب تک وہ دارالامان کے

گیٹ سے اندر داخل نہیں ہو گئی، ہارون حیرت سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔

اُجالا سیدھی بلیس کے کمرے میں پہنچی تو وہ بھاگ کر خوشی سے اس سے پٹ مٹی۔ باقی

لڑکیاں اور سہیلیاں بھی اس سے ملنے چلی آئیں۔ سب نے اسے دیکھ کر خوشی اور محبت کا اظہار کیا۔

میڈم عذرا اور ان کی نائب میڈم خالدہ نے بھی خوشی کا مظاہرہ کیا۔

”آج تو ادھر ہی رہو گی نا۔“ راحیل نے پوچھا۔

”نہیں وہ تھوڑی دیر بعد مجھے لینے آ جائیں گے۔“ اُجالا نے شرمکیں لہجے میں بتایا۔

”ہائے دیکھا کیسی بے وفائی ہے یہ.....“ بلیس اس کی کمر میں دھپ لگا کر بولی۔ ”تو

میں نے صحیح اندازہ لگایا نا کہ دولہا بھائی تجھے اپنی نظروں سے دور نہیں رکھنا چاہتے۔“

”ہاں! یہ خوش نصیبی ہے میری۔“ اُجالا نے فخر و شکر اور انبساط بھرے لہجے میں کہا۔

”ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم، شاد آباد رکھے۔“ انجم

نے دل سے کہا، اور اُجالا نے دل سے آمین کہا تھا۔

”اُجالا تیرے میاں نے تو میڈم اور ہم سب کے مزے کرا دیئے ہیں۔ پورے ادارے

کی نئے سرے سے مرمت ہو رہی ہے۔ قلعی کی جارہی ہے اور ہمیں کتابیں، کپڑے، کبل، بستروں

کی چادریں وغیرہ بھی اور بھجوائی ہیں تمہارے ہارون صاحب نے۔ سچ بھی بہت ہی نیک دل اور

خدا ترس آدمی ہیں ہارون بھائی۔ ان کے طفیل اس ادارے کی صورت بھی دھل کر نئی ہو جائے

گی۔“ بلیس نے مسکراتے ہوئے بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔ یہ بات اس کے لئے کسی انکشاف سے کم

نہیں تھی۔

”اور یہ اگلی بھی ہارون بھائی نے دی ہے نا۔“ انجم نے اس کا ہاتھ تھام کر اگلی دیکھتے

ہوئے کہا۔

”ہاں! وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی۔“

”بہت نفیس ہے، خدا مبارک کرے۔“ انجم اور بقیس نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔  
ان سب سے ملنے کے بعد وہ میڈم عذرا کے آفس میں آگئی۔ وہ رجسٹر کھولے بیٹھی تھیں۔  
اسے دیکھ کر رجسٹر بند کر دیا اور اسے مسکرا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میڈم عذرا براؤن اور بلیک رنگ کی ساڑھی میں شانوں پر براؤن رنگ کی قیمتی گرم شال  
پھیلائے خاصی بادقار دکھائی دے رہی تھیں۔ ظاہری شان و شوکت تو ان کے پہناوے سے ہی عیاں  
ہو جاتی تھی۔

”کیا بیوگی چائے منگواؤں تمہارے لئے؟“ میڈم عذرا نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں میڈم شکریہ! دراصل میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔“  
”ہاں ہاں پوچھو!“ میڈم عذرا نے مسکراتے ہوئے اجازت دی۔  
”میڈم کیا آپ نے ہارون سے میری شادی کے عوض چار لاکھ روپے لئے ہیں؟“  
”ہاں لئے ہیں!“ میڈم عذرا نے بلا تامل اقرار کیا۔  
”کیوں؟“

”کیونکہ ہم نے تمہاری تعلیم، لباس، خوراک پر سینکڑوں روپے خرچ کئے ہیں اور اگر  
قسمت سے اچھی آسائی ہاتھ آجائے تو اس سے تم جیسی خوبصورت لڑکیوں کی قیمت وصول کرنے  
میں کیا برائی ہے؟ ہمیں بھی تو اپنی ذمہ داری نبھانے کا، تم لوگوں کی دیکھ بھال کرنے کا کچھ صلہ ملنا  
چاہئے نا.....“ میڈم عذرا نے بے حسی سے کہا۔

”میڈم یہ دارالامان ہے۔ یہاں آپ کا پیسہ خرچ نہیں ہوتا۔ صاحب حیثیت لوگ اس  
ادارے کو عطیات دیتے ہیں اور انہیں عطیات سے اس ادارے کے اخراجات پورے ہوتے رہے  
ہیں ہمیشہ۔ آپ کو صرف اس ادارے کا نگران مقرر کیا تھا میرے مرحوم بابا نے اور یقیناً بہت نیک  
دل خاتون سمجھ کر بابا نے آپ کو یہ ذمہ داری سونپی ہوگی مگر آپ نے میرے بابا کے یقین اور اعتماد کا  
خون کیا ہے۔ آپ تو بہت ہی لاپرواہی اور خود غرض عورت ثابت ہوئی ہیں۔ مجبور، بے بس اور بے سہارا  
لڑکیوں کا بیوہ پار کرتی رہی ہیں آپ اب تک.....“

”اُجالا بند کرو یہ بکواس۔“ اس کے سخت اور تلخ جملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ غصے  
سے بولی۔

”آپ اپنا یہ گھٹیا کاروبار کیوں نہیں بند کر دیتیں؟“ اُجالا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”آپ  
نے میری بھی قیمت لگائی، ہم۔ لڑکیاں آپ کو بہت ہمدرد اور شفیق اور اچھی خاتون سمجھتی رہی ہیں

آج تک..... ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ مار آتیں ہیں۔ آپ اس حد تک گر سکتی ہیں دولت کے  
حصول کا نشہ آپ کو اتنا بے حس بھی کر سکتا ہے کہ آپ اپنی بیٹیوں کی عمروں کی لڑکیوں کو پیسے کی خاطر  
شادی کے نام پر بیچ کر خوش ہوں گی۔“

”سنو اُجالا بی بی! ہمیں تو ایسے ہی لڑکے چاہئیں جو اس ادارے کو چندہ بھی دیں اور  
ہماری جیب کا بھی خیال رکھیں۔ تم غصہ کرنے کی بجائے دُعائیں دو مجھے کہ میں نے ہارون ملک جیسے  
دولت مند، خوبصورت اور تعلیم یافتہ شخص سے تمہاری شادی کرا دی ہے۔ ساری زندگی عیش کرو گی  
تم۔ چار لاکھ رقم ہارون ملک کے نزدیک چار آنے کے برابر ہے۔ اب دیکھ لو سارے ادارے کی  
قابلِ مرمت جگہوں کی مرمت کروا رہا ہے، سفیدی کروا رہا ہے۔ وہ اپنے پیسے سے اور لڑکیوں کی  
ضرورت کی تقریباً سبھی چیزیں اس نے خرید کر بھجوائی ہیں۔ عمارت بھی چند ہفتوں میں پھر سے نئی گور  
ہو جائے گی اور لڑکیوں کی ضروریات کی اشیاء کا مسئلہ بھی کم از کم دو سال تک ختم ہی سمجھو اور رہ گئے وہ  
چار لاکھ تو میں اس ادارے کو چلاتی ہوں۔ لڑکیوں کی حفاظت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ بہت بڑی  
اور اہم ذمہ داری ہے۔ اس پر میرا اتنا تو حق بنتا ہے کہ میں ہارون ملک کو اپنے ادارے کی حسین  
ترین لڑکی پیش کرنے پر اس سے کچھ انعام وصول کرتی۔ وہ بے چارہ تو تم پر ایسا لٹو ہوا تھا کہ اگر میں  
اس سے تمہارے بدلے میں چودہ لاکھ بھی مانگ لیتی تو وہ چودہ لاکھ ہی میری ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ ہارون  
ملک کے پاس تو قارون کا خزانہ ہے۔“ میڈم عذرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”لیکن اگر مجھے آپ کی اس گھٹیا سوچ کا پہلے علم ہو جاتا تو میں ہارون ملک سے ہرگز  
شادی نہ کرتی۔“ اُجالا نے غصے سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہارون ملک سے نہ کرتیں شادی تو میں تمہارے لئے کوئی اور امیر زادہ تلاش کر لیتی۔  
میں نے تمہیں اس آفس میں آنے جانے کی کھلی چھٹی بھی اسی مقصد کے تحت دے رکھی تھی تاکہ کسی  
امیر زادے کی نظر عنایت تم پر پڑے اور وہ تم سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کرے۔ سو میں  
اپنے منصوبے میں کامیاب رہی..... اگر ہارون ملک نہ آتا تو کوئی اور بوڑھا امیر شخص میں نے  
ڈھونڈنا تو تھا ہی تمہارے لئے..... کیونکہ بوڑھے امیر زادے جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو حاصل  
کرنے کے لئے اپنا پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ میں نے تو بہت کم مانگے تھے صرف چار لاکھ۔“  
میڈم عذرا نے بے نیازی سے کہا۔ انہیں اپنے قول و فعل کی بد صورتی پر ذرا برابر بھی شرمندگی یا پشیمانی  
نہ تھی۔ جس سے اُجالا کا خون کھول رہا تھا۔

”اور چار لاکھ سے کہیں زیادہ رقم ہارون اس ادارے کی مرمت اور قلعی کرانے میں صرف کر



”ہاں!“ ہارون نے اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔  
”کیوں؟“

”کیوں جناب! کیا ہمیں نیکی کمانے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ ہارون نے دنگ اسکرین پر نظری جمائے محتاط انداز میں ڈرائیو کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔  
”یہ کیسٹ میڈم عذرا سے ہونے والی میری گفتگو پر مبنی ہے۔ اس میں ان کے اعتراف ہیں جو انہوں نے غلط کام کرنے پر بہت فخر سے بیان کئے ہیں۔“ اُجالا نے اپنے پرس میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکالا اور کیسٹ نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے بتایا۔  
”تم کیا میڈم عذرا کا انتظار پوکے گئی تھیں؟“ ہارون نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں لیکن میں نے ان سے وہ سب باتیں کہلوائی ہیں جو انہیں قانون سے سزا دلوانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔“ اُجالا نے بھینجیگی سے بتایا۔

”گڈ..... تمہیں تو جاسوسہ ہونا چاہئے تھا۔ سیکرٹ سروس بھی موزوں تھا یا ساجد کی طرح جرنلسٹ ہو تھیں تم تو بہت ترقی کرتی، بہت نام کماتیں۔“  
ہارون نے بہت ستائشی اور محبت بھرے لہجے میں کہا تو اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا دماغ ہارون کے متعلق ہی سوچنے لگا۔  
اپنے رویے کا اس کو بہت رنج، ملال تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

”لڑکیاں تو جہیز لے کر ڈولہا کے گھر جاتی ہیں اور میڈم عذرا نے میرے بدلے میں پیسے وصول کر لئے۔ مجھے ہارون نے جہیز نہ لانے یا لاوارث ہونے کا ایک بار بھی طعنہ نہیں کیا۔ نہ ہی کچھ جتایا۔ کیا تھا میرے پاس، چند کاشن کے جوڑے جو میں دارالامان میں ہی چھوڑ آئی تھی اور جو ساتھ لائی تھی، وہ ہارون کے بیچے ہوئے تھے۔ میرے شادی کے جوڑے سے لے کر اب تک کے تمام لمبوسات ہارون نے خریدے۔ حتیٰ کہ میرے پاؤں میں پہنا ہوا جوتا اور سر پر اوڑھا ہوا دوپٹہ تک ہارون کا دیا ہوا ہے۔ میں سوائے اپنے وجود کے کچھ بھی تو نہیں لائی تھی اپنے ساتھ۔ ہارون کی دی ہوئی ہر چیز میرے بدن کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ انہوں نے میری سابقہ رہائش دارالامان کو بہتر بنانے کا انتظام کیا ہے، مجھے میرا حق دلوانا چاہئے ہیں۔ مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا ہارون نے اور میں دے بھی کیا سکتی ہوں انہیں۔ ہارون نے تو صدقِ دل سے مجھے چاہا، مجھ سے شادی کر کے مجھے عزت دی اور میں نے اُن کی پُر غلوں محبت پر شک کیا۔ ان کا دل دکھایا، کچھ اور نہیں تو..... محبت تو تھی تا مجھے ان سے، مگر میں وہ محبت بھی انہیں نہ دے سکی۔ جس محبت کے لئے ہارون نے بہت محبت

رہے ہیں۔ آپ نے تو بہت اچھا سودا کیا ہے میڈم!“ اُجالا نے بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔  
”ہاں تو اور کیا..... بے چارہ بہت ہی ہمدرد اور رحم دل شخص ہے ہارون ملک۔ اس کی دریا دلی کی بدولت ادارہ بھی چمکتا دکھائی دینے لگا ہے۔ کسی کو یہ پوچھنے کی جرأت بھی نہیں ہوگی کہ اتنے فنڈز آئے تو گئے کہاں؟ فنڈز کہاں خرچ ہوئے، یہ ادارے کی بیک بنک خود بتائے گی۔ ہارون بڑا ہی نیک آدمی ہے۔ اس نے یہ نیکی کر کے میرے سارے خدشے اور مسئلے دور، بلکہ ختم کر دیئے ہیں۔ تم بھی قدر کرو اس کی۔ اب تو تم عیش کرو گی۔ دولت میں کھیلو گی۔“ میڈم عذرا بہت ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولیں تو اُجالا نے اپنا پرس اٹھایا اور خود بھی کھڑی ہوئی اور ان کے چہرے کو دیکھتی ہوئے پر اعتماد لہجے میں بولی۔

”لیکن میڈم میری بھی ایک بات آپ یاد رکھئے گا۔ اب میں آپ کو معصوم لڑکیوں کے حسن سے، ان کے مستقبل سے مزید کھیلنے کا موقع نہیں دوں گی۔“  
”اُجالا بی بی! اپنے کام سے کام رکھو۔“ میڈم عذرا نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں اگر تمہیں ایک شریف آدمی کے گھر بسا سکتی ہوں اُجاڑ بھی سکتی ہوں اور پھر تم اُجڑنے کے بعد اسی اپنے ابا کے دارالامان میں امان ڈھونڈتی نظر آؤ گی۔ اس لئے تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ اب تم ادھر کا رُخ مت کرنا ورنہ.....“

”ورنہ کا نشانہ آپ خود ہی بنیں گی میڈم۔ خدا حافظ!“ اُجالا نے ان کی بات کاٹ کر کہا اور تیزی سے ان کے آفس سے باہر نکل گئی۔  
”ہونہہ..... یہ کل کی چھوکری مجھے سبق سکھائے گی احق۔“ میڈم عذرا نے غصے اور طنز سے کہا۔

”چوکیدار باہر سرخ رنگ کی کار آئے تو مجھے بتا دینا۔“ اُجالا نے گیٹ کے پاس پہنچ کر چوکیدار سے کہا۔

”جی بہتر میں ابھی دیکھتا ہوں۔ ابھی ایک کار آئی تو تھی۔“ چوکیدار یہ کہتے ہوئے گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ گیٹ کی اوٹ میں ہو کر اُجالا نے باہر دیکھا۔ ہارون گاڑی لئے موجود تھے۔ وہ دوپٹہ سر پر ٹھیک سے اوڑھ کر باہر نکل گئی۔ ہارون نے اسے آتا دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ ان کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھے ہی ہارون نے گاڑی اشارت کر دیا۔

”دارالامان میں رعیت (مرمت) اور وائٹ واش کا کام آپ کروا رہے ہیں؟“ اُجالا نے

سے مجھے اپنایا، میں انہیں وہ محبت بھی نہ دے سکی۔ کتنی بے حس ہو گئی تھی میں، اچانک ٹھک کی آغوش چلی تھی اور اس نے ہارون کا محبت بھرا دل ہلا کے رکھ دیا۔“

”ہیلو ہیلو۔۔۔“ ہارون نے اس آنکھوں کے سامنے چنگی بجاتے ہوئے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ رہے تھے اور اس کی آنکھیں اور زیادہ حسین ہو گئی تھیں۔ بھنگی مہری آنکھوں نے جہاں ہارون کو دکھی کیا، وہاں وہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگے تھے۔ کیسا سحر تھا ان شریقی آنکھوں میں، بے خود کر دینے والا سحر۔

”بہت مشکل ہے فوج لکھنا۔ میرا خیال ہے کہ تم گاڑی سے اتر ہی جاؤ۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گاڑی ہارون والا میں آ کر رکی تھی اور اُجالا اپنی سوچوں میں اس قدر مگن تھی کہ جان ہی نہ سکی۔ ہارون نے دوسری جانب آ کر اس کی طرف والا گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور چھوٹے چھوٹے، تھکے تھکے قدم اٹھاتی لان میں چلی آئی۔ جہاں سنہری دھوپ اپنی ہتھیلیاں بچھائے ہوئے تھی۔ ہارون بھی گاڑی لاک کر کے ادھر ہی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں اس کی دی ہوئی کیسٹ بھی تھی۔

”یہ اسٹیر پوتمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ ہارون نے پوچھا۔

”یہ بہت پہلے میری نويس برتھ ڈے پر بابا جان نے مجھے تحفے میں دیا تھا اور کہانیوں کی کیسٹیں بھی ساتھ دی تھیں۔ بابا کی یہی ایک نشانی میرے پاس بچی تھی جو میں نے چھپالی تھی۔ یہاں آتے ہوئے میں اپنے ساتھ لائی تھی۔“ اُجالا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اور آج تم نے اس سے کارنامہ انجام دے ڈالا۔ اب تو کوئی مشکل نہیں ہوگی میڈم کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے میں۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ اُجالا نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں لگاتے ہوئے کہا۔

”تو کرو تا۔۔۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔“ ہارون نے بڑے دلنشین اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”بات یہ ہے کہ میں آپ سے۔۔۔“ اُجالا بات کرتے کرتے ان کی شوخ و شریر اور دلفریب مسکراہٹ سے بوکھلا کر خاموش ہو گئی۔ کب محسوس کی تھیں اس نے ایسی نظریں، ایسے شوخ، شریر محبت بھرے لہجے، یہ والہانہ پن، یہ محبت و چاہت بھرا انداز اور اظہار۔ وہ بہت نروس ہو رہی تھی

اُن سے جبکہ ہارون اس کی کیفیت سے محفوظ ہوتے ہوئے اسی اپنائیت بھرے لہجے میں بولے۔  
”ارے کہو تا۔۔۔ تم تو بہت بہادر لگی تھیں مجھے پہلی ملاقات میں۔ اب اس قدر گھبرا کیوں جاتی ہو تم مجھ سے بات کرتے ہوئے۔“

”کیا آپ نہیں جانتے؟“

”میں نے پہلے بھی جو جانا تھا وہ پیار کی بجائے غصے اور نفرت کا اظہار لکھا۔ اس لئے اب میں کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ کہنا نہیں چاہتا۔“ ہارون کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اپنے رویے پر شرمندہ ہو گئی۔

”ہارون میں آپ سے۔۔۔“ وہ لفظ ڈھونڈ رہی تھی۔ زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ عجیب مشکل آن پڑی تھی کہ اب جبکہ وہ ان سے معافی مانگنا چاہ رہی تھی تو عمر بھر کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ جیسے آج ہی اس پر حملہ آور ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکی۔

”دل تو چاہ رہا ہے کہ تم مجھے پکارتی رہو اور میں سنتا رہوں مگر خیر چلتا ہوں۔“ ہارون نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بے اختیار پوچھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”ہے ایک ضروری کام!“ ہارون اس کی بے اختیاری پر خوشی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

”واپس کب آئیں گے؟“ اُجالا کو اپنی کیفیت چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔ بے ساختہ دوسرا سوال پوچھا اور ہارون کے لبوں پر گہری دلفریب مسکراہٹ دیکھ کر شرمندہ ہو گئی اور نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ ”آئی ایم سوری۔“

”اُجالا تم میری بیوی ہو اور تمہیں پورا حق ہے کہ تم مجھ سے پوچھو کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں جا رہا ہوں اور واپس کب لوٹوں گا؟“ ہارون نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ وہ خاموش رہی تو انہیں نے نرمی سے کہا۔ ”تم اندر جا کر آرام کرو اور اطمینان سے سوچو کہ تمہیں مجھ سے کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا ہے۔ میں واپس آؤں گا تو تم سے پوچھ لوں گا، ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں ٹیک کبیر۔“

ہارون اپنی گاڑی میں آفس جانے والی سڑک پر گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے اندر ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری رقص کر رہی تھی۔ انہیں اُجالا کی ادھوری باتوں میں اس کی ان سے معافی اور محبت کا اظہار اچھا محسوس ہوا تھا۔ اُجالا نے میڈم عذرا سے گفتگو والی کیسٹ انہیں اسی لئے

دی تھی کہ اُسے اُن پر اعتبار آگیا تھا۔ اُس کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی کیونکہ میڈم عنذرا کی اصلیت کھل کر اُس پر آشکار ہو گئی تھی۔ اُجالا کا شرابا، گھبرایا، کچھ کہتا چہرہ انہیں روح تک سرشار کر رہا تھا۔ مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ کر دم توڑ رہی تھی۔ ان کا دل چاہا کہ ساری کائنات کو اپنی اس خوشی میں شریک کر لیں مگر شاید ابھی ان کی مسلسل اور مستقل خوشی کا وقت نہیں آیا تھا۔

یہ خوشی عارضی تھی، ابھی انہیں ایک اور امتحان کا سامنا تھا، وہ پرہجوم سڑک پر کارڈرائیو کر رہے تھے۔ اچانک ہی ایک تیز رفتار ٹیکسی ان کی گاڑی کے سامنے آگئی۔ انہوں نے جلدی سے اسٹیرنگ گھما کر گاڑی سائیڈ سے نکالنے کی کوشش کی لیکن ٹیکسی ڈرائیو تو کرب و کھانے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ اس نے ان کی گاڑی سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ ہارون نے گاڑی کو اس کی زد میں آنے سے بچانے کے لئے تیزی سے اسٹیرنگ گھمایا۔ راستہ صاف ہونے کی امید میں دیکھا تو سامنے سائیکل سوار آگیا۔ اسے اب اپنی گاڑی کی زد میں آنے سے بچانے کے لئے جو انہوں نے کوشش کی تو اس تیز رفتاری اور غیر متوقع صورت حال میں گاڑی سڑک سے اتر گئی اور وہاں لگے کھجے سے ٹکرا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جھٹکے کی آواز پیدا ہوئی۔ ان کی گاڑی کا ونڈا اسکرین کا شیشہ زوردار جھٹکا لگنے سے ٹوٹ گیا اور ڈرائیو گئی سیٹ کا دروازہ بھی جھٹکے سے کھل جانے کی وجہ سے ہارون کھجے سے جا ٹکرائے اور ان کا دایاں بازو ٹوٹ گیا۔ سر سے خون کا فوراہ اُبل پڑا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے کہ لوگ جمع ہو گئے اور انہیں ان ہی کی گاڑی میں ڈال کر ایک شخص قریبی ہسپتال لے گیا اور ان کے بتائے ہوئے نمبر پر ساجد کو ان کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی۔ ساجد خبر ملتے ہی ہسپتال پہنچ گیا، وہ بہت پریشان تھا۔

ہارون کے سر پر پٹی باندھی جا چکی تھی اور ڈاکٹر امجد نے ان کے بازو کی ہڈی صحیح جگہ سیٹ کر کے پلستر چڑھا دیا تھا۔ ساجد ڈاکٹر امجد سے ہارون کی حالت اور رپورٹس کے بارے میں تفصیلی بات چیت کرنے پر راضی ہو کر روم میں آگئے۔ ہارون بیڈ پر سو رہے تھے شاید۔

”ہارون..... ہارون! ادھر دیکھ۔“ ساجد نے ان کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے انہیں پکارا۔

”اُجالا نہیں آئی؟“ ہارون نے سو۔ سروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں..... تم کہو تو میں ابھی اُجالا بھابی کو فون کر کے بلوالوں۔“

”نہیں یار رہنے دے، اُسے میرے ایکسیڈنٹ کے متعلق کچھ نہ بتانا ورنہ وہ پریشان ہو جائے گی۔“ ہارون نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اچھا جیسے تیری مرضی۔“ ساجد نے کندھے اچکا کر کہا۔

ساجد نے گاڑی ہارون ولا کے گیراج میں بند کروادی۔ اُجالا اندر تھی، اُسے بھٹک تک نہ پڑی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ ساجد نے آمنہ بی کوراز داری سے ہارون کے ایکسیڈنٹ کا بتا دیا۔ آمنہ بی تو ماں جیسا پیار کرتی تھیں۔ ان سے یہ خبر سن کر بے حد پریشان اور بے قرار ہوئیں اور ان کے لئے پریشانی کھانا پکایا اور گلوچا چا کے ہاتھ ہسپتال بھجوا دیا۔ ہارون کی دیکھ بھال کے لئے ساجد اور گلوچا چا دن رات ہسپتال میں رہے۔

ادھر اُجالا تمام رات بے چینی اور پریشانی کے عالم میں ہارون کا انتظار کرتی رہی۔ طرح طرح کے اندیشے، دوسے اور خیالات اسے پریشان کرتے رہے۔ نیند بھی نہ آسکی اور صبح فجر کی نماز میں اس نے دل کی گہرائیوں سے ہارون کی سلامتی کی دعا مانگی۔

”ہارون ولا“ کے تمام ملازمین کو ہارون کے ایکسیڈنٹ کا علم ہو چکا تھا اور وہ باری باری ہسپتال جا کر ہارون کی خیریت بھی پوچھتے رہے تھے۔ ہارون کے لئے سوپ اور بخنی کبھی ساجد اور ثوبیہ اپنے گھر سے بنا کر لے جاتے اور کبھی آمنہ بی ہارون کے کھانے کے ساتھ بنا کر خود لے جاتیں۔ تین دن گزر گئے، اُجالا نے یہ تین دن بہت پریشانی میں گزارے۔ دل ہارون کے لئے تڑپ تڑپ کر پاگل ہو گیا۔ وہ کسی سے کچھ پوچھ بھی نہ سکی۔ اس خیال سے کہ گھر کے ملازمین کیا کہیں گے کہ بیوی ہو کر اسے یہ تک معلوم نہیں کہ اس کا شوہر کہاں گیا ہے اور کس حال میں ہے؟ تین دن اور تین راتیں اس نے روتے، تڑپتے اور ہارون کو یاد کرتے کرتے گزاری تھیں۔ آمنہ بی اور گلوچا چا سے پوچھا تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کرنا چاہا کہ ہارون ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد چلے گئے ہیں اور وہ تو اکثر دفتر سے اسلام آباد چلے جایا کرتے تھے۔ شادی سے پہلے بھی۔

”وہ فون تو کر سکتے تھے مجھے.....“ اُجالا نے دل میں کہا۔ اسے آمنہ بی اور گلوچا چا کی باتوں پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے دل کا معاملہ جو تھا۔ اس کا تو کھانا پینا، سونا جانا حرام ہو چکا تھا۔ آمنہ بی نے بمشکل اپنے سامنے بٹھا کر چند نوالے کھلائے تھے اسے۔ وہ خود کو قصور وار سمجھ رہی تھی۔ ہارون اس سے ناراض نہیں تھے مگر اس کا یہی خیال تھا، وہ ضرور اس سے بہت ناراض ہیں۔ اسی لئے بغیر بتائے اسلام آباد چلے گئے۔

”آج چوتھا دن تھا۔ اُجالا نے ساجد اور ثوبیہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا اور تیار ہو کر باہر نکلی تو اس کی نظر ہارون کی سرخ مرغلہ پر پڑی جسے گلوچا چا ڈرائیو کرتے ہوئے گیٹ کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی کار تک پہنچی تو گلوچا چا گاڑی روک کر گاڑی سے باہر نکل آئے۔ اُجالا نے



ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا "چاچا ہارون کہاں ہیں؟"

"وہ تو اسلام آباد سے ابھی نہیں آئے۔" گلو چاچا نے جھوٹ بولا۔

"تو ان کی گاڑی کیسے آگئی ان سے پہلے..... اور..... اومائی گاڈ!" اُجالا کی نظر گاڑی کی ٹوٹ پھوٹ پر پڑی تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔

"چاچا یہ کیا ہے..... یہ کیسے ہوا، ہارون کہاں ہیں؟ بتائیے چاچا!" وہ دیوانگی کی حد تک پریشان ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"ڈیپن بی بی! ہارون صاحب جس دن آپ کو چھوڑ کر گئے تھے، اسی دن آفس جاتے ہوئے راستے میں ان کا ایکسڈنٹ ہو گیا تھا۔" گلو چاچا کو تاجراج بتاتا ہی پڑا۔

"کیا..... آ....." اُجالا کو یوں لگا جیسے اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے کر مٹل دیا ہو۔

"تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔ کیوں ٹھپایا آپ لوگوں نے مجھ سے؟"

"ہارون صاحب نے ہمیں منع کیا تھا ڈیپن بی بی....." گلو چاچا نے بتایا۔

"انہیں زیادہ چوٹیں تو نہیں لگیں....." اُجالا نے پریشانی سے کہا۔ "گاڑی کا تو حشر بین

گیا ہے۔"

"ہارون کا کیا حال ہے چاچا؟"

"ہارون صاحب کے دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ان کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔ بہت

خون بہہ گیا تھا ان کا لیکن وہ بہتر ہیں۔" گلو چاچا کے اس انکشاف نے تو اس کے دل پر پتھر یاں

چلا دیں۔

"آپ مجھے فوراً ہسپتال ہارون کے پاس لے چلیں۔" اُجالا نے دوسری کار کی طرف

بڑھتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر....." گلو چاچا نے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اس کے پیچھے سیٹ پر

بیٹھے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

"ہارون کے بازو میں فریکچر ہو گیا وہ میرے خدا یا! انہیں کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی اور

اس وقت نجانے وہ کیسا محسوس کر رہے ہوں گے اور میرے بارے میں نامعلوم انہوں نے کیا سوچا

ہوگا؟" وہ پریشانی سے سوچ رہی تھی۔ اس حادثے کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا

رہا تھا۔

ساجد کی نظر دروازے میں کھڑی اُجالا پر پڑی تو ایک لمحے کو اس کا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ارے اُجالا بھابی آپ دروازے میں کیوں کھڑی ہیں؟ اندر آ۔ بیٹے نا!"

ہارون نے بے اختیار گردن گھما کر بائیں جانب دروازے کی طرف دیکھا۔ اُجالا نے

پرہل اور بلیک کلر کا گرم سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سادہ سے لباس میں چہرے پر اداسی، پریشانی اور پشیمانی

کے تاثرات سجائے وہ ہارون کو دیکھتی، ان کے بیڈ کے قریب چلی آئی۔ ہارون نے بس اس کی

صورت کو نکلے جا رہے تھے۔ اُجالا نے ان کے بازو پر چڑھا پلستر اور سر پر بندھی پٹی دیکھی تو اس کی

پکلیں بھیگ گئیں۔ ان کے چہرے سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا کتنا خون بہا ہوگا اور وہ کتنی

تکلیف سے گزر رہے ہوں گے۔

"آہم....." ساجد نے کھٹک کر گھا صاف کرتے ہوئے انہیں اپنی موجودگی کا احساس

دلانا چاہا تو وہ دونوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔

ساجد نے بڑی رازداری سے اس کے قریب آکر آہستہ سے کہا۔ "بھابی جان! آپ کے

دل میں ہارون کے لئے جس بھی قسم کے جذبات موجود ہیں، ان کا برملا اظہار کر دیجئے، اچھا موقع

ہے۔ گنڈلک ٹویو۔"

"ساجد کون کہاں جا رہا ہے؟" ساجد دروازے کی طرف بڑھا تو ہارون نے پوچھا۔

"میں ڈاکٹر صاحب سے تمہارا حساب بقیات کرنے جا رہا ہوں۔ تم بھابی کی ناراضگی دور

کرو۔ بائے۔" ساجد یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا اور موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے دروازہ

اچھی طرح بند کر دیا تھا اس نے۔ اب وہ دونوں کمرے میں تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے سے

بات کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔

"کیسے ہیں آپ؟" اُجالا نے ہی پہل کرتے ہوئے پوچھا۔

"جہیں کیسا لگتا ہوں میں؟" ہارون نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

وہ ندوس تو ہوئی مگر فوراً ہی سنبھل بھی گئی اور اپنی تمام ہمت جمع کر کے بولی۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ مجھے کیسے لگتے ہیں؟"

"ہاں شاید!" وہ خوش دلی سے مسکرائے۔ "اور تم کیسی ہو؟"

"کیسی ہو سکتی ہوں؟" اُجالا نے لرزتی آواز میں ان ہی سے پوچھا۔ "آپ نے گھر کے

تمام ملازمین کو اپنے ایکسڈنٹ کا بتا دیا اور مجھے بتانا گوارا نہیں کیا۔ کیا رشتہ ہے میرا اور آپ کا؟ کس

رشتے سے آپ مجھے اپنے گھر لائے تھے؟"

”تم بیوی ہو میری اور محبت سے میں نے تمہیں اپنایا تھا۔“ ہارون اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”اسی لئے آپ نے مجھے اپنی تکلیف سے بے خبر رکھا۔ گھر کے ملازموں کو تو بتا دیا لیکن بیوی کو نہیں بتایا۔ کیا اتنی ہی اہمیت تھی آپ کی نظر میں میری کہ اتنے مضبوط رشتے کے ہوتے ہوئے آپ نے مجھے اس حادثے کی اطلاع تک نہیں دی؟“

”تمہیں مجھ سے نفرت جو تھی۔“ وہ لا جواب ہو کر یہی کہہ سکے۔

”آپ کو تو مجھ سے محبت تھی نا!“ اُجالا نے بھینکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ”آپ تو مجھے بتا سکتے تھے۔“

”ہاں! مگر جو لوگ کسی سے محبت کرتے ہیں وہ اسے دکھ کی پریشانی کی خبر تو نہیں سنایا کرتے نا!“ ہارون نے اپنی صفائی میں دلیل پیش کی۔

”جی نہیں!“ اُجالا نے ان کی بات کو یکسر مسترد کر دیا اور بولی۔ ”جو لوگ کسی سے محبت کرتے ہیں وہ اس سے اپنے غم، اپنی خوشیاں اور اپنی زندگی کے تکلیف دہ لمحے سب شیئر کرتے ہیں، لیکن آپ نے تو مجھے اپنی تکلیف کے لمحوں میں شامل کرنے کے قابل سمجھا ہی نہیں۔“

”ایسا نہیں ہے اُجالا!“ ہارون بے قرار ہو کر بولے۔

”تو کیسا ہے؟“ وہ رو دینے کو تھی۔

”اُجالا میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ ہارون نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے

”تو آپ کے خیال میں یہ تین دن میں نے خوشی اور سکون سے گزارے ہیں آپ کے

”اُجالا۔۔۔۔۔“ ہارون کو اپنی ساحت پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ خوشی کے شادیانے ان کے من

من میں بجتے لگے تھے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی نرم و نازک کلائی تھام لی۔

”بیٹھ جاؤ!“ ہارون نے محبت سے کہا۔

وہ ان کے قریب بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ وہ پہلی بار ان کے اس قدر قریب بیٹھی تھی۔ ہارون

بہت کی حدت اسے اپنے پونے بدن میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ تین دن میں کیا انقلاب آ گیا ہے اُجالا ڈیر۔“ ہارون نے اس کی جھکی بھیگی پلکوں کو

دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا حالانکہ جانتے تھے اس کے دل کا حال۔

”ہارون مجھے وقتی طور پر چند گھنٹوں کے لئے آپ پر غصہ آیا تھا۔ غلط فہمی ہو گئی تھی اور وہ غلط فہمی دور بھی ہو گئی تھی۔“ اس نے بھرائی آواز میں بتایا۔

”تو تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں تھا؟“

”کہنا تو چاہ رہی تھی۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ ہارون آپ تو جانتے تھے۔“

”جانتا تھا لیکن خود اپنی زبان سے کیسے کہہ دیتا؟ تم نے جس گھٹیا کاروبار کا آدمی سمجھ لیا تھا، جیسے الزامات مجھ پر عائد کر دیئے تھے، اس کے بعد میں ایسی کوئی بات اور وہ بھی تمہارے دل کی بات کیسے کہہ دیتا تم سے۔۔۔۔۔ اپنے دل کی بات تو تمہیں ہی مجھ سے کہنی چاہئے تھی۔“

”ہاں! تو اب کہہ تو رہی ہوں۔“ وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ ہارون کو اس کی معصومیت پر پیار آنے لگا۔

”یہی کہ مجھے آپ سے نفرت نہ اب ہے نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ آپ میری وہ غلطی معاف کر دیجئے۔“ اُجالا نے شرمندگی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو ان کا دل موسم کی طرح پگھل گیا۔ مگر اسے ستانے کے لئے بولے۔

”تم نے اتنے بُرے الفاظ میرے لئے استعمال کئے۔ میری نیت اور محبت پر شک کیا۔ شادی کی پہلی رات تم نے جو سلوک میرے ساتھ کیا، تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے معاف کر دوں گا؟“

”پلیز۔۔۔۔۔!“ اُجالا نے اُن کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ کر لپٹی لہجے میں کہا۔ ”ان کو تو اپنے دھڑکتے دل پر اس کے نرم ملائم ہاتھ کی موجودگی کے احساس نے دیوانہ بنا دیا اور وہ مسرور ہو کر بولے۔

”چلو معاف کیا۔۔۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔“

”بہت پیاری لگ رہی ہو تم مجھے یوں مناتی ہوئی، دل چاہ رہا ہے کہ میں تم سے ناراض ہی رہوں اور تم مجھے اسی طرح منانے کی کوشش کرتی رہو۔“ ہارون نے اس کے چاندنی لگاتے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی نظر حیا کے بوجھ سے خود بخود جھک گئی۔ چہرے پر شفق کی شرمیلی پھیل گئی۔ ہارون نے بہت دالہا نہ پن سے اسے دیکھا کتنے ہی لمحے خاموش گزر گئے۔

”گھر چلیں۔۔۔۔۔“ اُجالا نے پلکیں اٹھا کر ان کے چہرے کو دیکھا۔

”کون سے گھر؟“ ہارون نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔

”اپنے گھر!“ اُجالا نے شرمیلی آواز میں کہا تو وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر نرم لہجے میں بولے۔

اور محبت سے بھرے دل میں  
 اُجالا پھیل جاتا ہے  
 دلوں میں قرب کی خواہش چلتی ہے  
 محبت کی حسین دیوی وقابن کے نکتی ہے  
 لبوں سے معذرت کے لفظ نکھرتے ہیں  
 محبت کرنے والوں کے حسین چہرے نکھرتے ہیں  
 پھر، غلط فہمی کی نادانی، پلکوں کو بھگوتی ہے  
 محبت اپنے دامن میں سارے اشک سموتی ہے  
 خوشی سے مسکراتی ہے  
 اسے دل سے لگاتی ہے  
 اور ہنس کر یہ سمجھاتی ہے  
 ارے پگی کیوں روتی ہے؟  
 محبت یوں بھی ہوتی ہے!



”چلتے ہیں مگر گھر جانے سے پہلے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ آئندہ تم کبھی بھی ان چار لاکھ کا ذکر نہیں کرو گی۔ میری محبت پر شک نہیں کرو گی۔“  
 ”نہیں کروں گی۔“ اُجالا نے جلدی سے کہا۔ ”کبھی نہیں کروں گی، کچھ بھی نہیں کروں گی۔“

”ارے ارے اب ایسا غضب بھی مت کرنا۔“ ہارون نے اس کی جلد بازی اور معصومیت پر مسکراتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”کم از کم محبت تو کرنا تم مجھ سے۔“  
 ”وہ تو کروں گی ہی.....“ اُجالا نے بے ساختہ کہا اور پھر خود ہی اپنی بے اختیاری پر شرمائی۔ ہارون خوش دلی سے ہنس پڑے۔ مھول ہی مھول اُن کے چار سو مہک اٹھے۔ انہوں نے محبت سے پوچھا۔

”اپنی اس بات پر قائم رہو گی نا؟“  
 ”ہاں!“ اُجالا نے حجاب آمیز لہجے میں کہا تو ہارون کی خوشی اور دیوانگی دیدنی تھی۔ دل خوشی سے تاج رہا تھا۔ انہیں اپنی ساری تکلیف بھول گئی تھی اور وہ خوشی سے اس کے بالوں کو چھینرتے ہوئے بولے۔

”اُجالا ڈیئر یہ ایک سیڈنٹ میرے لئے بہت..... مبارک ثابت ہوا ہے۔“  
 ”ہارون.....!“ اُجالا نے ایک دم تڑپ کر ان کے چہرے کو دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ ان کے رخسار پر نرمی سے پھیرا تو اس کی آنکھوں نے جو ضبط کے بند باندھ رکھے تھے، وہ ٹوٹ گئے۔ آنسو اس کی شریقی آنکھوں سے ٹپکے اور اس کے رخساروں پر پھیل گئے اور وہ ہارون کی تکلیف کے احساس سے تڑپ کر ان کے گداز بازو میں اپنا چہرہ چھپا کر مٹھوٹ مٹھوٹ کر رونے لگی.....!  
 ”محبت سے بھرے دل کو غلط فہمی جب ہوتی ہے

دلوں میں شک ہوتی ہے

روح کو تڑپاتی ہے

دوری جان جلاتی ہے

وفا کب یاد آتی ہے؟

پھر اچانک

کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، محبت کا یقین بن کر انہیں لمحوں میں آتا ہے۔

غلط فہمی مٹاتا ہے



”آپ میری توہین کر رہی ہیں۔“ وشال نے تھلا کر کہا لیکن لہجہ نرم تھا بدستور۔  
 ”حیرت ہے آپ کو اپنی توہین بھی محسوس ہوتی ہے۔“ سبھین نے باقاعدہ آنکھیں پھیلا کر اُسے حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ شامین نے اُسے غصے سے گھورا۔  
 ”کیا سمجھتی ہیں آپ اپنے آپ کو؟“ اب کی بار وشال کو بھی غصہ آ گیا۔  
 ”وہی جو میں ہوں یعنی حسین اور ذہین لڑکی..... ہے نا!“ وہ بڑی ادا سے بولی۔  
 ”جی نہیں..... آپ دراصل ایک مغرور اور خود پسند لڑکی ہیں۔“ وہ سگلتے لہجے میں بولا۔  
 ”ارے واہ آپ تو پورے سیاست دان لکھے چند لمحوں میں اپنا بیان بدل لیا۔ اپنی زبان سے پھر گئے۔ ارے آپ یونیورسٹی میں کیا کر رہے ہیں سیاست میں جائیں، الیکشن لڑیں اور اسمبلی میں کرسی پکڑیں وہاں آپ جیسا کھوٹا سکہ بھی چل جائے گا۔“ سبھین نے اس کی بے عزتی کی اور بد اخلاقی کی حد کر دی۔

”مس سبھین میں اس سے زیادہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ غصے سے بولا۔  
 ”یہ آپ کے ”عام مرد“ ہونے کا ثبوت ہے۔ اپنی باؤ اب آپ جائیں کیونکہ آپ میرا خاصا وقت برباد کر چکے ہیں۔“ سبھین نے بے نیازی سے کہا۔  
 ”میں آپ کی زندگی برباد کر سکتا ہوں۔“ وشال نے اُسے خوفزدہ کرنا چاہا۔  
 ”ایسا کہہ کر آپ نے اپنے متعلق میری رائے پر تعذیق کی مہر ثبت کر دی ہے۔“ سبھین نے اطمینان سے سٹی ٹیچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وشال بھائی، آپ پلیز مائنڈ مت کیجئے گا اچکچو ملی آج سبھین کی طبیعت کچھ خراب ہے اس کے نوٹس بھی کم ہو گئے ہیں اس لئے یہ غصے میں آکر اول فول بکے جا رہی ہے پلیز آپ مائنڈ مت کیجئے۔“ شامین نے بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے بہانہ بنایا تو وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”شامین آپ اپنی دوست کی بہت اچھی وکیل ہیں۔ میں تو آپ کے کہنے سے مائنڈ نہیں کروں گا لیکن آپ بھی اپنی دوست کا مائنڈ میرے متعلق کلیئر کر دیجئے کیونکہ اس حسین چہرے پر یہ بدگمانی اور بد اخلاقی کچھ سوٹ نہیں کر رہی اوکے بائے۔“ وشال جاتے جاتے سبھین کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈال کر گیا تھا سبھین لمحے بھر کو شیشائی مگر فوراً سنبھل بھی گئی۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں یہ سب بکواس کرنے کی جانتی ہو وشال احمد ایک مل اور اور انڈسٹریلسٹ کا بیٹا ہے اور وہ بھی اکلوتا۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک مرد ہے اور کوئی بھی مرد کسی لڑکی

## محبت ہے ہمارے پاس

”آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟“ وشال احمد نے اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب چاہا۔

”کیوں؟“ سبھین نے کڑے تیوروں سے اُسے دیکھا تھا۔  
 ”کیونکہ مجھے آپ جیسی حسین اور ذہین لڑکیوں سے دوستی کرنے کا شوق ہے۔“  
 صاف جواب آیا تھا سبھین کو اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی لہذا آپ کر بولی۔  
 ”تو آپ کو یہ سن کر شاک لگے گا کہ مجھے آپ جیسے لڑکوں سے دوستی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”کیوں مس سبھین مجھ میں کیا کمی ہے؟“  
 ”یہ تو آپ ہی جانتیں کہ آپ میں کیا کمی ہے؟“ سبھین نے رکھائی سے جواب دیا۔  
 ”دیکھیے!“

”اب آپ اتنے بھی حسین نہیں ہیں کہ میں آپ کو ہی دیکھتی رہوں۔“ سبھین نے وشال کی بات کاٹ کر کہا تو اس کے برابر میں کھڑی شامین نے اُسے کہنی ماری۔ وہ اُس کی اس حد تک پہنچی ہوئی صاف گوئی سے سخت ٹالاں تھی۔

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھ رہیں۔“ وشال نے بڑے ضبط سے کہا۔

”کیونکہ میں آپ کا مطلب سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔“

”آخر کیوں؟ باقی لڑکوں سے تو آپ فرشتگی بات کر لیتی ہیں؟“

”بات کرنے اور بات بڑھانے میں بہت فرق ہوتا ہے مسٹر وشال احمد۔“

ظاہرہ بیگم کے دو بچے تھے ندیم اور شامین، نعیم کے تین بچے تھے فرحین، نعیم اور سبھین۔ فرحین کی شادی تین سال پہلے ندیم سے ہوئی تھی اس کا ایک بیٹا تھا جب کہ شامین کی منگنی نعیم سے ہو چکی تھی اور اس کے استحقاقات کے بعد اس کی شادی کا پروگرام تھا۔ سبھین کے لئے خاندان سے رشتے تو کئی آرہے تھے مگر اس نے استحقاقات سے فارغ ہونے تک اپنی شادی کے معاملے کو التواء میں رکھنے کی تاکید دی تھی سو سب نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ارادہ بڑوں کا یہی تھا کہ سبھین اور نعیم کی شادی اکٹھی کی جائے۔ سبھین اور شامین چونکہ بچپن سے ساتھ رہی تھیں۔ دو کینال کے بڑے بچکے میں وہ سب اکٹھے رہتے تھے۔ آپس میں پیار بھی بہت تھا۔ شامین اور سبھین کی آپس میں بہت دوستی تھی سکول، کالج اور اب یونیورسٹی میں بھی وہ دونوں ساتھ تھیں اور دونوں ایم۔ سی۔ ایس کر رہی تھیں اب تو فاصل بھی ختم ہونے والا تھا۔

اسامہ کریم نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ نعیم اور عظیم نے اس شادی کی مخالفت کی تھی۔ سراج، اسامہ کے یونیورسٹی فیلو تھے اچھے شریف اور متول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب اُن کا رشتہ آیا تو اسامہ کی رضامندی اپنے کزن کے رشتے کی بجائے سراج کے رشتے کے لئے تھی۔ جبکہ عظیم اور نعیم کو اسامہ کے لئے اپنے کزن زاہد پسند تھے۔ وہ اپنی ضد پراڑ گئے اور اسامہ نے سراج کے سوا کسی اور شخص کو اپنی زندگی میں شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کریم اور کلثوم بیگم کو سراج میں کوئی کمی نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ وہ ان کے خاندان کے نہیں تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسامہ کی دوستی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سراج کا رشتہ قبول کر لیا اور یوں اسامہ کی شادی سراج سے ہو گئی۔ اسامہ کی شادی کے چار سال بعد تک کریم اور کلثوم زندہ رہے۔ اسامہ کا میکے آنا جانا ان کی زندگی تک ہی رہا۔ کیونکہ دونوں بھائی بظاہر ان سے سلام دعا کر لیتے تھے مگر دل سے اس رشتے سے خوش نہ تھے پھر سراج کا کینیڈا کا ویزا لگ گیا انہیں وہاں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی سو وہ اسامہ کو اور اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر کینیڈا چلے گئے۔ وہاں جا کر اسامہ نے دونوں بھائیوں سے رابطہ رکھنے کی کوشش کی مگر جب اُن کی جانب سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا تو اسامہ نے بھی فون اور خط کا سلسلہ منقطع کر دیا، لیکن ہر سال عید پر مبارک باد کے کارڈ وہ دونوں بھائیوں کو بھیجا کرتیں۔ سبھین اور شامین کے علاوہ دیگر کزنز بھی اپنی منگنیوں کو اُن کی تصویروں اور عید کارڈز کی بدولت جانتے تھے۔ ندیم اور نعیم کا بچپن اسامہ کے بچوں کے ساتھ گزرا تھا تصویریں بھی تھیں وہ بھی پرانی یادیں ہر سال عید کارڈ موصول ہونے پر تازہ کرتے تھے اسامہ کا تذکرہ ”کریم دلا“ سے ختم نہیں ہوا تھا۔ اب تو دونوں بھائیوں کو بھی بے جا ضد اور ناحق ناراضگی پر افسوس ہونے لگا تھا۔ ان کے دل میں اسامہ سراج کی

کے ہاتھوں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرتا وہ فوراً اپنے مرد اور طاقت ور ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کو بے عزت و بے آبرو کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوستی ہی کرنا چاہتا تھا تاہم تم سے تو کر لیتیں۔ جیسے باقی یونیورسٹی فیلوز سے ”ہیلو ہائے“ ہے ویسے ہی وشال سے بھی رکھتیں تو کیا بڑا تھا۔ اس میں جو اُسے اتنی کھری کھری ساڈا لیس؟“ وشال کے جاتے ہی شامین بری طرح سبھین پر برس رہی تھی۔ ”وہ سمجھتا ہے کہ ہر لڑکی اس سے دوستی کی خواہش مند ہے اور اس پر فدا ہے، اس سے بات کرنے، اس کے ساتھ چلنے کو اپنا اعزاز سمجھتی ہے جبکہ میں اسے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ اس کی خوش فہمی ہے وہ کوئی توپ نہیں ہے کہ جدھر چلے گا جہاں پھیلا دے گا وہ بھی ایک عام مرد ہے بس اُسے اپنے خُسن کا زعم ہے لیکن میرے نزدیک ایک مرد کی وجاہت اس کے کردار کی پختگی اور مضبوطی ہے اور وشال احمد ہونہ کُلی کُلی منڈلانے والا بھنورا لیڈی کلر، مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے وہ شخص۔“ سبھین نے سپاٹ اور سگلتے لہجے میں جواب دیا۔

”حالانکہ جب وہ پہلی بار یونیورسٹی آیا تھا تو تمہاری نگاہوں نے ہی اسے ”یوسف جانی“ اور دیو مالائی حسن کا شاہکار قرار دیا تھا۔“ شامین نے مسکراتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”ہاں جب مجھے اس کے کردار اور اطوار کا علم نہیں پیشک وہ ظاہری خُسن کی دولت سے مالا مال ہے لیکن باطنی خُسن اُس میں ناپید ہے۔ دیکھا نہیں تم نے کیسے ہر روز نئی لڑکی کے ساتھ ہنستا ہوتا نظر آتا ہے اور پرسوں تو ہم دونوں نے اُسے آکس کریم پارلر میں اپنی کلاس فیلو ذوبیہ کے ساتھ آکس کریم کھاتے دیکھا تھا دونوں ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے بہت گہرے رشتے میں بندھے ہوں۔“ سبھین نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم جیلس ہوئی نا اسے دوسری لڑکیوں پر مہربان دیکھ کر۔“ شامین نے شرارت سے کہا۔

”جیلس ہوتی ہے میری جوتی۔“ میں نے تمہارے سامنے اس کی بے عزتی کی ہے۔“ سبھین نے چڑ کر کہا۔

”ویسے وشال احمد تمہیں سوٹ کرے گا۔“

”میں اُسے سوٹ کروں گی سمجھیں۔“ سبھین نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

کریم اور کلثوم بیگم کے تین بچے تھے دو بیٹے اور ایک بیٹی بڑے بیٹے عظیم، دوسرے نمبر پر نعیم تھے اور تیسرے نمبر پر اسامہ کریم تھیں۔

عظیم اور نعیم کی شادیاں اپنی خالہ پھوپھی زاد ظاہرہ اور فرزانہ سے ہوئی تھیں۔ عظیم اور

کلاس روم کی جانب تیزی سے قدم بڑھا دیئے ناچار بوکھلائی ہوئی شامین کو بھی اس کی تھلید کرنا پڑی۔

”وشی یار، تو اس لڑکی کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔“ جنید نے مخرمخری لے کر کہا۔  
 ”پاگل ہو نہیں رہا میرے دوست اس لڑکی نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔“ وشال نے گہرا سانس لے کر بے بسی سے جواب دیا۔

”حسین تو بلاشبہ ہے مگر بہت غصے والی لگتی ہے۔“ جنید نے رائے دی۔  
 ”اس کی یہی ادا تو مجھے لے ڈوبی ہے یا جونی! یہ عام لڑکیوں سے مختلف ہے یہ میرے ظاہری حسن اور دولت سے امپر لیس نہیں ہے۔“ وشال نے کہا۔

”شاید اس لئے کہ وہ خود بھی بہت حسن و جمال رکھتی ہے اور دولت کی کمی تو اسے بھی نہیں ہے لہذا یہ دونوں چیزیں اس کے لئے اہم کیونکر ہو سکتی ہیں۔ تم دونوں حسن اور دولت میں یکساں ہوں لہذا ٹکراؤ تو ہو گا ناں۔“ جنید نے سنجیدگی سے کہا۔

”یار..... مجھے پتا بھی نہیں چلا اور سبھین میرے دل پر قابض ہو کر بیٹھ گئی۔ میں اسے بحث و مباحثے میں فٹس پرائز جیتنے دیکھتا تھا۔ اسے آتے جاتے دیکھا کرتا تھا اور ان چار ماہ میں وہ مجھے اپنا اسیر کرتی چلی گئی۔ آئی تھنک اُسے میرا لڑکیوں سے بے تکلف ہونا، دوستی کرنا برا لگتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”تو چرا اسے اچھا لگتا ہے وہ کر کے دیکھ شاید قسمت کی دیوی تجھ پر مہربان ہو جائے۔“ جنید نے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مشورہ دیا۔

”یہ تو ہر بات میں ”شاید“ کیوں لگا دیتا ہے کوئی بات یقین سے بھی کہہ دیا کر۔“ وشال نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

”اچھا بھائی یقیناً قسمت کی دیوی ایک دن تم پر مہربانی ہوگی۔“

”انشاء اللہ بھی کہہ دوتا۔“ وشال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”انشاء اللہ، انشاء اللہ۔“ جنید نے کہا تو وہ ہنستا چلا گیا۔

☆☆☆

”اگر وہ بادشاہ ہوتا!“

تو کوئی بات بھی ہوتی

سنا ہے بادشاہوں کو

محبت بہت شدت سے سر اٹھا رہی تھی۔ وہ ان سے شرمندہ تھے۔ وہ اسام کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان سے ملنا چاہتے تھے۔ اپنی ضد اور رویے کی معافی مانگنا چاہتے تھے، لیکن رابطے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی مکمل پتا تھا۔ بہت پہلے اسام نے اپنا ایڈریس لکھا تھا جو کھو گیا تھا اس کے بعد ان کے عید کارڈز پر ان کا کینیڈا کے گھر کا ایڈریس کبھی لکھا ہوا نہیں آیا۔ اب تو وہ اسام کی واپسی کی ان سے رابطے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اسام بہت خوبصورت تھیں۔ سبھین، فرحین اور شامین کو ان سے ملنے کا بہت شوق تھا اور افسوس بھی تھا کہ ان کے بڑوں نے پسند کی شادی کو ایٹو بیٹا کر ان سے قطع تعلق کر لیا۔

☆☆☆

”ہیلو گز کبھی ہیں آپ؟“ وشال اپنے دوست جنید کے ساتھ ان دونوں کے سامنے موجود تھا اور سبھین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہم ٹھیک ہیں وشال بھائی آپ کیسے ہیں؟“ شامین نے اخلاقیات بجاتے ہوئے جواب دیا تو وشال نے سبھین کے چہرے کو بخور دیکھ کر کہا۔

”یہ تو آپ اپنی دوست سے پوچھیے جن کا موڈ آف لگ رہا ہے۔“

”کچھ دیر پہلے تو اس کا موڈ ٹھیک تھا۔“ شامین نے سبھین کو دیکھ کر کہا۔

”گویا مجھے دیکھ کر ان کا موڈ آف ہوا ہے۔“ وشال سنجیدگی سے بولا۔

”جب آپ یہ بات جانتے ہیں تو کیوں چلے آتے ہیں میرے سامنے چائے اُن کو اپنے درشن کرائیے جن کا موڈ آپ کو دیکھ کر خوشگوار ہو جاتا ہے۔“ سبھین نے بے مروتی کی حد کرتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

”جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا ہے۔“ جنید نے سبھین کو دیکھے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب کیسا سنا تھا آپ نے میرے بارے میں اور مسٹر وشال آپ کو کس نے اجازت دی ہے کہ آپ اپنے دوستوں سے میرے متعلق گفتگو کریں میں غیر مردوں کی گفتگو کا موضوع بنوں یہ بات مجھے قطعی ناپسند ہے۔“ سبھین نے وشال کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی تو شامین سسٹر کے ساتھ مجھے ڈسکس کرتی ہوں گی ناں تو اس طرح جنید میرا بیٹ فریڈ ہے اس سے میں اپنی ہر بات شیئر کرتا ہوں اور اسے ہی میں نے بتایا ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔“ وشال نے نہایت دھمے لہجے میں جواب دیا۔

”مسٹر وشال احمد یہ لفظوں کا جال ان پر پھینکو جو تمہاری اس قسم کی باتیں سن کر خوش ہوتی ہیں۔ آئندہ مجھے یہ خرافات مت سنانا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ سبھین نے غصیلے لہجے میں جواب دیا اور



دیں ایسا کوئی نذرانہ

جو

سب چیزوں سے بڑھ کر ہو

تو اپنی بادشاہی تک

لٹا دیتے ہیں وہ اکثر

محبت ہے ہمارے پاس۔ مگر!!!

وہ بادشاہ کب ہے؟

سبعین اپنے کمرے میں کھڑکی کے پٹ سے سرٹکائے دھیمے دھیمے سروں میں یہ نظم پڑھ کر مڑی تو شامین کو اپنے منقائل پایا۔

”مائی ڈیر کزن..... یہ بادشاہ کا دور نہیں ہے اگر کوئی بادشاہ ہے تو کسی کے دل کا بادشاہ ہے تم بھی وشال احمد کو اپنے دل کا بادشاہ بنا لو مزے میں رہو گی۔“ شامین نے اسے دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”یکومت، وہ بادشاہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ بزدل اور فضول شخص ہے وہ۔“ سبعین نے حقارت آمیز لہجے میں کہا تو وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”سبعین، تم اوروری ایکٹ کر رہی ہو وشال احمد اتنا برا نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھتی ہو۔ تم نے دیکھا نہیں سارے کیسپس کی لڑکیاں کیسے اس پر صدقے واری جاتی ہیں جہاں سے وہ گزرتا ہے سب کی نظریں اُس کے تعاقب میں نکل جاتی ہیں۔ لڑکیاں تو خود اس کے سامنے قالین کی طرح پھٹی چلی جاتی ہے وہ اگر اخلاقاً مسکرا دیتا ہے ”ہیلو ہائے“ کر لیتا ہے تو اس میں کیا بُرا ہے۔“

”مرد کے لئے تو عورت کی طرف مسکرا کر دیکھنے میں کوئی برائی نہیں ہے مرد اگر بے کردار بھی ہو تو اسے اپنے کردار پر کوئی منفی تاثر اور جملہ برداشت نہیں ہوتا اور عورت با کردار، باعفت اور پاکیزہ صفت بھی ہو تو اسے یہ مرد بد کردار اور بے حیا کہہ کر بدنام کر دیتے ہیں۔ وہ رخسار یاد ہے تمہیں فٹ ایئر کی وہ بھی کہہ رہی تھی کہ وشال احمد نے اسے محبت کے جال میں پھنسا کر بیوقوف بنایا چند دنوں بعد کسی دوسری لڑکی کی طرف مائل ہو گیا وہ کراچی میں پورے کالج میں اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے بدنام ہو چکا تھا اسی لئے تو اس نے لاہور مائی گریٹ کرا لیا۔ اب چار مہینے سے ہم بھی اس کا چال چلن دیکھ ہی رہے ہیں کون سی خوبی ہے اس میں سوائے اس کے کہ وہ حسین ہے، ذہین ہے اور پیسے والا ہے؟“ سبعین نے سنجیدگی سے کہا۔

”مردوں میں آج کل ان تینوں خوبیوں کا یکجا ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔ والدین لڑکی کا رشتہ کرتے وقت بھی مرد کا روزگار اور کاروبار دیکھتے ہیں اس کا کردار نہیں دیکھتے۔“ شامین نے کہا۔

”خیر اب اتنا بھی اندھیر نہیں ہے، کم از کم میں تو کسی کمزور کردار کے مرد سے شادی نہیں کروں گی۔“ سبعین نے گھڑی پر ٹائم دیکھ کر کہا۔

”دیے وشال احمد بہت چاہتا ہے تمہیں۔“

”وہ تو سینکڑوں لڑکیوں کو چاہتا ہے اور مجھے اس ”لیڈی کلر“ سے دوستی کا درس مت دینا تم، میری زندگی میں ایسے کسی شخص کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کی عادت ہو۔“ سبعین نے تلخی سے کہا۔

”سبعین یار، کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی جھوٹ لکھتا ہے اس لئے وشال احمد کے بارے میں اس قدر منفی رویہ مت اپناؤ کہ کل کو تمہیں اس کے مثبت کردار کا عکس دیکھ کر اپنے ان خیالات پر ندامت محسوس ہو۔“

”یہ تم اس ہیر کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہو؟“

”میں تو صرف حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے حمایت کر رہی ہوں مگر تم تو اُس سے محبت کر رہی ہو۔“ شامین نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”ا“ شامین، تم انتہائی مین (Mean) ہو، میں بھلا وشال سے محبت کیوں کرنے لگی؟“ سبعین نے غصیلے لہجے میں کہا مگر دل نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

”محبت کیا..... کیوں..... کیسے کے سوالیہ نشانوں سے بے نیاز ہوتی ہے ڈیر کزن اور اگر تمہیں وشال احمد سے محبت نہیں ہے اس کی تمہاری نزدیک کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں ہے تو یہ بادشاہ والی نظم کس کے خیال میں کھوکھو کر پڑھی جا رہی تھی۔ اگر وہ بادشاہ ہوتا تو تم اسے اپنی محبت دان کر دیتیں ناں۔“

”بکواس بند کرو شامی۔“ وہ غصے سے بولی تو وہ ہنس پڑی۔

”تمہارا غصہ ہی تمہاری محبت کا بھید عیاں کرنے کے لئے کافی ہے سبعین ڈارلنگ، تمہیں وشال احمد پر غصہ آتا ہے اس لئے کہ اس نے تم جیسی ”سٹون گرل“ کو ”موم گرل“ بنا دیا ہے محبت کے معاملے میں کیوں صحیح کہا تا میں نے اب انکار مت کرنا میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔“ شامین نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ کر پر یقین اور شوخ لہجے میں کہا۔

”تم قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں سے۔“ سبیین نے اپنی آستین چڑھاتے ہوئے شامین سے کہا۔

”قاتلہ تو تم ہو ہی وصال احمد کے جذبوں کا خون کر چکی ہو بچ بتاؤ سبیین کیا وصال کو دینے کے لئے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟“

محبت ہے ہمارے پاس

مگر وہ بادشاہ کب ہے؟

سبیین نے یہ شعر پڑھا اور کھڑکی بند کر دی۔

”گویا اگر وہ بادشاہ بن جائے تو تمہاری محبت اس کے لئے ہوگی ہے نا۔“

”شامی کی بچی پنوگی اب تو مجھ سے۔“ سبیین اُسے نکلیہ اٹھا کر مارنے کو دوڑی تو وہ ہنستی ہوئی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

☆☆☆

”السلام وعلیکم سبیین!“ وہ کلاس روم سے باہر نکلی تھی کہ سامنے سے آتے وصال نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔

”علیکم السلام!“ سبیین نے مروٹا جواب دیا اور نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی، وصال دوڑ کر اس کے برابر آتے ہوئے بولا۔

”سبیین پلیز! ایک منٹ کے لئے رکے میری بات سنیجئے۔“

”فرمائیے! جو بھی فرمانا ہے ایک منٹ کے اندر فرمائیے۔“ سبیین نے سنجیدہ مگر نارمل لہجے میں کہا اور رک گئی یہ شامین کے سمجھانے کا اثر تھا یا کچھ اور کہ وہ اس بار اسے دیکھ کر غصے میں نہیں آئی تھی اور بہت مہذب، لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی جس سے وصال کی ہمت بندھی تھی۔

”سبیین! میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ میں بادشاہ یقیناً نہیں ہوں مگر آپ کا نوکر، خادم، غلام، خدمت گار اور وفادار بن کر ضرور رو سکتا ہوں اگر آپ مجھے دل سے قبول کر لیں تو میں بادشاہ ضرور بن جاؤں گا۔ انسا سب کچھ آپ کے نام لے دوں گا۔“

”بدلے میں آپ مجھے کیا دیں گے؟“ سبیین نے زبردستی اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔

”اپنا دل!“

”لیکن مجھے آپ کے دل کی ضرورت نہیں ہے، یہ پیشکش آپ کسی دل پھینک کو کیجئے اور مجھے جانے کا راستہ دیجئے۔“ سبیین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میرا ہر راستہ بند کر کے خود جانے کا راستہ مانگ رہی ہیں آپ۔“ وصال نے بے کلی سے اس کی شہابی رنگت والی دلکش صورت کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اپنے کلاس فیلو کی نگاہوں کو محسوس کر کے غصے سے بولی۔

”دیکھو مسٹر میں اب تک صبر سے تمہاری فضول گفتگو سنتی رہی ہوں مگر لگتا ہے کہ تم شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔“

”میں محبت کی زبان سمجھتا ہوں، تم ایک بار مجھ سے محبت سے بات کر کے تو دیکھو میں تمہاری ہر بات سمجھ جاؤں گا۔“

”میرے پاس اتنا فضول وقت نہیں ہے کہ تمہیں سمجھانے میں ضائع کروں۔“ وہ غصے سے بولی۔

”ہائے وصال!“ کسی لڑکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہائے وصال!“ سبیین نے سپاٹ لہجے میں کہا اور لڑکی کو وصال کے قریب آتا دیکھ کر تیزی سے غصے سے سرخ چہرہ لئے آگے بڑھ گئی۔

”ادھائے ٹینا!“ وصال نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے اپنی کلاس فیلو کو دیکھا تھا۔ نگاہیں تو بار بار سبیین کی جانب اٹھ رہی تھیں جو جلد ہی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

گھر آ کر سبیین بے کل سی رہی۔ جانے کیسا احساس تھا جو اس کے اندر ایک خوشی کا سا باندھ رہا تھا۔ وصال کا اقرا محبت اسے روہ کر یاد آ رہا تھا اور مسکان اس کے لبوں پر آ کر بکھر رہی تھی۔ رات کا آٹھ بج رہا تھا اور آنکھیں خوابوں کی افشاں سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں لان میں ٹہل رہی تھی۔ بہز موسم کی بے حد خشک رات تھی۔ ہار سنگھار کی خوشبو کا جادو جواں رات کی سانس میں کھل رہا تھا۔ چاندنی رات کی گود میں سر رکھے فیس رہی تھی۔ شبینی گھاس کا لمس پاؤں کو سکون دے رہا تھا اور وصال احمد کا وہی نرم، ملائم لہجہ اس کی سماعتوں میں پیار کی بات کہہ رہا تھا۔

”سبیین میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔“

وہ وصال احمد کی محبت میں پور پور ڈوب چکی تھی مگر وہ خود سے بھی اعتراف کرنے سے گریزاں تھی۔ وہ اس احساس کو محبت کا نام نہیں دیتا چاہ رہی تھی۔ وصال احمد کو اس نے تصور کی آنکھ سے کئی لڑکیوں کے جھگڑے میں گھرا دیکھا تو فوراً اس احساس کو جھٹک کر اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے وجود کے اندر رہنے والی سبیین کے دل کے قدم وصال احمد کی جانب

بڑھ رہے ہیں۔

☆☆☆

وشال میں ایک بڑی واضح تبدیلی آئی تھی جس نے کیسپس کی تمام لڑکیوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ تبدیلی یہ تھی کہ اب وشال خود سے اپنی کلاس فیلو یا یونیورسٹی فیلو کو مخاطب نہیں کرتا تھا۔ جن سے دوستی تھی ان لڑکیوں کو بھی پہلو ہائے اور پائے کے علاوہ لفٹ نہیں کراتا تھا۔

”گلتا ہے وشال احمد نے دل پر چوٹ کھائی جیسی سب لڑکیوں سے دوستی ختم کر دی ہے۔“ سبین کی کلاس فیلو نائلہ نے کہا تو جانے کیوں وہ نظریں چڑا گئی اس خیال سے کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں وشال کی صورت نہ دیکھ لے اس کا نام نہ پڑھ لے۔ اُس کے اس رویے کا سبب نہ جان لے۔

”تمہاری خاطر وشال احمد نے سب لڑکیوں سے دوستی اور دُعا سلام تک ختم کر دی ہے اب تو اس دیوانے پر رحم کرو سبین۔“ شامین نے اسے چھیڑا دونوں اپنی گاڑی میں بیٹھی تھیں۔

”کیا چاہتی ہو تم، کیا کروں میں اس کے ساتھ؟“ وہ اپنی دلی حالت چھپاتے ہوئے چلنے والے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”محبت..... جو محبت دل میں اس سے کرتی ہو اس کا زبان سے اقرار کر لو اسے بھی قرائل جائے گا اور تمہیں بھی۔“ شامین نے شرارت سے کہا۔

”بکواس نہیں کرو مجھے کسی سے محبت نہیں ہے۔“ سبین نے اسٹریک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے کسی سے محبت کی نہیں اُسی سے یعنی وشال احمد سے محبت کی بات کر رہی ہوں۔“ شامین نے مسکراتے شوخ و شریر لہجے میں کہا۔

”بہتر ہوگا کہ تم یہ بات نہ ہی کرو۔“ سبین نے جھلا کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے کندھے اُچکا کر رہی گئی۔

”ان دونوں کے امتحان شروع ہو گئے تھے وہ سارا سارا دن کتابوں میں گھسی رہتیں۔ شام کو سبین سو کر اٹھی تو ملازمہ نے مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔“

”سب لوگ کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا

”صاحب لوگ تو فیکٹری سے ابھی نہیں آئے اور بیگم صاحبہ سامنے شیخ صاحب کے گھر میلا اور قرآن خوانی میں گئی ہیں شامین بی بی سوری ہیں آپ ہی ہیں میں مہمان کے لئے چائے یا

کافی لاتی ہوں آپ ڈرائنگ روم میں جائیں۔“ ملازمہ ساری بات کہہ کر چلی گئی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر اپنے شانوں تک لہراتے بالوں میں برس پھیر کر لباس کی شکنیں دور کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سامنے موجود شخص کو دیکھتے ہی اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور آنکھوں میں حیرت اُٹھ آئی۔ وشال احمد اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔

”تم..... تم یہاں بھی پہنچ گئے۔ تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟“ وہ ایک دم سے اس صورتحال پر گھبرا گئی اور پریشانی اور غصے سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی حالانکہ دل کے چمن میں تو اُس کی آمد سے بہار آگئی تھی۔

”یہ پوچھنے کی بجائے آپ یہ پوچھیں کہ آپ جیسی مغرور حسینہ سے محبت کیسے ہوئی مجھے؟“ وشال نے مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آکر کھڑے ہوتے ہوئے کہا، حیرت تو اسے بھی بہت ہوئی تھی سبین کو یہاں دیکھ کر مگر اس کی یہاں موجودگی نے وشال کو جودی مسرت اور طمانیت بخشی تھی وہ حیرت سے کہیں زیادہ تھی اور وشال نے اس پر اپنی حیرت قطعاً ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

”شٹ آپ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں لوگوں سے دھکے دے کر تمہیں گھر سے باہر نکلوا دوں گی۔“ وہ شپٹا کر بولی۔

”گھر سے تو شاید آپ مجھے نکال سکتی ہوں گی مگر اپنے دل سے کیسے نکالیں گی؟“ وہ اس کی کیفیت سے محفوظ ہوتے ہوئے بڑے یقین سے بولا۔

”کیا کہا تم نے؟“ وہ بڑی طرح شپٹا گئی۔

”کوشش کر دیکھئے سبین میرا نام بھی وشال احمد ہے۔ مجھ کو اپنا نہ بتایا تو میرا نام نہیں۔“ اس نے شوخی سے آخری جملہ گنگنا کر کہا۔

”تم.....!“

”تمہارا نام بدل کر رکھ دوں گا میں سبین نعیم۔ ایک دن تم مسز وشال احمد کہلاؤ گی۔“ وہ اس کے غصے اور گھبراہٹ سے حظ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر سہولت سے بڑے پڑ یقین لہجے میں بولا۔

”کیا ہے تمہارے پاس مسٹر وشال، باپ کی دی ہوئی دولت اور قدرت کی دی ہوئی یہ حسین صورت جس پر تم اتنا کڑتے ہو تم ان نعمتوں اور قدرت کی ان مہربانیوں کے بغیر کیا ہو۔ فقیر..... فقیر ہو تم۔“ سبین نے نہ چاہتے ہوئے بھی غصے میں جو منہ میں آیا کہے چلی گئی وہ فہم پڑا۔



وشال بڑے مؤدب انداز میں کھڑا ہوا اور انہیں دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

”السلام وعلیک ماموں جان!“

”وعلیک السلام بر خودارتم نے ہمیں ماموں کیوں کہہ کر مخاطب کیا؟“ دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا تحیرت دونوں کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

”کیونکہ آپ میرے بڑے ماموں ہیں عظیم ماموں اور آپ نعیم ماموں ہے نا۔“ وشال نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان کے ساتھ ساتھ سبعتین کو بھی بے حد حیرت ہوئی۔

”کیا وہ اس کا کزن ہے اسماء پھوپھو کا بیٹا ہے؟“ یہ سوال بے اختیار سبعتین کے دماغ میں ابھرا تھا۔

”ہاں بیٹا مگر تم؟“ نعیم نے اس کے پاس آتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری صورت دیکھی دیکھی سی لگتی ہے۔“ عظیم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا اس میں اپنے ماں باپ دونوں کی شہادت تھی اور اپنا الگ رنگ بھی تھا۔ وشال احمد کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اونچا لمبا بہت دلکش نین نقش کا مالک تھا۔ اس کی ڈارک براؤن آنکھوں میں ہر وقت روشنیاں دکھتی رہتی تھیں جن میں شرارت، شوخی اور محبت کے رنگ شامل ہوتے تھے۔ اس کے احمر لبوں کی مسکراہٹ بہت دل موہ لینے والی تھی۔ اس کی ہنسی دل وروح میں جلتی رہتی تھی۔ اس کی نکھری رنگت اُسے بہت صاف، شفاف اور اُجلا بنائے رکھتی تھی اور اس پر اس کے لباس کا انتخاب بے حد شاندار ہوتا تھا۔ وہ یقیناً حسیناؤں کے دل پر قدم رکھ کر چلتا تھا اور اپنی اس قاتلانہ صفت سے خاصا بے نیاز اور بے خبر بھی تھا یا شاید بے خبر بن جاتا تھا۔

”وہ اس لئے ماموں جان کے میں آپ ہی کا خون ہوں آپ کا سگا بھانجا ہوں وشال احمد سراج احمد آپ کی بہن اسماء سراج میری ماما جانی ہیں۔“ وشال نے مسکراتے ہوئے ان کے سامنے یہ انکشاف کیا تو ان تینوں کے چہروں پر خوشی سے بھرپور مسکان نکھر گئی۔

”تم اسماء اور سراج کے بیٹے ہو۔“ عظیم نے وشال کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر خوشی سے پر لہجے میں پوچھا۔

”جی ماموں جان۔“

”اوہ! میری بہن کا بیٹا میرا خون، میری جان..... بیٹا اسماء کہاں ہے۔ سراج بھائی کہاں ہیں؟“ عظیم نے اسے دیوانہ وار چومتے ہوئے اپنے گلے لگا کر بھینکتے لہجے میں پوچھا۔

”وہ کراچی میں ہیں میں یہاں اسٹڈی کے لئے آیا ہوں اور کچھ بزنس وغیرہ کے لئے

”تمہارے دو کا فقیر ہوں، گدا ہوں، منگتا ہوں، سوالی ہوں۔ تم میری جھولی میں اپنے پیار کی بھیک ڈال دو۔ میرے کا سے میں اپنی محبت کے سکے بچھا کر دو۔ میرے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھ کا ساتھ دان کر دو، مجھے اپنی چاہت کی خیرات سوپ دو۔ تو سبعتین بی بی میں با مراد بانصیب اور بخت آور کہلاؤں گا۔“ وشال نے اس کے حسن صبیح چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بہت شیریں، نرم اور دلکش لہجے میں کہا۔ سبعتین کا تو روم روم دل بن کر دھڑکنے لگا وہ سر سے پاؤں تک ان دیکھی آگ میں جلنے لگی۔ اپنے کے قطرے اس کے چہرے کے گلاب پر شبنم کی طرح نمودار ہو گئے۔ ہاتھوں میں نمی اور کچکی اترنے لگی تھی۔

”میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے سنا تم نے۔“ وہ ہمت کر کے بولی۔

”کیا محبت بھی نہیں؟“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا سبعتین کا دل بھی مجھ سا مگیا۔

نکمر لہجہ اور جملہ انتہائی سفاک تھا اس کا۔

”محبت کا لفظ تم جیسے ”فلرٹ مین“ کو زیب نہیں دیتا۔“

”میں سچ سچ تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”تو کرتے رہو مجھ سے محبت کی قیمت کیوں چاہتے ہو؟“

”قیمت نہیں تمہاری محبت چاہتا ہوں۔“

”بات تو ایک ہے۔“

”سبعتین میں۔“

”پلیز تم چلے جاؤ یہاں سے۔“

”میں تو تمہارے والدین سے مل کر ہی جاؤں گا۔“ وہ آرام سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے

دلا۔

”اگر تمہاری وجہ سے مجھ پر کوئی حرف آیا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔“ وہ اسے تنے المینان اور بے فکری سے بیٹھا دیکھ کر مسک کر بولی تو وہ ہنس پڑا نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ہلکے نیلے اور سفید کاشن کے سوٹ میں میک آپ سے میرا چہرہ لئے وہ سادگی میں بھی بے حد دلکش اور حسین لگ رہی تھی۔ وشال تو اس کے رنگ روپ کو اپنی آنکھوں سے دل وروح میں اُبلے جا رہا تھا۔

اتنے میں اس کے بابا اور تایا جان آچکے تھے، سبعتین کا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی کیفیت سے لطف، اٹھا رہا تھا۔ جیسے ہی عظیم اور نعیم نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھے

بھی۔“ وشال نے مختصراً بتایا۔

”ماما! اللہ تم کو اپنے ماں باپ سے زیادہ خوبصورت لکھے ہو۔“

”ماموں جان! میں انہیں کا عکس ہوں۔“ وشال نے مسکراتے ہوئے کہا سامنے سبھین کھڑی حیران آنکھوں سے یہ لمن کا منظر دیکھ رہی تھی۔ وشال نے اس کی طرف دیکھا اور قاتحانہ انداز میں مسکرا دیا وہ نروس ہو کر وہاں سے سیدھی شامین کے کمرے کی طرف بھاگی اور اُسے چمکا کر ساری بات بتا دی۔

”مبارک ہو تمہارا کام آسان ہو گیا۔“ شامین نے اس کی بات سن کر کہا۔

”کوئی کام؟“

”وہی جو تم وشال بھائی کو خواہ مخواہ کا غصہ دکھا دکھا کر مشکل بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔“

شامین نے شرارت بھرے اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

”شامی، لگتا ہے تمہاری نیند ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی میں تمہارا منہ دھلوا دیتی ہوں تاکہ تم ہوش میں آ جاؤ اور ہلکی ہلکی باتیں کرنا چھوڑ دو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی سے بھرا گلاس اٹھا کر اس پر انڈیل دیا۔

”اف سبھین کی بچی۔“ شامین بوکھلا کر چیخ اٹھی، سبھین ہنسی ہوئی اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں سب گھروالے وشال کے گرد جمع تھے۔ اس سے اسامہ سراج اور جمال کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وشال ان سب کے ساتھ یوں مکمل مل گیا تھا جیسے ان سے پرانی شناسائی اور دوستی رہی ہو۔ سب کو وشال بہت پسند آیا تھا۔ سبھین نروس نروس سی، وشال کی نظروں کے حصار میں ہی تھی۔ سبھین کو اپنے رویے پر ندامت محسوس ہو رہی تھی اسے یقین تھا کہ اسامہ پھپھو کا بیٹا کمزور کردار کا مالک نہیں ہو سکتا وہ کسی کے ساتھ فلرٹ نہیں کر سکتا۔ اسے شامین کی باتیں، اپنے متعلق اس کا تجزیہ اور وشال کے متعلق اس کی رائے اس وقت بالکل درست معلوم ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ وشال کا سامنا کیسے کرے گی؟

وشال کو سب نے رات کے کھانے پر روک لیا تھا۔ عظیم اور نعیم تو اسے یہیں رکھنے اور رہنے کو کہہ رہے تھے مگر اس نے سہولت سے ان سے معذرت کر لی کیونکہ اس کا اپنا شاعر بنگلہ تھا۔

”سبھین، آپ میری ماما جانی کی سگی بھتیجی ہیں مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا ہے اور میں اس رشتے کے انکشاف پر کس قدر خوش ہوں آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں۔“ وشال نے واپسی سے پہلے

سبھین کے پاس آ کر آہستگی سے کہا تو وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ چلا گیا تھا اور اس کا دل، اس کا چین اور قرار بھی لوٹ کر لے گیا تھا۔ وہ اپنے وشال کے ساتھ معنی رویے کے سبب بہت فکر مند اور نادم تھی۔ بستر پر سونے کے لئے لیٹی تو آنکھوں میں نیند کی جگہ وشال کی من موٹی صورت آ سائی، جو اسے خوش رنگ اور دل پذیر خوابوں کی خوبصورت دنیا میں لے گئی جہاں پہنچ کر وہ یہ خواہش کرنے لگی کہ ”وشال کے ہاتھوں کے شبھی پیالوں میں چہرہ میرا پھول کی طرح ہلکورے لیتا رہے۔ زندگی اس جنوں خیز بارش کے شانوں پر سرگورکھے رقص کرتی رہے۔ اس کے پیار کی چٹنل ہوا سبز پتوں کی جھانجھن پہن کر شوق پھولوں کی پائل بجاتی ہوئی میرے رخسار کو گاہے گاہے شرارت سے چھونے لگے۔ وہ مجھ کو محبت سے خود میں سونے لگے اور زندگی اسی خوش کن احساس میں بیت جائے۔“ وہ اپنے آپ سے دل کی بات کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

اسامہ پھپھو اور سراج احمد دو سال پہلے کینیڈا سے کراچی آ گئے تھے۔ ان کا بڑا بیٹا جمال احمد کینیڈا میں ہی تھا جمال کی شادی ڈیڑھ سال پہلے سراج احمد نے اپنی بھانجی رمشا سے کر دی تھی۔ اب ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ سراج احمد ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے مالک تھے۔ انہوں نے ان تین برسوں میں بہت محنت کی تھی اور اپنا بزنس شروع کر کے اسے بہت وسیع پیمانے پر کامیابی سے چلا رہے تھے۔ کراچی میں انہوں نے اپنی ملٹی نیشنل کمپنی کا آفس کھول لیا تھا۔ لاہور میں وہ وشال کے لئے فیکٹری لگوا رہے تھے جس کا کام تقریباً مکمل تھا۔ وشال نے کینیڈا میں ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کراچی آ کر ایم۔ سی۔ ایس میں داخلہ لے لیا اور جب لاہور میں فیکٹری لگانے کا منصوبہ شروع ہوا تو اس نے کراچی یونیورسٹی سے لاہور یونیورسٹی میں مائی گریٹ کرا لیا۔ اس کے شاندار تعلیمی کیریئر کی بدولت اُسے باسانی داخلہ مل گیا تھا۔ سبھین کو وشال نے تقاریر کے مقابلوں میں بولتے ہوئے سنا تھا۔ وہ پہلے اس کی صورت پر فدا ہوا تھا پھر اس کی ذہانت نے اپنا گردیدہ بتا لیا وہ ہر امتحان میں پہلی یا دوسری پوزیشن لیتی رہی تھی یہ معلومات بھی وشال کے لئے متاثر کن تھیں۔ پھر سبھین کا دوسری لڑکیوں سے ہٹ کر۔ اس سے دوستی سے انکار کرنا۔ اس کے کردار کو کمزور اور دوستی کو فلرٹ کا نام دینا وشال کے اندر اس کے پیار کی آگ سلگا گیا۔ سبھین نے دوسری لڑکیوں کی طرح اس سے دوستی کرنے میں پہل نہ کی تھی اور نہ ہی وشال کی دوستی کی آفر کو قبول کیا تھا بس یہیں سے وشال احمد اس سے مات کھا گیا اور اسے یوں لگا جیسے اسے سبھین جیسی لڑکی کی ہی تلاش تھی۔ دل نے اس کے ساتھ کی تمنا کر ڈالی زبان اس کے من کی دعائیں مانگنے لگی۔ روح اس کی محبت کی مہک

مخلص اور سنجیدہ ہونے کے لئے تیار ہوں گی۔ ہونہہ بقول رخسار کے وہ کراچی یونیورسٹی سے اپنی ان حرکتوں کے باعث بدنام ہو کر نکلا ہے۔ ”سبعین نے ان باتوں کی حقیقت جاننے کے لئے جان بوجھ کر جنید سے یہ ذکر کیا تھا۔

”سبعین..... تم کیوں وشال بھائی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔“ شامین نے اسے ٹوکا۔  
 ”مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے سبعین کہ آپ ذہین تو ہیں مگر آپ کی ذہانت صرف نصائی کتب اور بحث و مباحثے تک ہی محدود ہے آپ سمجھدار اور نظر شناس نہیں ہیں۔ آپ میں کھرے اور کھوٹے انسان کو پرکھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے اگر ہوتی تو آپ کے وشال کے متعلق جو خیالات ہیں وہ اس کے برعکس ہوتے۔“ جنید نے تاسف سے کہا۔

”میں اپنے دوست کی وکالت ہرگز نہیں کروں گا وہی کہوں گا جو سچ ہے اور سچ یہ ہے کہ رخسار نے دشی کے متعلق آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے، بہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رخسار خود اپنی نازیبا حرکات کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکالی گئی تھی وہ خود بدنام ہو چکی تھی۔ دشی کو وہ قطعی پسند نہیں تھی اس لئے اس نے اس سے سلام دعا کا سلسلہ بھی نہیں رکھا تھا۔ اسی بات کا غصہ تھا اسے وہ تو آئے دن نئے لڑکے کے ساتھ ہونٹ لگاتی دیکھتی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اپنی بدنامی کے ڈر سے اسے یہاں بھیج دیا۔ یہاں بھی وہ ویسی ہی ہے بس ذرا محتاط ہو گئی ہے اور دشی تو اپنے بزنس کی وجہ سے لاہور آیا تھا۔ آپ اسے قلمبستی ہیں آپ سمجھتی ہیں کہ دشی کو لڑکیوں کے سچ رہنا اچھا لگتا ہے جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے مس سبعین، میرا دوست دشی تیس برس کینیڈا میں رہا ہے اس کی سحر انگیز شخصیت اور مردانہ وجاہت کے باعث وہاں اور یہاں بہت سی لڑکیوں نے اس میں دلچسپی لی ہے۔ کئی نے تو شادی کی آخر تک کر دی تھی مگر دشی نہیں مانا اس نے کبھی اخلاقی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ دشی تو اب آیا ہے پاکستان اور یہاں کی لڑکیوں کی بے باکی دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔“

”لیکن جنید بھائی یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے ساری لڑکیاں تو ایسی نہیں ہیں۔“  
 ”درست فرمایا آپ نے میں نے بھی دشی کو یہی بات سمجھائی تھی اور اسے یہ بات تب تو سمجھ نہیں آئی تھی لیکن یہاں آکر مس سبعین کو دیکھ کر سمجھ آ گئی تھی۔ مس سبعین میں دشی کو کینیڈا میں ملا تھا ہم نے اکٹھے ایم۔ بی۔ اے کیا ہے اور پھر یہاں بھی وہ میرے ساتھ ہے۔“ وہ ”لیڈی کلر“ مشہور کر دیا گیا ہے تو لڑکیوں نے ہی اسے یہ لقب دیا ہے۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اپنی شخصیت یا امارت سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی سچ تو یہ ہے مس سبعین، کہ لڑکیاں خود وشال کی طرف لگتی ہیں جیسے شہد پر کھیاں گرتی ہیں۔ دشی اگر چاہتا تو ان کی اس بے باکی اور بے تکلفی کا فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔

کی منتظر رہنے لگی۔ وہ تو سراپا پیار، خلوص اور محبت بن گیا تھا سبعین کے لئے مگر سبعین کے رویے نے اسے بار بار ہرٹ کیا تھا۔

پھر ایک دن اسماء بیگم نے اسے ”کریم ولا“ کا ایڈریس لکھوایا اور وہاں جا کر صورتحال کا جائزہ لینے کا کہا وہ اسماء بیگم کی زبانی سارے حالات سے واقف تھا۔ سو ایک دن ان کے اصرار پر ”کریم ولا“ چلا آیا اور وہاں آکر سبعین کو دیکھتے ہی اسے لگا کہ اس کی منزل اس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ سبعین، نعیم ماموں کی بیٹی ہے یہ انکشاف وشال کے لئے بہت ہی زیت افروز اور خوشگوار تھا۔

☆☆☆

سبعین اور شامین آخری پیپر دے کر کمرہ امتحان سے نکلیں تو ان کا سامنا جنید سے ہو گیا۔  
 ”السلام علیکم گرلز!“ جنید نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سلام کیا۔  
 ”وعلیکم السلام!“ دونوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا دونوں کا موڈ بہت اچھا تھا کیونکہ ان دونوں کا پیپر بہت اچھا ہوا تھا۔

”کیسی ہیں آپ دونوں؟“

”اے دن!“ شامین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اور پیپر کیسا ہوا؟“

”وہ بھی اے دن!“ سبعین نے مسکرا کر جواب دیا۔

”ہوں دیش گرل اس کا مطلب ہے کہ آپ کا رزلٹ بھی ”اے دن“ آئے گا۔“

”انشاء اللہ“ ان دونوں نے دل سے کہا۔

”ویری گڈ، اچھا سبعین، وشال کا پیپر ہے آپ کو کہاں ہے؟“ جنید نے پوچھا۔

”اس کا پتا آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کسی بھی لڑکی سے پوچھ لیجئے اس کی تو سبھی لڑکیوں سے دوستی ہے سوائے میرے۔“ سبعین نے سنجیدگی سے کہا۔

”اوہ! تو آپ کو اس بات کا غصہ ہے کہ دشی کی دوستی آپ سے کیوں نہیں ہے؟“ جنید نے مسکراتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔

”جی نہیں فار یوز کا پیپر انفارمیشن میں آپ کے دوست مسٹر وشال کی دوستی کی آفر پہلے ہی ٹھکرا چکی ہوں بی کا زئی! زائے قلم۔“

”تو آپ اس کے معاملے میں مخلص اور سنجیدہ ہونا چاہتی ہیں۔“

”جی جی بالکل مجھے ساری دنیا میں ایک آپ کا دوست ہی تو ملنا تھا جس کے لئے میں



دشمن جس معاشرے میں رہا ہے وہاں لڑکی اور لڑکے کی دوستی ایک عام سی بات ہے اس لئے جب یہاں بھی لڑکیوں نے اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو اس نے انکار نہیں کیا۔ وہ اگر باکردار نہ ہوتا تو مس سبھین تو اس کے لئے بہتی لنگا سے ہاتھ دھو کر کون سا مشکل تھا۔ مگر آفرین ہے اس کے باعث ہونے پر مضبوط کردار کا مالک ہونے پر کہ اس نے کبھی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی۔ اس نے دوستی سے بڑھ کر ڈیماٹر کرنے والی لڑکیوں کو آئینہ دکھایا اور اپنا راستہ لگ کر لیا اور مس سبھین آپ نے غالباً لڑکیوں سے دشمنی کی سلام دعا کو یاد دہانی کے کردار کی کمزوری اور خامی بنا دیا ہے بخدا ایسا نہیں ہے۔ جن لڑکیوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر بزرگ فمیلی کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کچھ نئے نئے امیر ہونے والوں کی۔ کچھ وہ جن کے گھروں میں تربیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہ لڑکیاں دراصل خلیاں ہوتی ہیں۔ مہول، مہول، منڈلانے والی لڑکیاں۔ چند لڑکیاں سب لڑکیوں کی بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ وشال نے آپ کی خوبصورتی اور ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کو دوستی کی آفر اس خیال سے کی تھی کہ آپ دوسری لڑکیوں کی طرح فوراً مان جائیں گی کہ آپ بھی ان جیسی ہوں گی لیکن آپ کے انکار نے اور اس پر غصہ کرنے سے فلرٹ کہنے نے دشمنی کو چونکا دیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ آپ دوسری لڑکیوں سے کافی مختلف ہیں۔ وہ سچ سچ آپ سے پیار کرتا ہے، لیکن آپ فلرٹ سمجھتی ہیں جو اس کے ساتھ اتنی سرد مہری سے پیش آتی ہیں۔ وہ اگر فلرٹ بھی ہوتا تو بھی اس کے ماحول کا اثر سمجھ کر اس کی اس عادت کو خامی کو قبول کیا جاسکتا تھا لیکن اوہ تو معاملہ ہی الٹ ہے مس سبھین، یہاں تو لڑکیوں نے اس کے ساتھ فلرٹ کیا ہے، پھر اگر وہ سب لڑکیوں کو فلرٹ، بے باک کہے تو آپ کو کیسا لگے گا؟“ جنید نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے سبھین سے پوچھا۔

”ظاہر ہے برا لگے گا۔“ سبھین نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

”تو یقین کر لیجئے مس سبھین کہ دشمنی بہت مثبت سوچ کا مالک ہے۔ بہت مضبوط کردار کا مالک ہے وہ تو اپنے آپ کو اپنے جیون ساتھ کے لئے سینٹ سینٹ کر رکھے ہوئے ہے۔ خود کو بچا بچا کر رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ اس کے جذباتوں پر اس کے جیون ساتھی کا حق ہے وہ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اس کے والدین نے بہت عمدہ تربیت کی ہے اس کی۔ مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے اور مس سبھین، جب شک، بدگمانی اور بے یقینی کے بادل آپ کے دل و دماغ سے ہٹ جائیں گے تو آپ کو میرا دوست وشال احمد بہت صاف، شفاف، اجلا اور پیارا دکھائی دینے لگے گا جیسا کہ وہ ہے اور اتنی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے آپ کے نام اپنے محبت بھرے جذبات وقف کر دیئے ہیں تو آپ میں اور دشمنی کے حسن انتخاب میں کوئی بات تو ہوگی نا۔ سینکڑوں

میں، محبت اور

لڑکیاں اس کی زندگی میں آئی اور گئیں، لیکن اس کا دل صرف آپ کے نام پر دھڑکا آپ کے لئے بے قرار ہوا اور اس نے آپ کو ہی سچے دل سے چاہا ہے۔ آپ غور ضرور کیجئے گا میری ان باتوں پر وہ دل کی بات بلا جھجک کہہ دینے والا بندہ ہے اس لئے آپ سے بھی اظہار محبت کر بیٹھا ہے پلیز اس کے لفظوں کا، جذباتوں کا مان مت توڑیئے گا ورنہ دشمنی ٹوٹ جائے گا۔“ جنید نے نہایت رسائی سے کہا۔

”بس سن لیا سب کچھ اب تسلی ہو گئی ہے یا نہیں۔“ شامین نے سبھین کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بالکل ہو گئی ہے بات کرنے سے بدگمانی دور ہو جاتی ہے اسی لئے میں نے جنید بھائی سے سب کہا تھا تا کہ یہ مجھے حقیقت سے آگاہ کر سکیں۔“ جنید بھائی نے دل سے کہا۔

”جنینکس گاڈ! آپ کو اعتبار تو آیا۔“ جنید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے دراصل ان لڑکیوں سے زیادہ وشال پر اس لئے غصہ آتا تھا کہ وہ خود ان لڑکیوں کو اتنی لفٹ ہی کیوں کراتے ہیں کہ بات آگے بڑھے۔“ سبھین نے تاسف سے کہا۔

”پتا ہے جنید بھائی، وشال بھائی ہمارے سگے پھوپھی زاد بھائی ہیں یہ انکشاف پرسوں ہی ہوا ہے۔“ شامین نے اسے بتایا۔

”رنجلی تو آپ ہیں اس کے ماموں کی بیٹی۔“

”جی ہاں! وہ پرسوں ہمارے گھر آئے تھے۔“

”اچھا اس نے بتایا نہیں میرا اس سے ملنا بھی نہیں ہوا آج فٹ ٹائم اس کا لاسٹ پیپر تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سبھین کی وجہ سے یہاں اس وقت آیا ہوگا۔“ جنید نے نرم لہجے میں کہا۔

”اب تو وہ گھر بھی آیا کریں گے ہمارے کزن جو ٹیڑھے۔“ شامین نے کہا۔

”وشال! اسماء پچھو کے بیٹے ہیں یہ جانتے ہی میرے ان کے متعلق تمام گمان اور شک و شبہ ختم ہو گئے تھے۔“ سبھین نے ایمانداری سے بتایا۔

”شکر ہے..... کیا خیال ہے اب چلیں۔“

”اوکے مجھے بھی اجازت دیں اللہ حافظ۔“

جنید نے مسکراتے ہوئے کہا اور گیٹ کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

”ہائے سسٹرائیڈ فانیسی۔“ فہیم کی آواز پر دونوں چونک گئیں۔

”بھائی آپ یہاں!“ سبھین نے اسے حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں نے سوچا کہ آج اپنی فیانی کے سنگ سفر کیا جائے موسم بھی سہانا ہے چلیں شامین۔“ فیہم نے شامین کو والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا وہ سرخ ہو گئی۔  
”اور میں.....“

”تم اپنی گاڑی میں آ جانا، ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے۔“  
”جی نہیں شام کے پانچ بج رہے ہیں بادل چھا رہے ہیں بارش ہو گئی تو۔“ شامین نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”ٹھیک ہے بھائی آپ شامین کو اپنی ذمہ داری پر لے جائیں مگر وقت پر پہنچ جائیے گا۔ مجھے تو اپنی ٹیچر سے ملنا ہے پیپر سے متعلق انہیں بتانا ہے اس کے بعد ہی مگر جانا ہے۔“ سبھین نے اپنی جیومیٹری بند کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے شامین کو دیکھتے ہوئے بولا۔  
”اوکے، ہم چلتے ہیں تم لوگوں کے امتحان ختم ہونے کی خوشی میں آج آسمان بھی خوش ہے اور ہم بھی خوش ہیں چلو ڈرائیو فیانی۔“

”اوکے سبھین، جلدی مگر چلی جانا۔“ شامین نے اس کو ہدایت کی وہ ”اوکے“ کہہ کر اپنی میڈم سے ملنے چلی گئی۔ جب تک وہ اپنی ٹیچر ز اور میڈم سے مل کر مگر جانے کے لئے باہر نکلی بادل ننھی ننھی بوندیں برسا رہا تھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہی گھر کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے دل اور دماغ پر جو بوجھ تھا وہ امتحان ختم ہونے اور جنید کی زبانی وشال کی مضبوطی کردار کی حیثیت جاننے کے بعد ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت ہلکی پھلکی ہو کر موسم انجوائے کرتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی۔ بارش تیز ہونے لگی تھی۔ سڑکوں پر رش بہت کم تھا۔ یکا یک اس کی گاڑی کے ٹائر چر چرائے اور گاڑی کو زور کا جھکا لگا۔ سبھین نے فوراً گاڑی سائیڈ پر کرتے ہوئے روک دی۔ باہر نکل کر دیکھا تو ٹائر پچھڑ ہو گیا تھا۔ اس پر بارش شام کے تلخے سائے۔ وہ گھبرائی ضرور مگر چونکہ تین سال سے خود گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی اس لئے گاڑی کی معمول کی خرابیاں ٹھیک کرنے میں خاصی ماہر ہو گئی تھی۔ اس نے گاڑی کی ڈیگی میں سے نیا ٹائر اور ضروری اوزار نکالے اور جلدی جلدی ہاتھوں کو حرکت دے کر پچھڑ شدہ ٹائر بدلنے لگی۔

”او موسم بھی حسین ہے لڑکی بھی حسین ہے دیکھو اس کے آس پاس بھی کوئی نہیں ہے۔“  
اچانک دو آوارہ قسم کے لڑکے موٹر بائیک پر وہاں سے گزرے، ان کی نظریں سبھین پر پڑی تو وہ بائیک موٹر کر اس کی گاڑی کے قریب لے آئے۔ ان میں سے ایک لڑکے نے سبھین کے چہرے کو دیکھتے ہوئے گانا شروع کیا تو سبھین اندر سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس نے ان کی طرف

کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے نئے ٹائر کو فٹ کرنے لگی۔ وہ لڑکے اسے خاموشی سے دیکھ کر بائیک سے اتر گئے۔

ایسے موسم میں چپ کیوں ہوکانوں میں رس گھولو  
ہونٹ اگر خاموش ہیں گجی آنکھوں ہی سے بولو  
دوسرا لڑکا بھی ممکن کیا سبھین نے ٹائر بدل لیا تھا۔ اس نے پرانا ٹائر اور ٹول بکس اٹھا کر خشمگین نگاہوں سے ان لڑکوں کی طرف دیکھا اور دونوں چیزوں ڈیگی میں بند کر کے پلٹی تو وہ اس کے سامنے آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ سبھین بظاہر پرسکون تھی مگر اندر سے بہت خوفزدہ اور پریشان اور بے بس ہو رہی تھی۔

”یا اللہ! میری مدد فرما مجھے ان شیطانوں سے بچا مالک۔“  
سبھین نے دل میں دُعا مانگی بارش کے ساتھ کالی گٹاؤں نے خاصا اندھیرا کر دیا تھا۔ اکا دکا گزرنے والی گاڑیاں بھی ہیڈ لائٹس جلا کر گزر رہی تھیں لگتا ہے حینہ عالم گونگی ہے۔ پہلے لڑکے نے سبھین کو ہوس زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو دوسرا لڑکا شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے خیانت سے بولا۔

”گوگلی ہے تو ہمارے حق میں بہتر ہے نہ آواز نکالے گی، نہ شور مچائے گی۔ کیا خیال ہے لے چلیں اسے آج موسم کا مزاد دہالا ہو جائے گا۔“

”چلو تم اسے گاڑی میں لے کر آؤ میں بائیک پر پہنچتا ہوں۔“ دوسرے لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوسری جانب آ کر سبھین کا راستہ روک لیا۔ دونوں اس کے دائیں کھڑے تھے سبھین کے وجود سے تو جان ہی نکل گئی۔

”بچاؤ..... بچاؤ..... اللہ میرا!“ ایک دم سے سبھین نے شور مچایا اور بجلی کی سی تیزی سے سرپٹ سامنے کی جانب دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں لڑکے پہلے تو اس کے اچانک بولنے پر حیران ہوئے پھر اس کے بھاگنے پر یوگلا گئے۔

”او بھاگ پکڑ اسے ایسی تپلی پھر نہیں ملے گی۔“ پہلے لڑکے نے دوسرے سے کہا اور دونوں اس کی جانب دوڑ پڑے۔ تیز بارش میں وہ تیز تیز قدموں سے اندھا دھند بھاگی چلی جا رہی تھی۔ وہ خوف اور بارش سے پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ اسے اپنی حالت سے زیادہ اپنی عزت کی فکر تھی۔ جس کے تحفظ کے لئے وہ پوری قوت سے بھاگ رہی تھی۔

وشال اس خوبصورت موسم میں سبھین اپنی محبت کو دیکھنے کی چاہ میں ”کریم دلا“ کی

جانب جا رہا تھا۔ سامنے سے آتی سبوعین کو اس نے گاڑی کی لائٹس کی روشنی میں پہچان لیا تھا۔ اس کے پیچھے آتے لڑکوں پر بھی اس کی نگاہ پڑ گئی تھی۔

”سبوعین..... یہ سبوعین ہی ہے یا۔ اوما کی گاڑی۔“ وہ ابھی یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ہی تھا کہ وہ جو اندھا دھند بھاگی چلی آ رہی اس کی گاڑی کے عین سامنے آگئی۔ وشال نے بڑی پھرتی سے گاڑی کو بریک لگائی گاڑی اپنی مخصوص آواز کے ساتھ رک گئی مگر اس کے کانوں نے سبوعین کی چیخ بھی سنی تھی جو منہ کے بل اس کی گاڑی کے ہونٹ پر آگری تھی۔

”یا اللہ خیر.....!“ وشال بڑی تیزی سے گاڑی سے باہر نکلا اسے دیکھتے ہی وہ دونوں آوارہ لڑکے اگلے قدموں واپس دوڑ گئے۔ وشال کو سبوعین کا اس حالت میں، موسم میں سڑک پر بھاگنا اور پیچھے دو لڑکوں کا آنا کسی حد تک معاملے کی حقیقت اور سنگینی کا احساس دلا گیا تھا۔ مگر وہ لڑکوں کی بجائے سبوعین کی طرف متوجہ ہوا۔

”سبوعین مس سبوعین۔“ وشال نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے ہراساں ہو کر سر اٹھایا۔ وشال کو آنکھوں کے سامنے پایا تو ایک دم اسے تحفظ کا سا احساس ہونے لگا۔ وشال کا دل اس کی حالت پر بے چین ہو گیا۔

”و..... وشال!“ وہ بمشکل اس کا نام لیتے ہوئے سیدھی ہوئی مگر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا چھا گیا، خوف اور بے بسی نے اسے غڑھال کر دیا تھا وہ چکرا گئی۔ وہ سامنے جا گرتی اگر وشال لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں نہ تھام لیتا۔

”سبوعین!“ وشال نے اسے بے قراری سے پکارا۔

سبوعین نے بھی سننے کے لئے بے اختیار وشال کے کندھوں پر اس کی شرٹ کو اپنی مٹھیوں میں مقید کر لیا تھا۔ اس نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا اس نے تو خود کو غیر مردوں کے لمس سے بچا بچا کر رکھا تھا اب تک وہ بہت مضبوط نفس کی مالک تھی، لیکن ان لمحات میں اس کا سراں بری طرح چکرایا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ ایسے میں سہارا لینا ضروری ہو گیا تھا لیکن وشال کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں بازوؤں میں قارون کا خزانہ سٹ آیا ہو۔ وہ کچھ ہوش میں تھی لیکن بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ہوش میں تھا لیکن مدہوشی کی طرف مائل تھا اور کچھ کشمکش میں تھا۔ بادل کی گھن گرج نے اسے صورتحال کا احساس دلایا تو وہ فوراً سنبھل گیا اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اس نے سبوعین کو گاڑی میں بٹھایا اور خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

”سبوعین..... سبوعین آنکھیں کھولو۔“ وشال نے پریشانی سے اسے پکارتے ہوئے اس کا شانہ بلایا تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں پہلے اسے دیکھا پھر سامنے دیکھتے ہوئے ہراساں لہجے میں بولی۔

”وہ لڑکے۔“

”وہ بھاگ گئے ہیں۔ سبوعین کون تھے وہ کیا ہوا تھا؟“ وشال نے نرمی سے پوچھا تو اسے ساری صورتحال یاد آگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”سبوعین پلیز.....!“ سنبھالیں خود کو میں ہوں ناں آپ کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا بتائیے کیا ہوا تھا؟“ وشال نے اسے بے قراری سے دیکھتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا تو اس نے روتے روتے اسے ساری بات بتا دی۔ ”لاحول ولا قوۃ، کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اسلامی معاشرہ ہے۔ اسے تو کوئی مہذب معاشرہ بھی نہیں کہے گا۔ جس معاشرے میں عورت کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہو، عورت کی جان اور آن محفوظ نہ ہو اس کی اخلاقی پستی کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے۔“ وشال نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا اس کی محبت کی طرف کسی نے میلی نگاہ سے دیکھا تھا یہ جان کر اس کا خون کھول اٹھا تھا اور سبوعین اور زیادہ شدت سے رونے لگی تھی۔

”سبوعین پلیز نہیں روئیں آپ تو بہت بہادر ہیں جیسی تو ان کے چنگل میں پھنسنے سے خود کو بچا لاتی ہیں بس اب روئیں نہیں۔“ وشال نے نرمی سے کہا مگر وہ روئے گئی تو وشال کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیسے چپ کرائے اس نے بایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور سبوعین کو یوں لگا جیسے تحفظ کی چادر اس کے سر پر آٹھری ہو۔ دھیرے دھیرے اس نے خود کو سنبھال لیا آنسو ختم گئے مگر ہچکیاں نہیں تھمی تھیں۔

”آپ کو اتنی دیر یوندری میں نہیں رکنا چاہئے تھا موسم خراب تھا تو پیچھے سے فارغ ہو کر گھر چلی جاتی۔ ٹیچرز سے کل مل لیتیں۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کی عزت محفوظ رکھی۔ حوصلہ رکھیں میں آپ کے ساتھ ہوں، میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں گا۔“

”میری گاڑی۔“

”وہ ڈرائیور لے جائے گا میں آپ کے گھر فون کرویتا ہوں۔“ وشال نے سنجیدہ مگر نرم لہجے میں کہا اور اپنے موبائل سے ”کریم ولا“ فون کرنے کے بعد گاڑی اشارٹ کر کے ”کریم ولا“ کی جانب بڑھ گیا۔

سبوعین نے وشال کی طرف بھیکتی آنکھوں سے دیکھا یہ وہی وشال احمد تھا جس کے کردار



پر وہ شک کرتی تھی۔ جسے فلرت کہتی تھی، جسے کمزور کردار کا اور لڑکیوں کا رسیا سمجھا کرتی تھی۔ آج اسی وشال احمد نے اس کی اس کڑے وقت میں نہ صرف مدد کی تھی بلکہ اسے تحفظ اور اپنائیت کا احساس بھی بخشتا تھا۔ ورنہ اگر وہ نہ مڑے کردار کا مالک ہوتا تو اس کی بے بسی سے اس صورتحال سے، موسم کی اس شرارت سے قائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ سببین کے دل میں وشال کی محبت تو پہلے سے جڑ پکڑ چکی تھی۔ اسام پھو کے بیٹے ہونے کے انکشاف کے بعد تو اسے بھی یہ اور اک ہو گیا تھا کہ وہ وشال احمد سے محبت کرتی ہے اور اس کا دوسری لڑکیوں سے بے تکلف ہونا، بات کرنا، اسے اپنی محبت کی وجہ سے برا لگتا تھا۔ اسے وشال کے لئے اپنے اس جذبہ کی وجہ سے بھی غصہ آتا تھا کہ اگر وہ سچ سچ فلرت ہے تو اس کے دل میں ایسے فلرت فحش کے لئے نرم گوشہ کیونکر پیدا ہوا ہے۔ شامین کے سارے تجربے درست تھے اور سببین دل سے وشال کی محبت کا خود اقرار کر چکی تھی اور ان لمحات میں جب وہ اس کے لئے تحفظ کا سامان بن کر آیا تھا وہ اسے اور بھی پیرا لگ رہا تھا۔ اس لمحے سببین کو اپنی محبت پر مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

وشال نے گاڑی "کریم دلا" میں طویل روش پر لا کر روکی تو سببین نے گہرا طویل سانس لیوں سے خارج کیا۔ باہر بارش زوروں پر تھی۔ رات زینہ بہ زینہ زمین پر اتر رہی تھی۔ سببین کی آنکھوں سے ایک بار پھر برکھا برسنے لگی۔ اس وقت یہ آنسو وشال کے ساتھ اپنے خفی روئے اور اس کے مثبت طرز عمل پر بے غلوص محبت کے احساس سے چھٹکے تھے۔

"سببین، ریلیکس کزن ایوری تھک از آل رائٹ ناؤ۔" وشال نے اسے اٹھکبار دیکھ کر نرمی سے کہا تو وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"میں ادھر ہی آ رہا تھا تم سے ملنے کے لئے مجھے کیا خبر تھی کہ قدرت ہمیں اس صورتحال میں ملا دے گی۔ پلیز روؤ نہیں تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں اور اس دل پر میں تمہارے آنسو نہیں تمہارے پیار کی برسات ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چلو سب لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔" وشال نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کی طرف دیکھتے ہوئی بولی۔

"وشال!"

"سببین..... کیا ہوا؟" اس نے کچھ حیرت سے، کچھ محبت سے پوچھا۔

"تھینک یو..... تھینک یو دیری میچ!" سببین نے اس کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے تفکر سے بھیکتے لہجے میں کہا۔

"او کم آن کزن، یو آر مائی لوسو یو آر آل ویز ویلکم مائی ڈیئر۔" وشال نے مسکراتے ہوئے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے حیا سے رخ پھیر لیا۔ سامنے سے بڑا متش دروازہ کھل گیا تھا۔ نہیم اور نعیم باہر نکلے تو وہ گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہوئی نعیم کے سینے سے جا لگی اور "پاپا، پاپا" کہتے ہوئے رونے لگی۔

"بالکل بچی ہے چھوٹی سی گڑیا!" وشال اس کی اس حرکت پر مسکراتے ہوئے خود سے ہم کلام ہوا اور گاڑی سے اتر آیا۔ ڈرائنگ روم میں سب گھر والے جمع ہو گئے۔ سببین کے ساتھ جو واقعہ رونما ہوا تھا وہ وشال نے مناسب لفظوں میں کچھ ضروری سنسر کے ساتھ سب کے گوش گزار کر دیا۔ نعیم اور نعیم نے لڑکیوں کا گھر سے باہر اکیلے نہ نکلنے کا حکم فوراً صادر کر دیا۔

"ہائے اللہ سببین میں تو مر ہی جاتی اگر میرے ساتھ ایسا ہوتا تو تم بہت ہمت والی ہو۔ اللہ کا شکر ہے وشال بھائی عین موقع پر پہنچ گئے اور پہنچے کیسے نہ ہیرو تو ہمیشہ ایسے ہی موقع پر اپنی ہیروئن کو بچانے کے لئے آتا ہے۔ ویسے اب تو وشال بھائی وہ بادشاہ بن گئے ہیں ناں جس کے لئے محبت ہے تمہارے پاس۔" شامین نے اس کے کمرے میں آ کر اسے بستر پر دراز دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا تو اس نے یہ کہتے ہوئے سر تک چادر تان لی۔

"شامی پلیز تنگ مت کرو سونے دو مجھے۔"

"یہ تم مجھ سے نہیں بلکہ وشال بھائی سے کہنا جو رات بھر خوابوں خیالوں میں آ آ کر تمہیں تنگ کریں گے، سونے ہی نہیں دیں گے۔"

"شامین بہت فضول ہو تم اب جاؤ یہاں سے۔" سببین اس کی اس شوخ بات پر ہنستے ہوئے بولی۔

"اچھا بابا! جارہی ہوں تم آرام سے وشال احمد کے سنے دیکھو گڈ نائٹ۔" شامین جاتے جاتے بھی پھلچھری چھوڑ گئی۔ سببین دیر تک مسکراتی رہی۔ آنکھیں سچ سچ وشال کے سنے بنتی رہیں۔ صبح وہ بہت دیر سے بیدار ہوئی تھی اسے ہلکا پھلکا بخار بھی تھا۔ سبکی اس کی تھار داری میں لگ گئے۔ سببین کی امی نے اس کا صدقہ بھی اتارا۔ شامین نے شام کو اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا گلابوں کا کبکے دے دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

"وشال بھائی لائے ہیں تمہارے لئے خود تمہاری عیادت کے لئے اس لئے حاضر نہیں ہوئے کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ انہیں دیکھ کر تمہاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے جبکہ بے چارے تمہیں جلد از جلد تندرست دیکھنا چاہتے ہیں۔"

”اچھا طریقہ ہے شرمسار کرنے کا۔“ سبیین نے نادم ہو کر کہا اور نگے اپنے سر ہانے رکھ کر لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔ شامین چند سیکنڈ تو اسے دیکھتی رہی پھر اس کی یہ بات وشال تک پہنچانے چلی گئی۔

سبیین کا بخارا اگلے دن ہی اتر گیا تھا۔ ہفتہ بھر خوب آرام کرنے کے بعد آج وہ فہیم کے ساتھ یونیورسٹی جا رہی تھی۔ اسے لائبریری کی بکس واپس کرنا تھیں۔ فہیم اسے یونیورسٹی ڈراپ کر کے آدھا گھنٹہ بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ وہ لائبریرین کے انتظار میں لان میں بیٹی تھی نظریں دور کھڑے وشال احمد پر مرکوز تھیں جسے شامین نے سبیین کے یونیورسٹی آنے کا بتایا تھا اور وہ اس سے ملنے کے لئے فوراً چلا آیا۔ وشال اپنے کلاس فیلو سے باتیں کر رہا تھا اس کے جاتے ہی اس نے نگاہ کا زاویہ بدلا تھا سبیین کو اپنی جانب دیکھتے پایا۔ سبیین نے شپٹا کر نظریں چرائیں وہ اس کی اس ادا پر خوشدلی سے مسکراتے ہوئے اس کے پاس چلا آیا اور اس کے سامنے گھاس پر بیٹھ گیا۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“

”ٹھیک ہے۔“ سبیین نے آہستگی سے جواب دیا۔

”آپ نے مجھے پریشان ہی کر دیا تھا۔“

”کیوں؟“ سبیین نے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”آپ نہیں جانتیں کیوں؟“ الٹا اسی سے سوال کیا تو وہ نروس ہو کر نگاہ چرا گئی اور پھر ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

”ارے کہاں چلیں آپ؟“ وہ بھی کھڑا ہو گیا نگاہیں اس کے دلکش سراپے پر الجھی ہوئی تھیں۔ سبیین بہت مناسب قد کاٹھ کی مالک تھی۔ صحت مند بھرا بھرا وجود۔ چہرے کے جاذب نظر خدو خال، شہابی رنگت سیاہ سحر انگیز آنکھیں چمکتے سیاہ بالوں کا شانوں تک لہراتا خوبصورت اسٹائل، یا تو قی لب جو مسکرائیں تو ہر سو پھول کھل جائیں، ہنسیں تو کلیاں چمکنے لگیں۔ سبیین کے چہرے پر بہت کشش تھی ایسی کشش جو دیکھنے والے کو اپنی جانب بے اختیار کھینچ لیتی تھی مگر اس کی مضبوطی کردار ہی تھی کہ سٹوڈنٹس اس سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کا احترام کرتے تھے اور وہ احترام کرنا جانتی بھی تھی۔

”مجھے لائبریری کی بکس واپس کرنی ہیں۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”اور مجھے لائبریری سے ایک بک ایسٹو کرانی ہے اکٹھے چلیں۔“ سبیین نے اثبات میں

”وشال! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ نروس سے۔ لچو م۔ بولی۔

”کیا؟“ وشال نے بہت محبت اور دلچسپی سے اس کے چہرے کو دیکھا اس کی گھنی گھنی سیاہ

پلکیں سحر انگیز آنکھوں پر یوں جگمی ہوئی تھیں جیسے کسی چشمے پر پید بچوں کی شانیں کانپ رہی ہوں۔

”آئی ایم سوری۔“ سبیین نے عداوت آمیز لہجے میں کہا وہ جانتا تھا کہ یہ معافی کس

سطحے میں مانگی جا رہی ہے پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔

”سوری فار واٹ؟“

”آئی ایم سوری فار اپوری تھنک۔“

”اٹس آل رائٹ ہو جاتا ہے ایسا بھول جائیے گزری باتیں یہ بتائیے اب تو آپ مجھ

سے دوستی کریں گی ناں۔“ اس نے محبت سے کہا۔

”میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے دوستی کرنے کے لئے مجھے لڑکی بننا پڑے گا۔“ وشال

نے برجستہ کہا تو وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”آف!“ وشال نے پہلی بار اسے ہنستے ہوئے دیکھا تھا اور وہ بھی اتنے قریب سے اس

کے تو دل و روح میں شادیاں بننے لگے اُسے یوں لگا جیسے قوس قزح نے کہیں پاس ہی اپنی

پازریب چھٹکانی ہو۔

”دوستی سے پہلے کوئی اور ناٹھ استوار ہونا اب بہت ضروری ہو گیا ہے۔“ وہ معنی خیز جملہ

بول کیا۔

”میں سمجھی نہیں۔“

”سمجھ جائیں گی، کل شام کی فلائٹ سے ماما اور پاپا آرہے ہیں۔“

”جج!“ وہ خوش ہو کر بولی اور لائبریری میں داخل ہو گئی وشال نے بھی اس کی پیروی کی۔

”مجھے پچھو اور پچھو پچھا سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“

”انہیں بھی آپ سے ملنے کا آپ کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔“ وشال نے کہا۔

”اشتیاق۔“

”شوق، خواہش، آرزو، تمنا۔“ اس نے ہنستے ہوئے مفہوم بیان کیا۔

”ایکسیکو زمی!“ سبیین نے لائبریرین کو اپنی سیٹ پر جاتے دیکھ کر اس سے کہا اور کتاڈر،

لے کر اس کی جانب بڑھ گئی۔ وشال بھی مسکراتا ہوا اس کے پیچھے ہی آگیا اور اپنی مطلوبہ کتاب کا نام

بتا کر کتاب ڈھونڈنے کا مطالبہ بک شیفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سبھین کتاب واپس کر کے چپکے سے اس سے نظر بچا کر لاہری سے باہر نکل گئی۔ اس میں وشال کی باتوں اور آنکھوں کو محبت سے پرہیز کر کے اس کے سامنے رکنا دشوار ہو جاتا اور نعیم کے آنے کا بھی وقت ہو گیا تھا۔ وشال کتاب لے کر آیا تو سبھین کو کہیں نہ پایا پہلے تو وہ الجھ گیا پھر کچھ سوچ کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

”کریم ولا“ میں جشن کا سماں تھا۔ اسماء، سراج احمد اور وشال احمد کی آمد نے ہر طرف خوشی کے ماحول کھلا دیئے تھے۔ اسماء اپنے بھائیوں اور بھائیوں سے مل کر دیر تک روتی رہیں۔ عظیم اور نعیم بھی آبدیدہ اور شرمندہ تھے۔ اپنے رویے کی ان دونوں سے بار بار معافی مانگ رہے تھے۔ ندیم بھائی، فرحین، شامین، نعیم اور سبھین بھی مسرت سے ہنسی کی آنکھوں سے منظر دیکھ رہے تھے۔ وشال کی لگاؤ سبھین کے سندر سراپے پر مرکوز تھیں۔ سیاہ جار جٹ کے شلوار قمیض دوپٹے میں جس پر سفید گلوں اور ستاروں کا دیدہ زیب ہلکا سا کام کیا ہوا تھا وہ پہلے سے زیادہ روشن روشن اور کھری دکھائی دے رہا تھا۔ بالوں کو اس نے برش کر کے گھلا رہے دیا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کی لکیر تھی۔ کولڈ کی خوشبو سے مہکتی وہ وشال کے دل میں پھل پھل چا رہی تھی۔ وہ اسے پانے کے لئے اور بھی بے تاب ہو رہا تھا۔

”اسماء ہمیں معاف کر دو بہن ہم نے ذرا سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر تمہیں خود سے اجنبی دور کر دیا۔ یقیناً جانو بہن ہم اپنے رویے پر بہت نادم تھے۔ بچھتاؤں کی آگ میں جلتے رہے۔ ہم، ہم، ہم نے جیتے جی تمہیں ان رشتوں سے محروم کر دیا۔ بیس برس کی جدائی تم نے بھی سہی ہے اور ہم نے بھی۔ ہم گزرا وقت تو واپس نہیں لاسکتے پھر بھی اسماء میری بہن اگر ہو سکتے تو ہماری زیادتیاں حاف کر دو ہمارے پاس تو تلافی اور ازالے کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔“ عظیم نے انہیں پر غم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھیستے لہجے میں کہا۔

”ایک صورت ہوتی ہے بھائی۔“ اسماء سراج نے اپنے آنسو صاف کر کے کہا۔

”وہ کیا جلدی بناؤ تم جو کہو گی ہم کریں گے شاید اس طرح ہمارے احساس ضیاع اور احساس ندامت میں کچھ کمی ہو سکے۔“ نعیم نے جلدی سے کہا۔

”نعیم بھائی، آپ اگر میرے دکھوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں، مجھے اس خاندان سے ہمیشہ دوا دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنی سبھین کو میری بیٹی بنا دیں۔“ اسماء نے نرمی سے کہا تو سبھین نے شیشا شال کی طرف دیکھا۔ اسی کو دیکھ رہا تھا اس کے دیکھنے پر بڑے دل آویز انداز میں مسکرا دیا۔

”سبھین تمہاری بی بی ہے اسماء۔“ نعیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ایسے نہیں بھائی صاحب! آپ کو سبھین بیٹی ہمارے وشال کی دلہن بنانا ہوگی۔“ سراج احمد نے مسکراتے ہوئے کہا تو جہاں سب کے چہروں پر حیرت اور مسرت ابھر آئی تھی وہاں سبھین کا چہرہ ایک دم ساٹ ہو گیا تھا اس نے وشال کی طرف دیکھا وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا سبھین تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ سب نے اس کا یوں جانا شرم و حیا سمجھا مگر وشال کو اس کے چہرے کے تاثرات نے بے کل کر دیا تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ اس کے پر پوزل سے خوش نہیں ہوئی۔ نعیم بھائی، آپ نے اپنے بچوں کے آپس میں رشتے طے کر کے اپنے خاندان کو مستقبل میں یکجا کر دیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے، میں بھی اسی خاندان کی بیٹی ہوں اس لئے آپ کی بیٹی پر پہلا حق میرا ہے سبھین تو مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میں اسے بھونٹیں بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ جمال بیٹے کی شادی تو سراج کی بھانجی سے کر دی تھی ہم نے وہ ماشاء اللہ کینیڈا میں بہت خوش ہیں اور میرے دوش سے تو آپ پہلے بھی مل چکے ہیں۔ ماشاء اللہ اس نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کیا ہے اور اب ایم۔سی۔ ایس کا امتحان دیا ہے سراج کے ساتھ دوشی بھی ابی کا بزنس چلاتا رہا ہے اور انشاء اللہ کچھ دنوں تک وشال یہاں اپنی ٹیکسٹری کا کام شروع کر دے گا۔“ وشال ولا“ یہاں اس کے نام ہے انشاء اللہ سبھین کو کوئی کمی نہیں ہوگی۔ میرا دوشی بہت محبت سے رکھے گا سبھین کو..... یوں دوشی بیٹا میں صحیح کہہ رہی ہوں ناں۔“ اسماء سراج نے ساری بات کرنے کے بعد آخر میں شوخی سے وشال کی تصدیق چاہی۔

”او ماما آپ کبھی غلط کہہ سکتی ہیں۔“ وہ جھینپ گیا اور ہنستے ہوئے بولا تو سب کو ہنسی آگئی اور وہ شرم کر وہاں سے باہر نکل گیا۔

”لولو کے بھی شرم مانے لگے۔“ ندیم بھائی نے کہا سب ایک بار پھر ہنس دیئے۔

”ہمیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اسماء تم جب چاہو سبھین کو وشال بیٹے کی دلہن بنا کر لے جا سکتی ہو۔“ نعیم نے خوش ہو کر کہا۔

”سچ بھائی!“

”بالکل سچ..... ہمیں خوشی ہوگی کہ ہمارا خاندان مکمل طور پر یکجا ہو جائے گا۔“ نعیم نے دل سے کہا۔

”فرزانہ بھائی، آپ کی کیا مرضی ہے؟“

”وہی جوان کی مرضی ہے۔“ فرزانہ بیگم نے اپنے شوہر نعیم کی طرف دیکھتے ہوئے



سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ سبھین اسے رو کر سکتی ہے۔ انکار کر سکتی ہے۔ گزشتہ دنوں کی خوشگوار ملاقاتوں سے تو وہ سمجھا تھا کہ سبھین کی اس کے متعلق ساری بدگمانیاں ختم ہو گئی ہیں مگر اس کے اس جواب نے اسے احساس دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

”تو میں جاؤں سبھین!“ وصال نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

”جائیں..... اب کیا بینڈ باجے بجا کر جائیں گے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”ارادہ اور آرزو تو یہی تھی۔“ وصال نے دکھ سے جواب دیا۔

”گویا اتنی جلدی نا اُمید ہو گئے۔ چہ چہ۔“ سبھین نے مذاق اڑایا۔

”اُمید کس لئے رکھوں جب آپ کے پاس میرے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں ہے ہم اتنے سنگدل نہیں ہیں کہ اپنے در پر آئے خور و اور نیک خوشامالی کو خالی ہاتھ لوٹا دیں۔“ سبھین نے شاہانہ انداز میں کہا تو اس نے بے قراری و بے چینی سے پوچھا۔

”تو پھر کیا ہے آپ کے پاس میرے لئے۔“

”محبت ہے ہمارے پاس۔“ وہ اس کا امتحان ختم کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

”محبت!“

”ہوں..... کیوں، نہیں چاہیے؟“ سبھین اس کی حیرت زدہ صورت کو محبت سے دیکھ رہی تھی۔

”محبت ہی تو چاہئے مجھے تمہاری محبت۔“ وہ سنہیلے ہوئے بولا۔

”تو خوش ہو جاؤ سوالی کہ یہ جو محبت ہے ہمارے پاس یہ تمہاری ہی ہے، تمہارے لئے ہی ہے صرف تمہارے لئے۔“ وہ مسکراتے، شرماتے ہوئے اقرار محبت کرتی ہوئی وصال کو کائنات بھر کی خوشیوں سے سرفراز اور نہال کر گئی۔

”ج!“ وہ سرور ہو کر بے خود ہو کر اس کے قریب آیا۔

”ج!“ سبھین نے تیزی سے نیچے جھک کر پانی کا پائپ اٹھایا اور وصال کو نمٹو دیا۔

”او سبھین رکو کزن۔“ وہ جیسے ہوئے ہاتھوں پر پانی کی دھار روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا وہ ہنسے جارہی تھی وہ سر سے پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔ بالآخر وہ اس کے ہاتھ سے پائپ چھیننے میں کامیاب ہو گیا اور پائپ اس کے ہاتھ سے چھیننے ہی کیاری میں پھینک دیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سبھین کے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا۔ چہرہ شرم سے گھنار ہو گیا، لب مسکرا رہے تھے۔

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”بھئی یہ مجھ سے اختلاف کی جرأت کر ہی نہیں سکتیں۔“ نعیم نے شوخ لہجے میں کہا تو سراج احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

”گویا اپنی دہشت بٹھا رکھی ہے آپ نے بھابی پر۔“

”دہشت نہیں..... محبت۔“ نعیم نے بڑے راز دارانہ انداز میں کہا تو سب بے اختیار ہنس پڑے۔

☆☆☆

”ہیلو!“

وصال سبھین کو ڈھونڈتا ہوا لان میں چلا آیا وہ نیچے گھاس پر بیٹوں کے بل بیٹھی کیاری کی مٹی سے کھیل رہی تھی۔

”آپ یہاں کیوں چلے آئے؟“ وہ قریب پڑے پانی کے پائپ سے اپنے مٹی میں لٹھڑے ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”جہیں یہ بتانے کے لئے کہ میں بادشاہ تو نہیں مگر تم میرے دل کی ملکہ ہو اور میں تمہیں اپنے گھر کی ملکہ بھی بنانا چاہتا ہوں۔“

”اچھا!“ سبھین ہاتھ دھو کر کھڑی ہو گئی۔

”اچھا نہیں بہت اچھا لگے گا مجھے میرا آنگن تمہارے آنے کے بعد۔“

”آپ نے بادشاہ کا ذکر کیوں کیا؟“ اسے شائین پر شک ہوا۔

”سنا تھا کہ آپ کی محبت صرف بادشاہ کے لئے ہے..... تاج و تخت تو نہیں ہے میرے پاس البتہ محبت کی سلطنت کا بادشاہ ضرور ہوں میں، اور اپنی یہ بادشاہی میں آپ پر دل و جان سے لگانے کے لئے تیار ہوں۔“ وصال نے اس کے چہرے کو محبت بھری اور دارفہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پر غلوص لہجے میں کہا تو اس کی خوشی اور سرشاری اس کی روح تک میں سرایت کر گئی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے خوابوں کی تعبیر اس کی محبت اتنی آسانی سے اور اتنی جلدی مل سکتی ہے اس نے دل میں رب کا شکر ادا کیا اور بظاہر اسے ستانے کے لئے سنجیدہ اور سپاٹ چہرہ لئے کھڑی رہی۔

”آپ نے غلط دروازے پر دستک دی ہے یہاں آپ کے لئے کچھ نہیں مسٹر وصال احمد آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“ سبھین نے نہایت سپاٹ لہجے میں کہا تو وصال پر جیسے ایٹم بم گر پڑا۔ اس کا کھلا کھلا چہرہ ایک دم مرجھا گیا۔ آنکھوں کی جوت ماند پڑ گئی، دل ڈوبنے لگا، اسے اپنی

”میں اس بارش میں نہیں تا عمر تمہاری محبت کی بارش میں بھیگنا چاہتا ہوں۔“ وشال نے اس کے سندر چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہا تو اس نے شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا لیں اور وشال اس کی اس ادا پر ثار ہی تو ہو گیا اس نے اپنی شرٹ کی جیب میں سے ہیرے کی نازک انگلی نکالی اور بہت محبت سے سبھین کے ہاتھ کی انگلی میں پہنا دی۔

”آئی ریلی لو یو سبھین!“ وشال نے اس کو اپنی جانب دیکھنے پر کہا تو وہ خوشی اور حیا سے کھل اٹھی۔ اس کی مسکراہٹ میں تو وشال کی جان آگئی تھی۔ عین اسی وقت کمرے کی لائٹ ان دونوں پر پڑی تو وہ دونوں گھبرا گئے۔

”واہ زبردست سین تھا۔ پیار کے اظہار سے مزین ایک یادگار تصویر کمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لی ہے۔“ شامین کمرہ لئے کھڑی تھی اور شرارت سے مسکراتے ہوئے انہیں ایک دم سے ہاتھ چھوڑ کر بوکھلاتے، شرما تے دیکھ کر بولی سبھین کی حالت قابل دید تھی۔

”کزن، یہ تصویر مجھے دینا مت بھولنا۔“ وشال نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کریں دوشی بھائی، یہ تصویر تو میں آپ کو گفٹ کر دوں گی۔ ویسے بڑوں نے مجھے سبھین کی اس رشتے کے لئے مرضی معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا مگر یہاں یہ سین دیکھ کر تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ سبھین کے بادشاہ وشال احمد ہی ہیں کیوں سبھین تمہاری طرف سے قبول ہے۔“ کاسٹل دے دوں انکل، آنٹی اور پھپھو جانی کو۔“ شامین نے شرارت سے اسے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی بتاتی ہوں یو چیئر۔“ سبھین شرم اور خفت سے اُسے گھورتے ہوئے اسے مارنے کو دوڑی تو وہ اندر بھاگ گئی۔ وشال سبھین کی حالت اور کیفیت سے محفوظ ہو کر خوشی دلی سے ہنس پڑا۔ اس کا دل رب کے حضور تشکر سے سجدہ ریز ہو گیا کہ جس نے اس کی محبت، اس کی منزل اتنی آسانی سے عطا کر دی تھی۔ اب خوشیاں اس کے چار سو رقصاں تھیں۔“

